لو مان لو۔ تمہیں قسم ذوالجلال ہے   یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علیؑ کا تم سے طلبگار آب ہے
دیدو۔ کہ اِس میں ناموری ہے ثواب ہے

یہ فرما کر۔ حضرتؑ نے:۔

بین کا نشتر

پھر ہونٹ بے زباں کے چُومے جُھکا کے سر   رو کر کہا جو کہنا تھا۔ وہ کہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی۔ اے مرے پسر   سوکھی زبان تم بھی دکھا دو۔ نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نورِ عین نے
تھرّا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

حضرت امام حسینؑ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ (یہ گوشہ ملاحظہ ہو):۔

گوشۂ تثلیث

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں   لی حرملہ نے شانے سے دو ٹانگ کی کماں
ترکش سے چُن کے کھینچ لیا تیرِ جاں ستاں   جوڑا کماں تاک کے حلقومِ بے زباں
چُھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے
گھبرا کے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیر نے

تصویر شہادت (بے مثل)

کیا سِن ننھا تیر کھاتے ہی بچہ بلک گیا   سُوکھے گلے میں خوں بھرا۔ دم اٹک گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا   ٹوپی گری زمیں پہ۔ منکا ڈھلک گیا
ننّھی کلائیوں میں تشنّج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی۔ مُنہ سے انگوٹھے نکل پڑے

مُنہ آسماں سے شہ نے پھرایا کہ کیا ہُوا   دیکھا نشانہ تیر کا وہ بے خطا ہُوا
یعنی دو ٹکڑے حلق سے تیرِ جفا ہُوا   بچہ تڑپ رہا ہے لہو میں بھرا ہُوا
آنکھیں پھرائے دیتے ہیں تیور بدلتے ہیں
آگے تو دُودھ اُگلتے تھے اب خوں اُگلتے ہیں

پھر حضرتؑ فوج کی طرف اس طرح مخاطب ہوئے :-

اس نے کہا تھا کیا؟ جو بھلا تم نے مارا تیر
تم سے کلام کرتا تھا میں۔ یا کہ یہ صغیر

اور فرمایا۔ ع "تم نے ہمارے لالے کی بھی کچھ حیا نہ کی"۔

اس کا جواب ہی کیا تھا۔ وہ شقی۔

ہنس ہنس کے سب حسینؑ کے رونے پہ پھٹ گئے
شہ نے وہ آہ کی۔ کہ دو عالم اُلٹ گئے

بچے کے دم نکلنے کی حالت دبیرؒ یوں تحریر کرتے ہیں :-

اصغرؑ ہُمک ہُمک کے پدر سے لپٹ گئے
ننھے سے ہاتھ پاؤں لرز کر سمٹ گئے

ہونٹوں پہ شہ کے ہونٹ ملے اور گذر گئے
اک بوسہ مُسکرا کے لیا اور مر گئے

باپ کی اُس وقت کی حالت نہایت مختصر الفاظ میں بیان کی ہے۔ یہ خیال پیش نظر ہے۔ کہ امام حسینؑ امام ہیں۔ شانِ امامت کو ملحوظ رکھ کر باپ کی بے قراری کی تصویر کھینچتے ہیں :-

شانِ امامت کا لحاظ اور مصیبت کی تصویر

لاشے کے مُنہ کو دیکھ کے کہنے لگے یہ شاہ
بیچارگی کا وقت ہے اصغرؑ! خدا گواہ

ماں۔ بہنیں گھر میں۔ باپ پہ یاں نرغۂ سیاہ
یہ ریگ گرم۔ اور یہ بدن نرم۔ آہ آہ

دل ساتھ نکلا پڑتا ہے کیونکر جدا کروں
سونپوں کسے؟ لٹاؤں کہاں؟ آہ کیا کروں؟

تمام اعزہ و اقارب و اصحاب حضرتؑ کے کام آ چکے ہیں۔ سوائے امام حسینؑ کے کوئی باقی نہیں۔ حضرتؑ خود بنفس نفیس ارادۂ جنگ فرماتے ہیں۔ عنانِ توسنِ قلم میدان کی طرف پھیرتے ہی دبیرؒ کی زبان و خیالات کا کچھ اور عالم ہو گیا۔ ملاحظہ ہو :-

جہاد کا سامان

اتنے میں بہرِ جنگ بڑھی فوج اشقیا
شہزادیوں نے خیمۂ عصمت کا رُخ کیا*

*۔ اس موقع پر چھل نٹنے میں فاضل مضمون نویس نے چند بند اس مضمون کے چھوڑ دئے ہیں۔ کہ خیمہ سے بیبیاں مع مادر علی اصغرؑ نکل پڑی ہیں اور قبر علی اصغرؑ پر جو امام حسینؑ نے اُسی وقت بنائی تھی نالہ و زاری کی ہے۔ وہ بین قیامت کے بین ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

شہ سے ہلال زین کو ملی بدر کی ضیا — پہنچا زبانِ تیغ سے بھی حکمِ کبریا

قربان ذوالجناح شہِ دیں پناہ پر

غصّہ تو پیچھے آیا۔ یہ پہلے سپاہ پر

اِس بند کی ٹیپ پر نظر رہے:۔

شجاعِ عباس

محشر کے زلزلے نے عناں آکے تھام لی — نُصرت کے ولولے نے رکابِ امامؑ لی

چابک زنِ فلک نے کرن کی لگام لی — شامی تو کیا ہیں روز نے بھی راہِ شام لی

حیرت کی شکل خوف سے جنّ و ملک بنے

دو پاؤں۔ بھاگنے کو۔ زمین و فلک بنے

ضربِ شمشیرِ حسینیؑ

ضربِ شمشیرِ حسینیؑ

بُو کی طرح دماغوں میں آئی۔ چلی گئی — مثلِ ہوا سروں میں سمائی۔ چلی گئی

مانند شعلہ باگ اٹھائی۔ چلی گئی — آندھی کی طرح آگ لگائی۔ چلی گئی

سینے میں صاف آتی تھی۔ اور صاف جاتی تھی

انداز دم کی آمد و شد کا دکھاتی تھی

شاعرانہ مدحِ شمشیر

ظلمت میں آنے جانے کو آبِ حیات تھی — اور روشنی میں نیّرِ اعظم کی ذات تھی

اندھیر کرنے کو یہ قیامت کی رات تھی — مُنہ سے نکلنا اس کیلئے ایک بات تھی

رن میں تو کافروں کے فقط حلق پر پھری

پر شہروں میں زبانوں پہ مثلِ خبر۔ پھری

اس رنگ کے بعد مرزا صاحب دُوسرا (سین) رنگ دکھاتے ہیں۔ زبان اور خیالات کا رُخ اب بدل گیا:۔

اشتیاقِ شہادت و وصالِ خدا

ناگاہ شوقِ خلد کے گلزار کا ہُوا — اور حوصلہ بزرگوں کے دیدار کا ہُوا

ارمان ذوالجلال کے دربار کا ہُوا — سر کو خیال ہدیۂ غفّار کا ہُوا

حضرتؑ نے جب تلوار کو نیام میں رکھ لیا۔ ع سبط نبیؐ پہ نرغۂ اہل جفا ہُوا۔ اور ع زہراؑ کا چاند فوج کے بادل میں گھر گیا۔ حضرت امامؑ نرغے میں گھر گئے ہیں۔ ع ناگہ بلا کی طرح گرا لشکر جفا۔ اور ستمگر چاروں طرف سے حملہ کر رہے ہیں:۔

گھوڑے سے گرنے کی تصویر

نیزے لگے جو سینے میں تھرا کے رہ گئے | بیٹھا جو تیر ماتھے پہ تیورا کے رہ گئے
شکرِ خدا زباں سے فرما کے رہ گئے | گرنے لگے تو ہاتھوں کو لٹکا کے رہ گئے

اکبرؑ نہ تھے جلو میں نہ عباسؑ پاس تھے
مظلومؑ بیچ میں تھا۔ عدو آس پاس تھے

حضرتؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے ہیں۔ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں۔ ع

سجدے میں سر جھکا دیا ہاتھوں کو ٹیک کر

شمر کا آنا

بوجہ خوف طوالت بند چھوڑتا جاتا ہوں۔ شمر (قاتل امام حسینؑ) آیا ہے:۔

آیا سرہانے تیغ بکف شمر رُوسیاہ | بولا گلا کہ میں ہوں پیمبرؐ کی بوسہ گاہ
دل نے کہا یہ سینہ ہے گنجینۂ اِلٰہ | بیٹھا وہ اُس جگہ کہ نہیں جائے شرح آہ

اس ظلمِ نو سے چرخ کہن کانپنے لگا
ایسا حسینؑ تڑپے کہ رن کانپنے لگا۔

بعدہ حضرت زینبؑ کی بے تابی و بے قراری چند بند میں بیان کی ہے۔ سہ

اے آسماں کہاں ہے حسینؑ فلک جناب | اے آفتاب کیا ہُوا زہراؑ کا ماہ تاب
کہ اے فرات؟ پیاسوں کا سلطاں کدھر گیا | اے کربلا بتا ترا مہماں کدھر گیا
بھیجوں کسے تلاش کو سب میرے مر گئے | آنکھیں بہن کی ڈھونڈھتی ہیں تم کدھر گئے

حضرت زینبؑ کی کیفیت اضطراب

حضرت زینبؑ کا یہ حال تھا:۔

چھریاں سی پھر رہی تھیں دل پاش پاش پر | اک آہ آسماں پہ تھی ایک لاش پر

نہیں معلوم یہ مرثیہ کس سنہ میں کہا ہے۔ حالت کا پتہ مقطع سے چلتا ہے۔ سہ

زمانۂ تصنیف میں مصنف کی حالت

ہر چند طبع پر ہے ہجوم غم و ملال شکوہ مگر کسی کا نہیں شکر ذوالجلال
برعکس ہے کوئی۔ تو کوئی برخلاف ہے آئینۂ دل اپنا ہر اک رُو سے صاف ہے*

ملٹن و دبیر کی خصوصیت شاعری مضامین بلند کی مثالیں

ملٹن اور دبیرؔ میں ایک اور خصوصیت ہے۔ اور وہ خصوصیت بلندی مضامین کی ہے۔ جس کی چند مثالیں دبیرؔ کے کلام سے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اُگتا ہے تخم عفو جہاں وہ زمیں دکھا۔ (اس مرثیہ میں جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔ ع یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا)+

(۲) بے پردہ رُخ قہر الٰہی نظر آیا۔ (اس مرثیہ میں ع برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد)+

(۳) نعل سم توسن سے شرارے ہوئے روشن + رن برج فلک بن گیا۔ تارے ہوئے روشن۔ (اُسی مرثیہ "میں" برہم ہیں صفیں" الخ میں)+

(۴) رو کا شہ دیں نے فرس حور لقا کو + ٹھہرالیا سر تاج سلیمانؑ نے ہوا کو (اُسی مرثیہ میں ع برہم ہیں صفیں الخ)+

(۵) اس حسن کا شعلہ نہ کبھی طور سے نکلا + ظلمت سے سکندر بھی نہ اس نور سے نکلا۔ (ایضاً)+

(۶) جاتے ہیں رسولوں کی دُعا آنے میں تاثیر۔ (اُس مرثیہ میں جس کا مشہور مطلع یہ ہے۔ مقتل ہے چمن فصل بہاری کی ہے آمد)+

(۷) اس رخش کے مُنہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا + چلنے میں یہ سُرعت ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا۔ (مرثیہ "اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے" میں ہے)+

زمانۂ تصنیف

*جہاں تک مَیں نے بزرگوں سے سُنا ہے۔ یہ مرثیہ مرزا صاحب مرحوم نے اُس زمانے میں کہا تھا۔ کہ جب لوگوں نے ان سے اور میر ضمیر صاحب ان کے اُستاد سے بگڑوا دی تھی میر ضمیر صاحب کے تمام شاگرد اور طرفدار مرزا صاحب کے مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ غالباً یہ محمد علی شاہ بادشاہ سوم اودھ کا عہد تھا چنانچہ مقطع میں اُس کا اشارہ فرمایا ہے ع برعکس ہے کوئی تو کوئی برخلاف ہے۔ اس زمانہ تک میر انیس صاحب (مرحوم) لکھنؤ میں فیض آباد سے تشریف لائے تھے نہ اُنکی شہرت ہوئی تھی۔ لہٰذا ان برعکسی کو انیسیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اُس وقت تک انیسیے پیدا ہی نہ ہوئے تھے + ۱۲ ثابت حقیر۔

(۸) طے ہر قدم پر ایک مہینے کی راہ ہے + روئیتِ ہلالِ نعل کی اس پر گواہ ہے۔ (اس مرثیہ میں ہے جس کا مطلع مشہور یہ ہے ؏ جب شامیوں میں صبح کی نوبت کا غل ہوا) +

(۹) ذیل کا بند اس مرثیہ میں ہے ؏ برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد:۔

چہرہ چمنِ قدرتِ خلاقِ دو عالم　　خورشید ہے اس باغ کا اک قطرۂ شبنم
عیسٰے ہے سخن ۔ ہونٹ طہارت میں ہیں مریم　　اور رُوحِ مسیحا لبِ جاں بخش کا اک دم
ہر صنعتِ حق اک رخ روشن سے عیاں ہے
جاں قالبِ آئینہ میں اس رُوے رواں ہے

(۱۰) اور دور نے قمر کو اُلٹ کر رقم کیا۔ (اس مرثیہ "گلگونہ شفق جو ملا حورِ صبح نے" میں ہے) +

(۱۱) اس مرثیہ میں "سرسبز ہو یا رب سخن اس ہیچ مداں کا" جناب پیغمبر آخر الزماں صلعم کی نعت میں فرماتے ہیں "خود آیۂ رحمت ہے سخن وحیِ خدا ہے"۔ اور دُوسرے مقام پر اسی مرثیہ میں ہے۔

(۱۲) شیرازہ نہ خُلد فلک ۔ قالب قرآں + اُستاد دبستانِ ازل نائبِ یزداں ۔ پھر اسی مرثیہ میں ہے۔

(۱۳) ہے ترجمہ قرآنِ مبیں کا دہن ان کا + انوارِ الٰہی کا ہے مشرق بدن ان کا + کل دفتر الہام ہے اک جزوِ تن ان کا +

(۱۴) مرثیہ مذکورہ میں فرماتے ہیں:۔

اسپد زباں قطع ہے خوبیِ بیاں سے　　دندانے ہیں دانتوں کے جدا تیغِ زباں ٭ سے

(۱۵) اس مرثیہ میں "گلگونہ رخسار فلک گرد ہے رن کی" فرماتے ہیں ؏ سمٹی سپر ایسی کہ ہتھیلی کا بنی تِل +

٭ عبداللہ عاریؓ بڈھے صحابی اپنے بڑھاپے کی حالت یوں بیان کرتے ہیں۔ عربوں کو اپنی فصاحت زبان پر السا ناز تھا کہ وہ تمام دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ عبداللہؓ کو بڑھاپے کے سبب سے جو زبانِ بیان کو نقصان پہنچا ہے اسکو حضور صلعم (روحی الفدا) سے عرض کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ دانت گر گئے۔ خوبیِ بیاں جاتی رہی + ۱۲ مؤلف حقیر۔

(۱۶) اک سونے کا نگ بن گئی ہے دھوپ سمٹ کر۔ اس مرثیہ میں ع "برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد" ہے۔

علم ، وسعت نظر ، حکومت الفاظ پر

علم۔ وسعت نظر۔ بلندیٔ خیالات۔ قدرت۔ حکومت الفاظ و بیان پر یہ صفتیں جو ملٹن کے کلام میں ہیں۔ جناب مرزا صاحب کے کلام میں بھی ہیں علاوہ ان خصوصیتوں کے جو ملٹن اور مرزا کے کلام میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور جن کا بیان مختصر طور پر ابھی کیا گیا ہے۔ ایک دو باتیں جو مرزا صاحب سے مخصوص ہیں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

جو خصوصیتیں مرزا میں ہیں اور ملٹن میں نہیں ، مبکی مضامین

(۱) چہرہ یا رزم یا بزم یا سراپا وغیرہ میں مبکی مضامین پیدا کرتے ہیں۔ لڑائی ہو رہی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے گرد اڑ رہی ہے۔ اس کو یوں بیان کرتے ہیں ؎ یہ گرد اڑی رن میں کہ پانی نکل آیا۔ رن میں پانی نکل آنا آہ کیسا دلخراش مضمون ہے۔ فوج حضرت امام حسینؑ سے مقابلہ کے لئے بڑھی۔ علی اصغر اس وقت شہید ہو چکے ہیں۔ حضرتؑ مقابلۂ فوج کو تن تنہا بڑھتے ہیں۔ قبل اس کے کہ تیغ کھینچیں ؎ اصغر کو شہ نے پہلوئے اکبر میں رکھ دیا۔ ہائے دو جانگسل واقعہ نظم کر دئے۔ اور یاد دلا دئے۔ ایک حضرت علی اکبرؑ کی شہادت۔ ایک علی اصغرؑ کی شہادت۔ اور پھر ننھے بھائی کو نوجوان بھائی کے پاس سُلا دینا۔

اس مرثیہ میں (برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد) حضرت امام حسینؑ کے سراپا کی تعریف لکھتے لکھتے ایک بند میں فرماتے ہیں ؎

سر عرش کا دستار گلابی کے تصدق — خون شہدا ریش خضابی کے تصدق
ہر جزو بدن پُرزے ہے ہر عضو جدا ہے — دفتر میں شہادت کے مگر چہرہ لکھا ہے

پروفیسر آزاد مرحوم کی زبانی

ذرا سی تلاش سے ایسے مضامین بکثرت ملینگے۔ مصنف آب حیات حضرت آزاد مرحوم لکھتے ہیں "مرزا دبیر صاحب شوکت الفاظ۔ مضامین کی آمد۔ اس میں جا بجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنائے الم ناک و دل گداز انداز جو مرثیہ کی غرض اصلی ہے۔ ان وصفوں میں بادشاہ تھے"۔

روایات

(۲۰) روایتیں اکثر نظم فرماتے ہیں[1]۔ مثلاً اس مرثیہ میں "قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا" واقعۂ خُم غدیر نظم کیا ہے۔ سیکڑوں اشعار نظم کر ڈالے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں حدیثوں کی طرف اشارہ ہے۔ ع اک ضرب نہ اُس کی رہ دو عالم کی عبادت[2]۔ حضرت جبرئیلؑ آئے ہیں۔ اور پیغام خداوندِ متعال پہنچایا۔ حضرت پیغمبرؐ نے تمام ہمراہیوں کو جمع فرمایا۔ گُل بیابان بھر گیا۔ حضرت نے خطبۂ فصیح و بلیغ ارشاد فرمایا۔ اور مَن کُنتُ مَولاہُ فَھٰذا عَلِیٌّ مَولاہُ فرمایا۔ ان واقعات کو اس مرثیہ (ع قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا) میں بیان کیا ہے۔ حمدِ خداوندِ متعال۔ نعتِ پیغمبرؐ۔ مدحِ حیدرِ کرارؑ کے گوشے اس مرثیے میں نکالے ہیں۔ موقع پر ترجمہ کا حسن دکھایا ہے۔ سہ ہم دونوں کو اک نور سے حق نے کیا خلقت[3]۔ سہ میں جس کا ہوں مولا تو علیؑ اُس کا ہے مولا[4]۔

اس مرثیۂ سہ "سرسبز ہو یا رب سخنِ اس ہیچداں کا" میں بھی ایک روایت نظم کی ہے۔ عبداللہ بن عامر (صحابی) کا خدمتِ حضرتِ پیغمبرؐ میں حاضر ہونا اور اولاد کی التجا کرنا۔ آنحضرتؐ کا دعا فرمانا۔ اور ہند کا پیدا ہونا۔ یزید سے شادی ہونا۔ حضرت امام حسینؑ کا

---

[1] اس سے فائدہ یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ اہلِ مجلس کی (حالات تاریخی وغیرہ کی) معلومات بڑھتی ہے۔ اور روزمرہ معمولی واقعۂ کربلا کے چند حالات بار بار سُننے سے جو بعض شاعروں کے مرثیہ میں آدمی اُکتا جاتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں وہ حال سامع و ناظر کا نہیں ہوتا۔ زیادہ دلچسپی ہوتی ہے + ثابت۔

[2] ضَربُ عَلِیٍّ یَومَ الخَندَقِ اَفضَلُ مِن عِبادَۃِ الثَّقَلَین کی طرف اشارہ ہے۔ حامد اس حدیث کو دوسرے موقع پر نظم فرمایا ہے سہ حق نے کہا کہ حرب علیؑ میری حرب ہے۔ افضل عبادت دو جہاں سے یہ ضرب ہے + ثابت۔

[3] حدیث متواتر اَنَا وَعَلِیٌّ مِن نُورٍ وَاحِدٍ کا گویا ترجمہ ہے۔ اس حدیث کا تواتر دیکھنا ہو۔ تو عبقات الانوار کی جلد حدیث نور دیکھو + ثابت۔

[4] حدیث متواتر مَن کُنتُ مَولاہُ فَھٰذا عَلِیٌّ مَولاہُ الخ کی بابت جلد اوّل و دوم عبقات الانوار دیکھنے کے قابل ہے۔ خدا کی قدرت۔ اسلام کی عظمت۔ علماء اسلام کی تصنیفات کی کثرت۔ ایمان کی حقیقت نظر آتی ہے + ۱۲ ثابت حقیر۔

مع بہتر ۷۲ اعزہ و اصحاب کے شہید ہونا۔ اہلبیت طاہرینؑ کا کربلا سے شام کو قید ہو کر جانا۔ ہند کو خبر پہنچنا اُس کا رنج و الم وغیرہ وغیرہ بیان کئے ہیں۔ اس مرثیہ میں بھی ایک گوشہ پیدا کر کے ہند کی گفتگو لکھتے ہیں۔ اور جو موازنہ وہ درمیان حاکم شام (یزید) اور امام حسینؑ کے کرتی ہے۔ اُس کی تصویر یوں کھینچی ہے بہت سے بند ہیں۔ میں چند بند پر اکتفا کرتا ہوں:۔

وہ تخت نشیں دوزخ اسفل کا مکیں ہے — یہ گوشہ نشیں مہر نبوت کا نگیں ہے
وہ غول ہے یہ خضر ہے وہ ننگ یہ یقیں ہے — وہ سنگ زمیں یہ گہر عرش نشیں ہے
زُنّار ہے وہ گردن ارباب خطا کا
اور نام خدا سبحہ ہے یہ دست خدا کا

وہ عار ہے یہ فخر ہے وہ ننگ ہے یہ نام — شیطاں کا وہ وسواس یہ رحمان کا الہام
وہ درد دل تنگیں وہ ایذا ہے یہ آرام — وہ دیر ہے یہ کعبہ ہے وہ کفر یہ اسلام
وہ جہل میں بوجہل یہ دانش میں نبیؐ ہے
وہ بخل میں قارون یہ بخشش میں علیؑ ہے

یہ بندۂ معبود ہے وہ بندۂ زر ہے — یہ طور کا شعلہ وہ جہنم کا شرر ہے
وہ نحس ہے یہ نیک وہ عقرب یہ قمر ہے — وہ ناخن پا کفر کا یہ دین کا سر ہے
یہ خیر ہے وہ شر۔ یہ نکوئی وہ بدی ہے
وہ بُت ہے بلاشک یہ خلیل احدی ہے

وہ نار۔ یہ فردوس۔ وہ زقوم۔ یہ طوبا — وہ زخم۔ یہ مرہم۔ وہ مرض اور یہ مسیحا
وہ سحر۔ یہ اعجاز۔ وہ فرعون۔ یہ موسےٰ — وہ قہر یہ رحمت۔ وہ نجاست ہے یہ تقوےٰ

٭ انہیں معمر صحابی عبد اللہ ابن عامر کی بیٹی یہ ہند ہے۔ جس نے اہل بیتؑ میں پرورش پائی ہے۔ اُن کے قدر و مرتبہ سے خوب واقف ہے۔ اس لئے امام حسین علیہ السلام و یزید کا وہ مقابلہ الفاظ مندرجہ متن میں کرتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(حاشیہ: اخلاق امام حسینؑ و بد اطواری یزید — برین — خاک شفا)

ہر مصحفِ معبود کی صحت پہ فقط ہے[5]
وہ حرف غلط، لفظ غلط، فرد غلط ہے

وہ زہر ہلاہل، یہ جسے آبِ بقا ہے
وہ ہے مرض الموت، یہ تعویذِ شفا ہے

وہ رہزنِ اسلام ہے، یہ راہ نما ہے
وہ سایۂ آسیب ہے، یہ ظلِ خدا ہے

نخوت ہے اگر ملک پہ اُس اہلِ جفا کو
مل جاتے ہیں یاں دونو جہاں ایک گدا کو[6]

ان بندوں سے مرزا کے تقابل کی قوت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

فصل ۵ — مرثیہ کا چہرہ

(۳) ایک صفت مرزا کے کلام میں اور ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ مرثیہ کا چہرہ نہایت زبردست پرزور اور باشوکت ہوتا ہے۔ طوالت کے خیال سے صرف ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔

گلگونۂ رخسارِ فلک گرد ہے رن کی
ہر خار میں خوشبو ہے بہشتوں کے چمن کی

خورشید نقیبانہ لئے چوب کرن کی
کہتا ہے کہ آمد ہے شہنشاہِ زمن کی

مانندِ براقِ نبوی رخش ہے رو میں
روح القدس آتے ہیں خورا دے کی جلو میں

رخشندہ ہے رن، مہرِ درخشاں کی ہے آمد
ایمن ہوا بن، موسیٰ عمراں کی ہے آمد

جن پڑھتے ہیں کلمہ، کہ سلیماں کی ہے آمد
سجدے میں ہیں سب، قبلۂ ایماں کی ہے آمد

---

[5] اس بند کا چوتھا مصرع دفترِ ماتم میں یوں ہے۔ ع وہ خوف ہے یہ امن وہ یاس اور یہ تمنا۔ اور اس بیت میں بڑا دقیق و بلیغ مضمون کہ گئے ہیں کتابِ خدا (قرآن) اور عترت (ائمہ اطہار) کو جنابِ رسولِ خدا نے اپنا یادگار چھوڑا ہے۔ حدیثِ ثقلین مشہور ہے۔ اس میں اشارہ ہے۔ کہ ہر کتابِ آسمانی کی صحت صرف امام زماں کے دم سے ہے۔ کیونکہ وہ اور کتابِ خدا ہمیشہ ساتھ ساتھ رہینگے۔ ثابت۔

[6] دفترِ ماتم میں ٹیپ اس موقع پر ہے رستے میں کسی نے شمس کی تنویر کو دیکھے۔ کوئی مری آنکھوں سے تو شبیر کو دیکھے۔ مگر حقیر کے پاس قلمی پرانے مرثیہ میں یہی ٹیپ مرقوم ہے۔ جو غالباً ۷۰ برس پہلے کا قلمی ہے۔ ثابت۔

سیاروں پہ ثابت ہے کہ اب خیر نہیں ہے

اطلس کے بچھونے پہ فلک کو نہیں آرام
اس مرتبہ لوٹا ہے کہ نیلا ہے سب اندام

سیاروں پہ ثابت ہوئی اب گردش ایام
خورشید سحر کیلئے اب حشر کی ہے شام

اک دم قدم گاوِ زمیں جم نہیں سکتے
گردش میں ہیں قطبین ۔ فلک تھم نہیں سکتے

عدلِ شہِ والا کا چراغ اب ہُوا روشن
فانوس پئے شمع بگولے کا ہے دامن

ہے ایک جگہ باز و کبوتر کا نشیمن
بجلی ابھی جل جائے جو دیکھے سوئے خرمن

اللہ رے اثر معدلت شاہ زماں کا
دل سوز شرر پنبہ کا ہے ۔ ماہ کتاں کا

ذروں کی نگاہوں میں سماتا نہیں گردوں
کیا دب گیا ہے سر کو اٹھاتا نہیں گردوں

کس سمت بھٹکتا ہُوا جاتا نہیں گردوں
پر امن کا گوشہ کہیں پاتا نہیں گردوں

گردش مہ و خورشید کو گردوں پہ نہیں ہے
یہ پُتلیاں پھرتی ہیں دم باز پسیں ہے

شیروں کا نہ بیشہ ہے نہ آہُو کا ختن آج
مچھلی کا نہ دریا ہے نہ بلبل کا چمن آج

لعلوں کا بدخشاں ہے نہ موتی کا عدن آج
مصر و حلب و زنگ ہے نے رُوم و یمن آج

رہ جائینگے خود برق کے پرکالے بھی جل کر
بہ جائینگے تلواروں کے جوہر بھی پگھل کر

کہتی ہے زمیں گنبد گردوں سے ٹھہر جا
ہستی سے ہے پیغام اجل رن سے گذر جا

شہرہ جو سُنا رخش فلک سیر کا ہر جا
دل پھٹ گیا ۔ بادل کا نہ پھر رعد بھی گرجا

بجلی کی تڑپ اور کڑک آج کہاں ہے
بن بن کے شرر نعل تگاور میں نہاں ہے

پریوں کے پرے قاف میں بیہوش پڑے ہیں
پر خوف سے بالائے بدن بال کھڑے ہیں

رن میں خلفِ ضیغمِ داور کی ہے آمد
زخشندے سے ہیں ذرّے شہِ خاور کی ہے آمد
اعدا ہیں ہرن شیر دلاور کی ہے آمد
دریائے تہوّر کے شناور کی ہے آمد
بالائے زمیں گرد سواری کی نہیں ہے
پردے میں بلا گردِ زمیں۔ چرخ بریں ہے

رن نور۔ زمیں نور۔ جہاں نور ہوا ہے
ظلمت کا طبق نور سے معمور ہوا ہے
دریا صفت تختۂ بلّور ہوا ہے
اب سوکھ کے کانٹا شجرِ طور ہوا ہے
عالم ہے ستاروں کا جو کانٹوں کی چمک پر
ہنستی ہے زمیں ذرّوں کے دانتوں سے فلک پر

کیا یُمنِ تجلّئ ورودِ شہِ دیں ہے
روشن ہے فلک پر کہ زمیں عرش بریں ہے
جو ذرّہ ہے۔ خورشید کی مسند پہ مکیں ہے
نکہت وہ ہے جو صحنِ جناں رن کی زمیں ہے
اس مہر سے ذرّوں کی جو تقدیر لڑی ہے
دن کو گُلِ خورشید پر آج اوس پڑی ہے

محشر ہے عیاں ہیبتِ سلطانِ زمن سے
یک لخت رواں روح ہے عدا کے بدن سے
شبروں کو تعرّض نہیں صحرا میں ہرن سے
شاہیں کے پر جلتے ہیں اب کبک چمن سے
یہ مصحفِ رخ بلبلوں کے پیش نظر ہے
ہر باغ میں سیپارۂ گُل زیر و زبر ہے

باراں ہے نہ رعد ہے نے برق فلک پر
یہ اشک ہے وہ نالہ یہ آہ دلِ مضطر
نے ماہ نہ خورشید نہ گردوں ہے نہ اختر
وہ داغ وہ رعشہ وہ دھواں اور وہ اخگر
الیاس و خضر کو ہوس سیر نہیں ہے

نے لعل یمن میں ہے نہ دریا میں گہر ہے آنسو ہے یہ سوکھا ہُوا۔ وہ خون جگر ہے
اس دم شجر دہر میں جو شاخ شجر ہے وہ شاخ ہے آہو کی نہ گل ہے نہ ثمر ہے
گل چینوں کے رُخ۔ گلشن ہستی سے مُڑے ہیں
صیادوں کے۔ بُلبل کی طرح۔ ہوش اُڑے ہیں

رن میں ہے عجب دبدبۂ خسروِ عادل شمشیر سر اک نشتر جوہر سے ہے بسمل
جوڑے ہُوئے ہاتھوں کو ادب سے ہے جلاجل سمٹی سپر ایسی کہ ہتیلی کا بنی رنل
تیغیں ہیں نیاموں میں مگر آب نہیں ہے
ناوک ہیں ملے چلّوں سے پر تاب نہیں ہے

یا یہ بند (نعت) :۔

سرسبز ہو یارب سخن اس ہیچمداں کا ہر بیت عرا قطعہ ہے۔ باغ جناں کا
فوّارہ چھُٹے کوثر معنی و بیاں کا کلمہ پڑھے بلبل عری طوطی زباں کا
ذکر اُس کے سخن کا ہے جو فخر فصحا ہے
خود آیۂ رحمت ہے۔ سخن وحی خدا ہے

وہ کون؟ رسول جز و کل خطبۂ ایماں سرتاج فصیحان عرب آیۂ عرفاں
شیرازہ نہ جلد فلک۔ قالب قرآں اُستادِ دبستان ازل۔ نائب یزداں
جانے وہ شرف ان کا جو قرآن کو جانے
قرآن سے پہلے انہیں بھیجا ہے خُدا نے

عالم اُن کا جو ہے فرش پہ وہ عرش بریں پر اس علم سے احمدؐ کا قدم ہے سر دیں پر
روشن ہے جلال نبوی اہل یقیں پر حق عرش پہ مداح ہے انسان زمیں پر
ہر رمز ہے آئینہ دل خیر امم پر
دو نقطوں کی مانند دو عالم ہیں قدم پر

مہمان جو گیا عرش معلےٰ پہ تو کیا تھا مشتاق نبیؐ کے لب و لہجہ کا خدا تھا
خالق نے سخن ان کیلئے خلق کیا تھا شبیر ہیں سخن الیسانہ رسولوں میں ہُوا تھا
الہام کا رُتبہ سخنِ پاک سے جانا
قرآن کو قرآں دہنِ پاک سے جانا
سلطانِ کلام فصحا ہے سخن ان کا ہے ترجمہ قرآن مبین کا دہن ان کا
انوار الٰہی کا ہے مشرق بدن ان کا کُل دفتر الہام ہے اک جزو تن ان کا
عاجز فصحا کو کیا۔ تقریر قوی نے
کلمہ جو پڑھایا۔ تو کلام نبوی نے

منقبت جناب فاطمہؑ

یا یہ (منقبت جناب فاطمہؑ) :-
بلقیس پاسباں ہے۔ یہ کس کی جناب ہے؟ حریم ورد خواں ہے۔ یہ کس کی جناب ہے؟
دہلیز آسماں ہے۔ یہ کس کی جناب ہے؟ شانِ خدا عیاں ہے۔ یہ کس کی جناب ہے؟
کُرسی زمیں سے لیتی ہے گوشے پناہ کے
بیٹھا ہے عرش سائے ہیں اس بارگاہ کے
حوران ہشت خلد ہیں اک اہتمام کو دار السلام در پہ کھڑا ہے سلام کو
سجدہ یہیں حلال ہے بیت الحرام کو سُورج نثار صبح کو ہے۔ چاند شام کو
دیکھا کریں۔ کھڑے ہُوئے اس آستان کو
یاں بیٹھنے کا حکم نہیں آسمان کو
صحرائے لامکاں کی فضا۔ اس سے تنگ ہے جنت کا نام۔ اس کی بزرگی کا ننگ ہے
فضل خدا کے سایہ کا ہر سُو یہ ڈھنگ ہے یاں دُھوپ میں بھی کا غذ ابری کا رنگ ہے
زائر کو اس حریم کے عیش و نشاط ہے
اس کا بچھونا۔ رحمتِ حق کی بساط ہے

عفت پکارتی ہے مقام حجاب ہے — شیعو! جناب فاطمہؑ کی یہ جناب ہے
حوا* و آسیہ* کا یہاں ہم خطاب ہے — زہراؑ کے رعب و دبدبے سے زہرہ آب ہے
جاری ہے منہ سے جاریۂ فاطمہؑ ہیں ہم
مخدومۂ کائنات کی یہ خادمہ ہیں ہم

ہر خشت روضہ۔ دفتر حکمت کی فرد ہے — موقوف یاں زمانے کا ہر گرم و سرد ہے
(مزارؔ) گرمی کا نے بخار نہ کلفت کی گرد ہے — پر صاحب رواق کے پہلو میں درد ہے
ہم۔ تم۔ یہ جانتے ہیں۔ کہ سوتی ہیں فاطمہؑ
اس کی خبر نہیں ہے۔ کہ روتی ہیں فاطمہؑ

شان خدا ہے صل علےٰ شان فاطمہؑ — حیدرؑ کی جانماز ہے دامان فاطمہؑ
روزہ ہر ایک روز ہے مہمان فاطمہؑ — کہتی ہے عید فطر میں قربان فاطمہؑ
بہر نماز قوت کی تقلیل کرتی ہیں
تسبیح حق میں آپ کو تہلیل کرتی ہیں

بیہوش ہیں فضائل زہراؑ سے عقل و ہوش — خود بے لباس اور خلائق کی پردہ پوش
عسرت سے بے حواس مگر یاد حق کا ہوش — فاقے سے چہرہ خشک ہے دریادلی کا جوش
مستغنی المزاج ہیں عالم نواز ہیں
زیور سے مثل ذات خدا بے نیاز ہیں

دیکھو مرثیہ ع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔ یا یہ مرثیہ:-

(چہرہ ۵) برہم ہیں صفیں شاہ شہیداںؑ کی ہے آمد — ہر مورچہ لرزاں ہے سلیماںؑ کی ہے آمد
(دبدبۂ آمد) فرعونیوں پر موسیٰؑ عمراں کی ہے آمد — تیغوں کے جہازوں پہ بھی طوفاں کی ہے آمد

* حواؑ زوجہ جناب آدمؑ اور آسیہؑ فرعون کی زوجہ تھیں جنہوں نے جناب موسیٰؑ کو گویا پرورش فرمایا تھا جاریہ کنیز و خادمہ کے معنی پر ہے۔

جاری و جاریہ کی رعایت و تجنیس لعض ظاہر ہے + ۱۲ ثابت۔

جن سیر کو نکلے تھے یہ رستے سے مُڑے ہیں
پریوں کی طرح ہوش سلیماںؑ کے اُڑے ہیں

رن میں پسر فاتح خیبر کی ہے آمد
صف گرتی ہے صف پرشہ صفدر کی ہے آمد
تاج شرف و فخر سکندر کی ہے آمد
شاہ شہدا سبط پیمبرؐ کی ہے آمد
پیشانیٔ جن و ملک اب فرش زمیں ہے
چتر سر اقدس پر جبریل امیں ہے[1]

خورشید ہے دن کو مہ نو شرم سے گھٹ کر
اغلب ہے کہ سیدھا فلک کج ہو اُلٹ کر
پانی ہوئی جاتی ہے گھٹا ڈھالوں کی پھٹ کر
اک سوئے کا نگ بن گئی ہے دھوپ سمٹ کر
ثابت ہے کہ سیارہ ہر اک ماند ہُوا ہے
سیارے ہیں کیا رشک شہر بدر چاند ہُوا ہے

فتح و ظفر و نصرت و شمشیر دو سر۔ ایک
قہر و اجل و رعب شہ جن و بشر۔ ایک
مولا کی سپر اور فلک ہفت سپر۔ ایک
افضال خدا۔ اور نظر فیض اثر۔ ایک
ہیبت ہے یہ بندہ کی دیا خوف خدا ہے
سر خود سے دل سینے سے۔ جاں تن سے جُدا ہے

بے چرخ ہے نے رشت نہ کہسار نہ قلزم
وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم[2]
ہر برج ہے گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم
جس طرح سے آندھی میں صدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اُڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

---

[1] دفتر ماتم میں یہ بند نہیں ہے۔ مگر ایک اور قلمی مرثیہ میں ہے جو میرے پاس پرانا لکھا ہُوا ہے۔ اور جلد مراثی نولکشوری میں ہے۔ مگر اُس میں ٹیپ غلط ہے۔ مَیں نے قلمی مرثیہ سے صحیح لکھ دی ہے + ثابت۔

[2] لف و نشر مرتب ہے + ثابت۔

یاں شور وہاں غل اِدھر آمد اُدھر آمد — دیتی ہے فقط بے خبری کی خبر آمد
اب سینے میں دم کی نہ درآمد نہ برآمد — بالائے سر آفت ہے تو پیش نظر آمد
ہر تن کو ہے دشوار بچانا دل و جاں کا
آنا شہِ والا کا ہے جانا دل و جاں کا

آواز انا العرش کی پیدا ہے زمیں سے — ہے بسکہ دماغ اوج پہ نور شہ دیں سے
الفت ہے قدم گاہ شہِ عرش نشیں سے — ہر جا ہے نیا فرش فرشتوں کی جبیں سے
سائے کے اگر پاؤں پھسل جائیں بجا ہے
پانی کے عوض نور کا چھڑکاؤ ہوا ہے

گداز دل

مرزا کے کلام میں گداز ہے۔ مرثیت ہے۔ مرثیہ خواں۔ چند بند پڑھ کر مجلس کا فال نکال لیتے ہیں۔ مجلس کو رُلانے میں محرّم الحرام میں ایسے مرثیے بہت کام دیتے ہیں۔ مصنّف آب حیات لکھتے ہیں ”حسن قبول اور فیض تاثیر خدا نے دیا تھا۔ ان کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا۔ تو اکثر رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ اور یہی اس کام کی علّت غائی ہے“+

صنائع

مرزا کے کلام میں صنعتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً طباق۔ تقابل۔ تضاد و مطابقت۔ تطبیق (جس کی شاخ مقابلہ ہے)۔ ایہام تضاد۔ ایہام تناسب۔ مراعات النظیر۔ توفیق۔ تناسب۔ ایتلاف۔ مشاکلہ۔ مزاوجہ۔ ارصاد۔ عکس۔ رجوع۔ لف و نشر۔ جمع۔ تفریق۔ تقسیم۔ تجرید۔ مبالغہ۔ مذہب کلامی۔ حسن تعلیل۔ تاکید المدح بما یشبہ الذّم۔ تاکید الذّم بما یشبہ المدح۔ استتباع۔ توجیہ۔ الہزلُ الذی یُرادُ بہ الجدّ۔ تجاہل عارفانہ۔ قول بالموجب۔ تعجب۔ اعتراض۔ تجنیس مقلوب۔ ردّ العجز۔ لزوم مالا یلزم (جس کی شاخیں) بے نقط۔

بانقط۔ تحت النقط۔ فوق النقط (ہیں)۔ اور سجع ترصیع۔ ذوالقافتین۔
متلوّن۔ سیاق الاعداد وغیرہ وغیرہ ہیں ٭

پُرگوئی الفاظ مستعملہ دبیر وغیرہ

مرزا صاحب بہت پُرگو تھے۔ مرثیوں کی تعداد صحیح تو کہیں دیکھی نہیں۔
لیکن سیکڑوں بلامبالغہ ہیں۔ اس بات کا تو (افسوس) کسی کو خیال بھی نہ آیا ہوگا۔
کہ تحقیق کرے۔ کہ مرزا صاحب نے یا ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ دلگیر۔ انیس۔
مونس۔ انس۔ نفیس۔ اوج (مدظلہ)۔ وحید۔ رشید۔ عارف
(مدظلہما) وغیرہ نے کس قدر الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انگریزی کے ہر کامل کی
نسبت معلوم ہے۔ مثلاً (۱) ملٹن نے قریب آٹھ ہزار کے (۲) برگ و
گلیڈاسٹن نے بھی اسی قدر (۳) شکسپیر نے سولہ ہزار۔ (میں حافظ سے
کام لے رہا ہوں)۔ اسی طرح اور نثار اور شاعروں کی نسبت لکھا ہے۔ جملہ معترضہ
ذرا طولانی ہوگیا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ جناب مرزا دبیر صاحب نہایت مستعد

ایک واقعہ کربلا ہزار طرح باندھا شان معرکہ کربلا

اور پُرگو مرثیہ گو تھے۔ ایک کربلا کے واقعہ کو ہزار طرح سے باندھا ہے۔ جو
شاعر دُنیا میں مشہور ہیں۔ وہ اپنی ایک نظم یا کتاب سے مشہور ہیں۔ ایک کتاب
یا نظم میں ایک مضمون بیان ہوا۔ اور پھر خاتمہ ہے۔ اور یہاں دیکھتے۔ کہ وہی
ایک مضمون ہے۔ اور سیکڑوں مرثیوں میں نئی نئی طرح سے بندھتا چلا آتا
ہے۔ اور ختم ہی نہیں ہوتا۔ بیابان کربلا کی دھوپ کی شدت لو اور گرمی کے
ساتھ دشمنوں کی فوج کی کثرت اُن کی شقاوت۔ بیرحمی۔ سنگدلی۔
بیوفائی۔ حرص۔ طمع زر۔ وعدہ خلافی۔ ظلم و تعدّی۔ بُزدلی۔ بیحیائی۔
احسان فراموشی۔ کفران نعمت۔ ہتک اسلام۔ ناخداترسی۔ بُخل۔
جہل۔ کج فہمی۔ الغرض جہان بھر کی بُرائیاں ایک طرف۔ دُوسری طرف
صبر و شکر و تسلیم و رضا۔ تحمّل و حلم۔ استقلال و ثابت قدمی۔ شجاعت۔

زہد و عبادت۔ تقویٰ و ورع۔ حسنِ خلق۔ مروّت۔ مراعات۔ عدالت۔ عفو۔ حیا۔ احسان۔ جود و سخا۔ دینداری۔ خداترسی۔ خداپرستی۔ عزت اسلام۔ اعلائے کلمۃ الحق۔ غرضیکہ جملہ صفات حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے ساتھ تین روز کی بھوک پیاس کے صدمے۔ اعزّہ و احباب کو میدان جنگ میں بھیجنا۔ اُن کی لاشیں اُٹھانا۔ اہل حرم کو سمجھانا۔ اپنی قلیل فوج کو جس کی تعداد بہتّر (مشہور) ہے آراستہ کرنا۔ عرب کے آداب جنگ کے موافق ایک ایک کو قتال کے واسطے بھیجنا۔ وہ شجاعت و بہادری دکھلانا کہ جس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ غنیم کی کثرت فوج کے لحاظ سے کہ عقب خیمہ گاہ سے حملہ نہ ہو خندق کھودنا۔ رسالت پناہ کے کُنبہ کی حُرمت کا ہر مصیبت میں سب سے زیادہ خیال ہونا۔ اُس سے بالاتر رضائے خالق کا لحاظ کہ استقلال و صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ ہر بات ایسی تھی۔ جو رسول خدا کے نواسہ اور خدا کے برگزیدہ بندہ ہونے کو کماحقّہ ثابت کرتی تھی۔ حُرؑ کا عفو تقصیر۔ اُن کا شہید ہونا۔ اہلبیتؑ کے خیموں کی تاراجی۔ اُن کی اسیری اور شام کو جانا۔ امام زین العابدینؑ کا تپ میں مبتلا ہونا۔ نہ دوا ہے نہ غذا۔ پانی تک میسّر نہیں۔ پھر اُن کی اسیری اور دمشق کے قیدخانے کے مصائب۔ ہتکِ حرمت۔ یہ بڑے بیٹے پر گذری۔ اِن سے چھوٹے جناب علی اکبرؑ شبیہ پیغمبرؐ کی پیاس۔ نوجوان بیٹا جہاد کر کے واپس آتا ہے۔ کیسا جہاد؟ کہ اس پیاس اور دھوپ میں تن تنہا نے ہزاروں لاکھوں سے مقابلہ و مقاتلہ کر کے اپنے اُس قول کو ثابت کر دیا۔ "اُقاتِلُکُم بِالسَّیفِ اَحمِی عَن اَبِی۔ ضَربُ غُلامٍ ہَاشِمِیٍّ عَرَبِی تَاللہِ لَا یَحکُمُ فِینَا بنُ الدَّعِی۔ اَطعَنُکُم بِالرُّمحِ حَتّٰی یَنثَنِی۔ اپنے والد ماجد کی حمایت و نصرت میں اس طرح تم کو قتل کرونگا۔ اور ایسی شمشیرزنی

اور نیزہ بازی کے جوہر دکھاؤنگا۔ کہ تم ہمیشہ یاد رکھو گے۔ کہ کسی ہاشمی قبیلہ کے لڑکے (نوجوان) سے مقابلہ ہوا تھا۔ واللہ ہم اہلبیت رسول خداؐ پر حرام زادہ حاکم نہیں ہوسکتا۔" اب واپس اگر باپ سے پانی مانگتے ہیں۔ حسینؑ نے کس بے بسی کے عالم میں فرمایا ہے۔ کہ اپنی زبان میرے مُنہ میں دو۔ شاید تسکین ہو۔ بیٹے نے تعمیل حکم کی۔ مگر فوراً زبان نکال لی۔ عرض کرتے ہیں۔ بابا!! آپ کی زبان تو میری زبان سے زیادہ خشک ہے۔ الغرض روز عاشوراء (سنہ ۶۱ھ) کی وہ دوپہر تھی۔ کہ دُنیا کے تمام رذائل و فضائل کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ حضرت حالی مدظلہ العالی نے ایسے دل کش اور پُراثر الفاظ میں حالات روز عاشور کی تصویر اپنے دیوان کے مقدمۂ شعر و سخن میں کھینچی ہے۔ جس کو نقل کئے بغیر دل نہیں مانتا:۔

حضرت حالی و معرکۂ کربلا

"فضائل اخلاق کا نمونہ اس سے اعلےٰ اور اشرف اور کیا ہوسکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے نبیؐ کا نواسا جس کے آگے ہر مسلمان کا سر جُھکنا چاہئے تھا۔ اور جس کو اُن سے بے انتہا اُمیدیں ہونی چاہئیں تھیں۔ وہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔ ریگستان عرب کی لُو اور گرمی ہے۔ عورتیں۔ صغیر سن بچّے اور سارا کُنبہ ہمراہ ہے۔ مدینے سے کُوفے تک مصیبتوں کی راہ طے کرنی ہے۔ جو اعوان و انصار بن کر ساتھ چلے تھے۔ اُن میں سے چند کے سوا سب ساتھ چھوڑ کر چل دئیے ہیں٭۔ جن لوگوں نے متواتر خط اور پیغام بھیج کر اور خدا اور رسولؐ کو درمیان دے کر نصرت دیاری کے وعدے

٭ان الفاظ سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ مدینہ سے جو لوگ ہمراہ چلے تھے۔ وہ جُدا ہوگئے۔ حالانکہ دراصل ایسا نہیں ہُوا۔ مدینہ سے جو وفادار چلے تھے۔ اُن میں سے بجز ایک شتربان کے اور سب کے سب کربلا میں امام حسینؑ پر صدقے ہُوئے۔ جرأت سے لڑے۔ نام نمود سے شہید ہُوئے۔ جو لوگ رستے میں جابجا سے ساتھ ہوئے تھے۔ وہ ضرور امام حسینؑ کو چھوڑ کر چلتے پھرتے نظر آئے۔ غالباً مولوی حالی مدظلہ العالی کا بھی یہی مطلب ہے ۱۲ مؤلف حقیر

پر بلایا تھا۔ وہ اُن کو آکر یک قلم منحرف و برگشتہ پاتا ہے۔ اور تمام اُمیدیں مبدّل بہ یاس ہو گئی ہیں۔ بااین ہمہ وہ راضی برضا ہے۔ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے۔ جس شخص کے تسلط کو وہ ملک اور قوم اور دین کے حق میں ایک مرض مہلک سمجھ کر اُس کی بیعت سے انکار کر چکا ہے۔ باوجود ان تمام شدائد کے اپنے انکار پر اُسی طرح قائم ہے۔ دشمنوں نے کھانا اور پانی سب بند کر رکھا ہے۔ اور دریائے فرات آنکھوں کے سامنے بہ رہا ہے۔ دشمنوں کے گھوڑے۔ گدھے اور اُونٹ تک اُس سے سیراب ہوتے ہیں۔ مگر اُس کا سارا کنبہ تین۳ روز سے پیاسا ہے۔ اُس کے ننّھے ننّھے بچّے پانی کی ایک ایک بُوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے۔ کہ وہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ بااین ہمہ وہ اپنے ارادہ پر اُسی طرح ثابت قدم ہے۔ کسی سختی اور کسی مصیبت سے اُس کے استقلال میں فرق نہیں آتا۔

اُس کے یار و مددگار کُل ستّر او ۲ دو بہتّر آدمی ہیں۔ اور ایک ٹڈّی دل سے مقابلہ ہے۔ لڑنے میں اپنا اور سب عزیزوں اور دوستوں کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ خیمے اور اسباب کا لُٹنا۔ باقی ماندوں کا اسیر ہونا۔ عورتوں کی بے پردگی اور بادیہ پیمائی یہ سب آفتیں گویا آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں۔ مگر وہ اِن سب کو گوارا کرتا ہے۔ اور بہتر سمجھتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت کرے۔ اور اُس کی حکومت کو تسلیم کر لے۔ وہ اپنے بھائی بیٹے بھتیجے اور بھانجوں کو نہایت اطمینان کے ساتھ مسلّح اور آراستہ کر کے ایک ایک کو ہزاروں کے ساتھ لڑنے کے لئے بھیج رہا ہے۔ اُن کے بازو تلواروں سے کٹتے۔ اُن کے کلیجے برچھیوں سے چھدتے۔ اور اُن کی چھاتیاں تیروں سے چھدتی دیکھتا ہے۔ ایک ایک کی لاش کاندھے پر رکھ کر لاتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے زمین میں دفن کرتا ہے* خیمے میں

* امام حسینؑ نے صرف ایک دودھ پیتے ہوئے بچّے (علی اصغر) کی لاش دفن کی ہے۔ جو نہ معلوم کس طرح موقع مل گیا تھا۔

عورتوں کے کہرام سے ہر وقت ایک قیامت برپا ہے۔ بی بی۔ بیٹی اور بہنوں کی دل خراش صدائیں دل میں ناسور ڈال رہی ہیں۔ چھ مہینے کا شیر خوار بچہ ایک بے رحم کا تیر کھا کر گود میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ اُس کے حلق سے خون کا فوّارہ جاری ہے۔ سب چھوٹے بڑے کام آ چکے ہیں۔ اور بچہ بھی کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب سب کے بعد اپنی باری آئی ہے۔ اور پھر اہل بیت کے جہاز کا خدا کے سوا کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ ان سب بلاؤں کا سامنا ہے۔ اور مصائب و آفات کی گھنگور گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی چیز اُس کے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی۔ کہ وہ کوہ راسخ کی طرح اپنے ارادے پر ثابت قدم ہے۔ اور اپنے قول سے نہیں ہٹتا۔

وہ بے رحم قوم جو نانا کا کلمہ پڑھتی ہے۔ اور نواسے کے خون کی پیاسی ہے۔ جو چند نفوس کے مقابلے کے لئے ایک ٹڈی دل کو ساتھ لیکر آئے ہیں۔ اور اپنی تمام طاقت اس بات میں صرف کر رہے ہیں۔ کہ جو ایذائیں اور تکلیفیں آدمؑ سے تا ایں دم کسی ذی رُوح نے کسی ذی رُوح کو نہیں دیں۔ وہ سب اپنے نبیؐ کے دلبند و دل اور جگر کے ٹکڑوں پر ختم کی جائیں۔ جو حرص و طمع کے نشے میں دین۔ ایمان۔ رحم۔ انصاف۔ آدمیت۔ ہمدردی اور تمام فضائل انسانی سے دست بردار ہو کر خدا کا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۷۴) ورنہ کسی اور عزیز یا رفیق کی لاش دفن کرنیکی مہلت نہ ملی تھی۔ ازبسکہ مولوی الطاف حسین صاحب حالی مدظلہ العالی مرثیوں کی سُنی سُنائی باتیں لکھ رہے ہیں۔ شاید اسی واقعہ دفن علی اصغرؑ کا انکو خیال رہا۔ اور سہواً سب لاشوں کا دفن کرنا تحریر فرما گئے۔ ورنہ میرے علم میں کسی مستند مرثیہ گو نے بھی بجز علی اصغرؑ کے اور کسی شہید کا دفن کرنا امام حسینؑ کی نسبت نظم نہیں کیا ہے۔ شاید کسی کم علم مرثیہ گو نے کسی مرثیہ میں سب شہیدوں کا دفن کرنا (امام حسینؑ کی نسبت) لکھ دیا ہو۔ اور وہی مولوی حالی صاحب مدظلہ نے سُن کر نقل فرما دیا۔ ورنہ مولوی صاحب موصوف کی معلومات کی وسعت کا مجھے اعتراف ہے۔ یہ بات نیک نیتی سے ناظرین کی آگاہی کے لئے لکھ دی ہے۔ مولوی صاحب کی غلطی کی گرفت کی نیت سے نہیں لکھی گئی۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

گھر ڈھلانے یعنی خاندان نبوّت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر طیّار اور کمر بستہ ہیں۔ نہ وہ اُن کو بد دُعا دیتا ہے۔ نہ اُن کی شکایت کرتا ہے۔ نہ اُن پر غُصّے ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جن کے ماننے کا وہ دعوےٰ کرتے ہیں اُن کو جتاتا ہے۔ اور اُن کے فرائض جو خاندان نبوّت کے ساتھ اُن کو بجالانے چاہئیں اُنہیں یاد دلاتا ہے۔ چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دل میں یہ اُمنگ ہے۔ کہ سب سے پہلے مَیں اپنی جان خاندان پر نثار کروں۔ باپ کی یہ خواہش ہے۔ کہ تلواروں کی آنچ میں بھائی۔ بھتیجے اور بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دُوں۔ بھائی۔ بھائی اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو طیّار اور میدان جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں[1] کی یہ تمنّا ہے۔ کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں۔ بھتیجے کی یہ آرزو ہے۔ کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے مَیں بنوں۔ بہن کو یہ ارمان ہے۔ کہ اپنے بچّوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کر دے۔ بھائی اِس فکر میں گھُلا جاتا ہے۔ کہ اگر بھانجے میری رفاقت میں مارے گئے۔ تو بہن کو کیا مُنہ دکھاؤنگا۔ چچا گو خود بھی تین دن کی پیاس سے بے قرار ہے۔ مگر اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ لیکن پیاسی بھتیجی کی بیقراری کسی طرح نہیں دیکھ سکتا[2]۔ وہ مشکیزہ گلے میں ڈال اور جان ہتیلی پر رکھ دشمنوں کی صفیں چیرتا ہُوا دریا میں گھوڑا جا ڈالتا ہے۔ دریا کا سرد اور شیریں پانی لہریں مار رہا ہے۔ اور پیاس کے مارے آنکھوں میں دم ہے۔ دل قابُو سے باہر ہُوا جاتا ہے۔

---

[1] بھانجوں سے مراد عونؑ و محمدؑ پسران عبداللہؑ بن جعفر طیّار ہیں۔ جو حضرت زینبؑ ہمشیرہ امام حسینؑ کے باوفا۔ بہادر مشہور عالم فرزند ہیں۔ اور بھتیجے سے یہاں قاسمؑ بن حسنؑ مراد ہیں۔ حالانکہ حضرت قاسمؑ کے اور بھائی بھی شہید ہُوئے ہیں۔ وہ بھی بھتیجے امام حسینؑ کے ہیں۔ اسی طرح دو بھانجے اور بھی امام حسینؑ کے معرکہ کربلا میں شہید ہُوئے۔ جو حضرت مسلم بن عقیل کے دو فرزند تھے۔ یہ دو فرزند غالباً اُن کے علاوہ تھے جو کوفہ میں شہید ہُوئے حضرت مسلمؑ کو امام حسین کی بہن بھی منسوب تھیں۔ اُنہیں کے یہ دو فرزند تھے۔ اس رشتہ سے بھانجے ہُوئے + ثابت۔

[2] حضرت عباسؑ بن علیؑ سے مراد ہے۔ جو امام حسینؑ کے بھائی اور وفادار۔ علمدار فوج اور ایک لاثانی شجاع تھے + ثابت۔

دو چُلّو پانی میں پیاس بُجھتی ہے۔ مگر غیرت اور حمیّت اجازت نہیں دیتی۔ کہ ننّھے ننّھے بچّوں کی پیاس بُجھنے سے پہلے اپنی پیاس بُجھالے۔ وہ مشکیزہ بھر کر اُسی طرح پیاسا دریا سے پھرتا ہے۔ تاکہ جلدی جاکر بچّوں کے خشک حلق میں پانی چُوائے۔ لیکن دشمنوں نے گھیر کر دونوں بازو کاٹ ڈالے ہیں۔ اس پر بھی اُس کو اپنے بازوؤں کا کچھ خیال نہیں ہے اگر ہے تو مشکیزہ کی فکر ہے۔ کہ مُبادا پانی ضائع ہو جائے۔ اور ننّھے پیاسے رہ جائیں وہ سب حربے اپنے اُوپر لیتا ہے۔ مگر مشک پر آنچ نہیں آنے دیتا جب تک کہ زخموں سے چُور ہو کر گھوڑے سے نہیں گرتا۔

بیبیاں خاوندوں کو اور مائیں بیٹوں کو زخمی اور قتل ہوتے دیکھتی ہیں۔ مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی۔ اور مُنہ سے سانس تک نہیں نکالتی٭ صرف اس خیال سے کہ جس مربّی اور سرپرست کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں۔ اُس کے دل پر میل نہ آئے۔ اور وہ اپنے دل میں ہم سے محجوب نہ ہو۔ سب اُس کی اور اُس کی اولاد کی خیر مناتے ہیں۔ اپنے بچھڑے ہوؤں کو کوئی یاد نہیں کرتی۔

٭ بعض ناواقفوں کو ایسے مضامین مرثیوں میں دیکھ کر یا سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ ماں نے کس دل سے کہا ہوگا۔ کہ میرا بیٹا قتل ہو جائے۔ مگر امام حسینؑ کی جان کسی طرح بچ جائے۔ مگر جو لوگ امام حسینؑ کے عزیزوں اور رفیقوں کی وفاداری کو جانتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ایسا ہی ہُوا ہے۔ ہر بی بی اپنے فرزند کو امام حسینؑ پر گویا نثار کرتی تھی۔ اور شکر خدا بجا لاتی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت علی اکبرؑ ہم شکل پیغمبرؐ کی والدہ ماجدہ نے اُن کو امام حسینؑ پر نثار کر دیا۔ اسی بنا پر جناب مرزا صاحب مرحوم نے اُن معظمہ کی زبانی ایک مرثیہ میں یہ خیال نظم فرمایا ہے۔ کہ ع اکبرؑ سے مَیں گذری مرے والی کو لے آؤ۔ ازبسکہ مولوی شبلی صاحب اس نکتہ سے ناواقف تھے (جس سے مولوی حالی صاحب واقف ہیں)۔ اُنھوں نے مرزا صاحب پر اعتراض جڑ دیا۔ مَیں نے اس کا مفصّل و مدلّل جواب مولوی شبلی صاحب کو دیا ہے۔ جو اپنے موقع پر اس کتاب میں درج ہے۔ وہ مقام ناظرین کے ملاحظے کے قابل ہے۔ ۱۲ مؤلّف حقیر۔

دو صغیر[1] سن بھائی جو صرف اس قصور پر کہ نبیؐ کے نواسے کے رشتہ دار ہیں حاکم کے حکم سے واجب القتل ٹھیرے ہیں۔ جلّاد دونوں کے سر پر تلوار تولے کھڑا ہے۔ بڑا بھائی منّتیں کرتا ہے۔ کہ پہلے میرا سر اُتار۔ اور چھوٹا بھائی کہتا ہے۔ کہ پہلے مجھ پر وار کر۔ ایک[2] خدا کا بندہ جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبیؐ کے نواسے سے لڑنے کو آیا ہے۔ باوجودیکہ دشمنوں کا ساتھ دینے میں اُس کو ہر طرح دولت وجاہ ومنصب کی توقّع ہے۔ اور اُن کا ساتھ چھوڑنے میں جان اور مال اور خاندان کی تباہی کا یقین واثق ہے۔ جس قوم میں وہ گھرا ہوا ہے۔ وہاں کوئی ترغیب یا تقریب ایسی نہیں۔ جو اُس کا دل ظلم و بے دردی و بے دینی اور حبِّ جاہ و ثروت سے ہٹا کر رحم و ہمدردی و دینداری کی طرف مائل کر سکے۔ اُس کو ہر طرف سے یہی آواز آتی ہے۔ کہ جلد اس قلیل جمعیت پر فتح حاصل کیجئے۔ مَردوں کے سر اُتاریئے۔ عورتوں اور بچّوں کو اسیر کر کے لے چلئے۔ اور حاکم سے چل کر اپنی خدمات کا صلہ لیجئے۔ دوسری طرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا۔ جس کے لالچ میں وہ ان تمام فائدوں سے قطع نظر کر کے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑ دے۔ بلکہ بخلاف اس کے طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آتا ہے۔ بااینہمہ وہ ان تمام دُنیوی منفعتوں اور اُمیدوں پر خاک ڈال کر اُن ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ حق کی نُصرت میں اپنی جان دینے کو فوزِ عظیم جانتا ہے۔ اور سب سے پہلے خاندانِ نبوت

---

[1] جناب مسلم بن عقیلؑ کے دو ننھے یتیم بچوں سے مراد ہے۔ جو مسلمؑ امام حسینؑ کے نائب اور چچا زاد بھائی تھے۔ اور جو کوفے میں امام حسینؑ کے حکم سے آئے۔ اور کوفیوں سے بیعت امام حسینؑ لیکر چند روز ٹھیرے تھے کہ کوفی ان سے پھر گئے اور وہ شہید ہوئے۔ یہ دونوں یتیم اوّل قید ہوئے۔ داروغہ محبس نے جو نیک نہاد مسلمان تھا ان بچّوں کو چھوڑ دیا۔ کہ مدینہ چلے جائیں۔ یہ بچے پھر گرفتار ہو کر قتل ہوئے ۱۲ ثابت۔

[2] یہ خدا کا بندہ حُر ریاحی ہے۔ جو ایک ہزار یا اس سے زیادہ سواروں کا سردار اور نہایت بہادر اور صاف اور سچّا شخص تھا۔ فوجِ یزید سے دلیرانہ نکل کر امام حسینؑ سے ملا۔ اور سب سے پہلے شہید ہوا ۱۲ ثابت۔

پر اپنی جان فدا کرتا ہے*۔ چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزند نبیؐ کے ہمراہ ہیں۔ اور جو ایک ٹڈی دَل کے مقابلے میں اِس قدر قلیل ہیں۔ کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے برگشتہ اور منحرف پاتے ہیں۔ خود اُس کے ساتھیوں اور رفیقوں کو اثنائے راہ میں اُس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر اور آنکھیں چرا چرا کر جاتے دیکھ چکے ہیں۔ اپنے لئے اُس کا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دُنیا کی کوئی بھلائی نہیں سوجھتی۔ بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ اُس کی رفاقت کی بدولت بھوک اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آ رہی ہے۔ نہ کوئی رشتہ ہے نہ قرابت ہے۔ جو اُس کی رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو۔ مگر وفاداری کا طوق اُن کی گردن میں اور دوستی اور اخلاص کی زنجیر اُن کے پاؤں میں پڑی ہے۔ کوئی خوف اور کوئی طمع اُن کے اس تعلّق کو قطع نہیں کر سکتی۔ ہر وقت یہ آرزو ہے۔ کہ کب اذنِ جنگ ملے۔ اور کب خاندان نبوّت پر اپنی جانیں قربان کریں۔ اور کب اس فرض سے سُبک دوش ہوں"+

مرزا صاحب نے یہ مضامین سیکڑوں طرح سے سیکڑوں مرثیوں میں باندھے ہیں۔ اور نئی نئی طرح سے باندھے ہیں۔ بقول آتش مرحوم ؎

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی + جب سُنائی نئی سُنائی بات

یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مضامین کی آمد کا چشمہ برابر جاری ہے۔ اور اس طرح کہ اُسکو

---

* حر کے لفظی معنی آزاد کے ہیں۔ اس زمانہ کے لوگ آزادی پکارتے ہیں۔ مگر اکثر آزاد کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی پابندی سے آزاد ہوں۔ حالانکہ آزاد کے یہ معنی ہیں کہ بداخلاقیوں سے الگ تھلگ رہے۔ حق کا حامی باطل کا دشمن ہو۔ میں نے ایک رباعی کہی ہے۔ جو مناسب موقع سمجھ کر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ (رباعی) دل میں تھا اثر ہدایت ہادی کا + غم قتل کا تھا نہ خانہ بربادی کا + نکلا دوزخ سے سیدھا جنّت میں گیا + کیا لطف اُٹھایا حرؔ نے آزادی کا + خدا ہر شخص کو حضرت حرؔ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے + ۱۲ ثابت رضوی۔

نہ ضعیفی۔ نہ نقاہت۔ نہ انقلابات زمانہ کوئی شے خشک نہیں کر سکتی۔ (اس آگ کو موت ہی ٹھنڈا کرتی ہے۔ بس) بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ طبیعت کی آمد کے ساتھ میدان واقعات وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ طبع کی روانی بند ہی نہیں ہوتی۔ قیود نظم اور کمی واقعات سے زور بڑھتا ہی جاتا ہے*

بحور مستعملہ دبیر اعلیٰ اللہ مقامہ اکثریت

جناب مرزا صاحب کی طبع نے اکثر حسب ذیل بحروں میں غوّاصی کی ہے:-

۱- بحر ہزج۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن۔ اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے*

۲- بحر مضارع۔ مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن۔ یارب مجھے مرقعِ خُلدِ بریں دکھا*

۳- بحر رمل۔ فاعلاتن فِعلاتن فِعلاتن فعلن۔ جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر*

۴- بحر مجتث۔ مفاعلن۔ فعلاتن مفاعلن فعلن۔ رواں نہر لبن کو جو شیر خوار ہوا*

ایسے ہی بحروں میں مرثیے زیادہ* رنگ دیتے ہیں۔ جب ہم ایک مختصر سی نظم ایک بحر میں کہتے ہیں۔ تو دوسری نظم کے لئے اُس بحر میں مضامین درکنار الفاظ بھی نہیں ملتے۔ اور یہاں سیکڑوں مرثیے موجود ہیں۔ اللہ اللہ*

اثر شہادت امام حسینؑ و اصحاب امام ممدوح

حضرت امام حسینؑ اور اُن کے ہمراہیوں سے وہ سبق حاصل ہوتے ہیں۔ کہ جو دین و دُنیا میں صراط مستقیم دکھاتے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (جن کا مزار شریف اجمیر میں ہے) کیا خوب فرماتے ہیں ؎

* خصوصاً تحت لفظ مرثیہ پڑھنے میں یہ بحریں زیادہ سامعین پر اثر ڈالتی ہیں۔ اور سوز میں بھی اور بحروں سے ان کا اثر کچھ کم نہیں ہے۔ مگر سوز میں بعض اور بحریں بھی زیادہ مؤثر ہیں۔ جن میں اکثر افسردہ و گداز کے مرثیے پوربی و پنجابی زبان میں ہیں۔ ورمرثیت کے لحاظ سے وہ مرثیے دبیر و انیس سے بہتر ہیں* ۱۲ ثابت حقیر۔

شاہ است حسینؑ و بادشاہ است حسینؑ — دین است حسینؑ و دین پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دستِ یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

جو کچھ صبر و استقلال و شجاعت و ہمدردی و وفاداری و غیرت و حمیت و عزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمامؑ اور اُن کے عزیزوں اور دوستوں سے معرکۂ کربلا میں ظاہر ہوئے۔ وہ مافوق طاقت بشری اور خوارق عادت سے نہیں تھے۔[1] امامؑ نے امامت سے (جو بیشک مافوق طاقت بشری اور خوارق عادت سے ہے) کام نہیں لیا۔ اور پھر امامؑ تو ایک ہی تھے! امامؑ کے عزیز و اصحاب گو اعلیٰ درجے کے ظاہری و باطنی فضائل سے آراستہ و پیراستہ تھے لیکن معصوم تو نہ تھے یہ تمام سبق ہماری ہدایت کیلئے ہیں اور بہترین نمونے پیروی کے ہیں[2]۔ حضرت امام حسین علیہ السلام مذہب حقہ کیلئے لڑتے تھے۔ اور لڑائی بھی ایسی حالت میں جس میں شکست اور اپنی اور اپنے تمام اعزا کی شہادت اور گھر بار کا تاراج ہونا یقینی تھا +

مرزا صاحب کے آفتاب نظم سے روشن ترین شعاعیں اُس وقت نکلتی ہیں۔ اور مرزا کی طبیعت کا بحر ذخار اُس وقت جوش پر آتا ہے۔ اور جوار بھاٹہ کی انتہا کا پتہ اُس وقت ملتا ہے۔ جب وہ مدح اہل بیتؑ فرماتے ہیں۔ اس مرثیہ (ع قرآن مبین سورۂ یک آیہ ہے کس کا) میں فرماتے ہیں (شان جناب امیر علیہ السلام میں):-

یہ قبلۂ دیں۔ حور و ملک جبّۂ تسلیم — یہ صدر نشیں ہفت فلک یک قد تعظیم
یہ فرق مبیں شوکت حق افسر و دیہیم — یہ جسم یقیں۔ علم خدا جامۂ تکریم

[1] انسانیت وہ چیز ہے۔ کہ اگر اُس کے اعلیٰ درجہ پر آدمی فائز ہو۔ تو فرشتوں سے بہتر ہے۔ پس یہ تمام امام حسینؑ کے ساتھی اعلیٰ درجہ انسانی پر فائز تھے۔ اس لئے اِن سے ایسے کام ظاہر ہوئے جو ایک ادنےٰ درجہ کے انسان کو بظاہر مافوق طاقت بشری معلوم ہوتے ہیں + ۱۲ بے بضاعت مؤلف۔

[2] پس دبیر و انیس اور اور مداحوں کے مرثیوں سے جو خوش اخلاقی کا سبق انسان حاصل کر سکتا ہے۔ شائد دوسری (اردو کی) کسی کتاب اخلاق سے حاصل کر سکے اور انسان کیسی ہی سخت سے سخت مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ ان کربلائیوں کے مصائب بڑھ کر اُس کو اپنی مصیبت ہیچ دپوچ نظر آتی ہے۔ اور اس طرح اپنی مصیبت پر صابر و مستقل ہو جاتا ہے + ثابت۔

وہ کام فوق قوت بشری نہیں تھے

توصیف کمال مرزا دبیر رحمہ

مناقب میں جوش طبیعت

پیمائش پوشاکِ شرف ہاتھ سے کب ہو　　نہ ذرعۂ افلاک جہاں ایک وجب ہو[1]
آتا نہ اگر روئے زمیں پر قدمِ پاک　　جائز نہ کبھی ہوتی تیمم کے لئے خاک
گر ہیچ میں ہوتا نہ سرِ سیّدِ لولاک　　بے پاؤں کبھی گرد زمیں پھرتے نہ افلاک
پرِ ضعف سے ہلتا نہ فرشتوں میں کسی کا　　ہوتا نہ رقم نام پروں پر جو علیؑ کا

اس طرز کے بہت سے بند ہیں۔ یہ امر کہ مدح اہل بیت میں جناب مرزا صاحب کا کلام بہت پُر زور اور جوش سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اُس مرثیہ (سرسبز ہو یا رب سخن اس ہیچداں کا) کے چند بندوں سے بھی پورا پورا (جو جناب امام حسینؑ کی مدح میں اوپر نقل ہو چکے) ثابت ہوتا ہے۔ کلام میں ظرافت

فصل ۲ ظرافت

نہیں ہے۔ بیشک مرثیہ میں ظرافت کا موقع نہیں ہے۔ لیکن تاہم گوشے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی پہلوان مقابلہ پر آتا ہے۔ اور اُس کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ اُس وقت ظرافت کے پہلو نکل سکتے ہیں[2]+

[1] یہ بند مرزا صاحب کے دقیق کلام میں سے ہے۔ چاروں مصرع ذو قافتین ہیں۔ ایک قافیہ دین نشین مبین یقین کا ہے۔ دوسرا تسلیم و تعظیم و دیہیم و تکریم کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جناب امیرؑ قبلۂ دین ہیں اور حور و ملک بمنزلہ پیشانی تسلیم ہیں۔ پیشانی تسلیم کا قبلہ کی طرف سجدہ میں جھکنا لازمی و قدرتی ہے۔ جناب ممدوحؑ صدر نشین ہیں۔ ساتوں فلک گویا قد تعظیم ہیں۔ صدر نشین کی تعظیم وہ قد ضرور کرینگے جو تعظیم کیلئے بنے ہیں۔ یہ جناب سرِ روشن ہیں شوکتِ خدا بمنزلہ افسر و دیہیم ہیں اور یقین کے جسم ہیں۔ اُن پر خدا کا علم گویا جامۂ تکریم ہے۔ ان کے شرف کی پوشاک کی پیمائش کیونکر ہو سکے۔ کہ آسمانوں کے لو گز ان کی شرف کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک بالشت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ فضائل علیؑ بیشمار ہیں + ثابت

[2] ظرافت آمیز کلام مرزا مرحوم کا الگ ہے۔ اور اسی طرح ہجو بھی مرزا مرحوم نے فرمائی۔ مگر کسکی حرف قاتلان اہلبیتؑ کی۔ نانا مرحوم (میر محمد رضا ظہیر) کے کتب خانہ میں کچھ ورق میری نظر سے اب سے ۳۲ برس پہلے گذرے تھے جن میں ظرافت کے رنگ کے ساتھ مرثیں بھی غضب کی تھیں۔ مگر پھر وہ طباق کا طباق مرزا صاحب سے اُن کے شاگرد رشید شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم نے اس طرح لیلیا۔ جیسے کسی کے مُنہ سے کوئی بات چھین لے۔ پہلوان کے سراپا میں ظرافت کا پہلو ہونا۔ یہ رائے ذرا غور طلب ہے۔ کیونکہ ایک مجلس میں ایک صاحب کے ایک مصرع پڑھنے پر (میرے سامنے) تمام مجلس ہنس پڑی تھی۔ اُس کا خیال سامعین کے دل سے آخر مجلس تک نہ گیا۔ انجام یہ ہوا کہ رقت نہ ہوئی۔ اور ذِل مجلس عزا بکا و ابکا سمجھا جاتا ہے۔ وہ مصرع یہ ہے۔ "آیا تھا بھیک کتا یہ بکتا ہوا بھاگا" اُن ذاکر صاحب نے اسکو بہت بنایا تھا۔ پہلے وہ ممبر پر جھکے پھر جھکے پیچھے ہٹے دبکے۔ لوگ ہنس پڑے۔ ممکن ہے زیادہ تر بنانا سبب ہو۔ یہ حکایت میں دوسرے مقام پر بھی لکھ آیا ہوں۔ یہاں لکھنے سے قند مکرر کا مزہ آئیگا + ۱۲ مولف حقیر

مرثیہ و تسلسل

تمام مرثیہ از مطلع تا مقطع دست و گریباں ہو۔ یہ بات اُن مرثیوں میں جو مَیں نے دیکھے ہیں نہیں پائی گئی[۱]۔

مصرع سے مصرع۔ بند سے بند۔ بات سے بات مرثیہ میں از ابتدا تا انتہا پیدا ہوتی چلی جائے۔ اِس امر کا لحاظ اُن مرثیوں میں نہیں پایا گیا[۲]۔

سلاست یعنی سلیس اور عام فہم الفاظ سے عالی و نازک خیالات ادا کرنا۔ اسکی بھی کمی پائی گئی[۳]۔

---

[۱] و [۲] و [۳] یہ بات کہ مرثیہ میں ایشیائی قصوں یا مثنوی کی طرح سلسلہ ہو۔ بحث طلب ہے۔ مَیں اسی کتاب میں ایک دُوسرے موقع پر عرض کر چکا ہُوں۔ کہ عربی۔ فارسی۔ اردو کے عام اساتذہ کے مرثیوں میں ایسا تسلسل نہیں ہے۔ بلکہ کسی میں غزل کی شان ہے کسی میں قصیدہ کی آن بان ہے۔ مثال کے طور پر ایک عرب دُوسرے عجم تیسرے اُردو کے سب سے اعلےٰ شاعر کا مرثیہ لے لیجے۔ عربوں میں دعبل خزاعی کا وہ مقبول و مشہور مرثیہ پڑھئے۔ جو دعبل نے امام رضا علیہ السلام کی مجلس و حضوری میں پڑھا جس کے چند شعر اوّل کے ملاحظہ ہوں۔ یہ مرثیہ دعبل بہت مقبول و مشہور ہے۔ بحار الانوار کی دسویں جلد میں بھی یہ مرثیہ ہے مگر میرے پاس وہ اصل کتاب مستطاب موجود نہیں ہے۔ اُس کا ترجمہ اردو مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ ہے۔ اُس کے صفحہ ۳۰۴ سے یہ مرثیہ لکھتا ہُوں:۔

شانِ مرثیہ عربی از دعبل

مرثیۂ دعبل

(۱) اَفَاطِمُ لَوْخِلْتِ الْحُسَیْنَ مُجَدَّلاً وَقَدْ مَاتَ عَطْشَاناً بِشَطِّ فُرَاتِ

اے (جناب) فاطمہؑ اگر تم دیکھتیں (امام) حسینؑ کو خاک پر پڑا ہُوا جس وقت کہ کنارِ فرات پر پیاسے قتل ہُوئے تھے۔

(۲) اِذاً لَلَطَمْتِ الْخَدَّ فَاطِمُ عِنْدَہٗ وَاَجْرَیْتِ دَمْعَ الْعَیْنِ فِی الْوَجَنَاتِ

اُس وقت تم اپنا سینہ پیٹتیں اور آنسو چشم ہائے مبارک کے رخسارِ اقدس پر بہاتیں۔

(۳) اَفَاطِمُ قُوْمِیْ یَا ابْنَۃَ الْخَیْرِ وَانْدُبِیْ نُجُوْمُ سَمٰوٰاتٍ بِاَرْضِ فَلَاۃٍ

اے فاطمہؑ! اے خیر البشرؐ کی بیٹی!!! اُٹھو اور نوحہ کرو۔ کہ آسمان کے تارے جنگل کی خاک پر پڑے ہُوئے ہیں۔

یہ تین شعر ہُوئے۔ اور یہ تینوں اشعار کسی قدر مسلسل ہیں۔ کہ شاعر نے اوّل امام حسینؑ کے (بعد قتل) بے گور و کفن زمین پر

فسانۂ عجائب سے مرثیہ گویوں کے تخلص

جب مرزا دبیرؒ نے مرثیہ کے میدان میں قدم رکھا اُسوقت حسب ذیل مرثیہ گو تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور فسانۂ عجائب میں لکھتے ہیں:۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۳) پڑے رہنے کو بیان کیا۔ پھر اُن کے عزیزوں اور رفیقوں کا اُسی طرح بے گور و کفن جنگل میں پڑا ہونا (اشارۃً) بیان فرمایا۔ اب چوتھا شعر سُنئے:۔

قُبُوْرٌ بِکُوْفَانِ وَاُخْرٰی بِطِیْبَۃٍ　　وَاُخْرٰی بِفَخٍّ نَالَہَا صَلَوَاتِ

اہلبیتؑ کی قبریں متفرق ہیں۔ کچھ کوفے میں ہیں۔ کچھ مدینہ منوّرہ میں بعض مقام فخ میں ہیں۔ اُن پر درود نازل ہو۔

اب اس شعر میں دعبل نے وہ سلسلہ شہدائے کربلا کا قائم نہیں رکھا۔ بلکہ یہ فرمایا۔ کہ اہلبیتؑ ایسے پریشان ہوئے۔ کہ اُن کی قبریں بھی ایک جگہ نہ ہوئیں۔ بعض کوفے میں مدفون ہیں۔ کوفہ میں جناب امیرؑ اور مسلمؑ ابن عقیلؑ اور اُن کے دو فرزندوں کی قبروں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اور مدینہ منوّرہ میں جناب رسالتمآب صلعم کی لختِ جگر جناب سیّدہؑ و جناب امام حسنؑ و امام زین العابدینؑ و امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ مدفون ہیں۔ اُن کی قبور مقدسہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور مقام فخ میں حسینؑ بن علیؑ بن حسنؑ کی قبر ہے +

ناظرین! دیکھئے وہ تسلسل کہاں قائم رہا۔ کربلا کے شہدا کا ذکر کرتے کرتے دعبل رحمہ اللہ کوفہ۔ مدینہ منوّرہ و مقام فخ کی قبروں کا بیان فرمانے لگے۔ زیادہ اشعار اس مرثیہ کے طول کے خیال سے مَیں نہیں لکھتا +

شان مرثیہ فارسی محتشم

اچھّا اب مَیں ملا محتشم کاشی رحؒ کے چہاردہ بند مقبول میں سے دو بند لکھتا ہوں۔ یہ بات کہ ملا محتشم تمام ایرانیوں میں بے مثل مرثیہ گو ہیں۔ بچّہ بچّہ جانتا ہے۔ جس پایہ کے عربوں میں دعبلؒ ہیں۔ اُسی مرتبہ کے محتشم عجموں میں ہیں۔ اور یہ چودہ ۱۴ بند ایسے لاجواب ہیں۔ جن کی نسبت مشہور ہے۔ کہ آج تک کسی سے اس نظم کا جواب نہ ہوسکا۔ ملا محتشم کا کلیات (جس میں سے یہ دو بند لکھتا ہوں) مجھے مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی سلمہ اللہ و البقاہ سے ملا۔ جو صاحب نجوم السّماء کے فرزند ارجمند اور ایک کامل ادیب و شاعر باخبر ہیں۔ اُن کی مَیں اس عنایت و محبّت کا شکریہ ادا کرتا ہوں:۔

کشتی شکستہ خوردۂ طوفانِ کربلا　　در خاک و خوں طپیدۂ میدانِ کربلا
گر چشم روزگار برو زار میگریست　　خوں میگذشت از سر ایوانِ کربلا
نگرفت دست دہر گلابے بغیر اشک　　زاں گل کہ شد شگفتہ بہ بستانِ کربلا

"مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک ضمیر خلیق فصیح۔ مرد مسکین
بصورت گدا۔ بطالع سکندر مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا ناظم خوب دبیر مرغوب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۳) اُوپر کے تینوں شعروں پر غور کرنے سے پایا جاتا ہے۔ کہ شاعر بعد شہادت کے واقعہ کو لکھ رہے ہیں۔ اچھا اب چوتھا شعر سُنئے۔ جس میں شہادت کے ماقبل واقعہ کو لکھا ہے:۔

(۴) در آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں   خوش داشتند حرمت مہمانِ کربلا

اب اِس شعر میں کوفیوں کی بیوفائی کا بیان فرمادیا۔ کہ جنہوں نے مہمان کربلا کو پانی بھی نہ دیا۔ پھر فرماتے ہیں:۔

(۵) بودند دیو و دد ہمہ سیراب و می مکید   خاتم۔ زقحط آب سلیمان کربلا

یہ شعر ضرور شعر ۴ سے دست وگریباں ہے۔ اور نیچے کا شعر گو اس سے متعلق ہے۔ مگر واقعہ مابعد شہادت کا منظوم فرمایا ہے:۔

(۶) زاں تشنگان ہنوز بعیّوق می رسد   فریاد العطش ز بیابان کربلا

(۷) آہ از دمیکہ لشکر اعدا نہ کرد شرم   کردند رو بہ خیمۂ سُلطان کربلا

اب پھر اس ساتویں شعر میں خیام اہلبیتؑ کے غارت ہونیکا بیان فرمادیا۔ اسی طرح بیت میں جو حسب ذیل ہے:۔

آں دم فلک بر آتش غیرت سپند شد   کز خوف خصم در حرم افغاں بلند شد

یہ دُوسرے نمبر کا بند تھا۔ اب ایک بند بارھویں نمبر کا بھی لکھے دیتا ہوں:۔

(۱) اے چرخ غافلی کہ چہ بیداد کردۂ   وز کیں چہا دریں ستم آباد کردۂ

(۲) بر طعنت ایں بس ست کہ با عترت رسولؐ   بیداد کردہ خصم و تو امداد کردۂ

یہاں تک آسمان کا شکوہ ظلم و بیداد تھا۔ اب مصنّف علام یکایک عبید اللہ بن زیاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں:۔

(۳) اے زادۂ زیاد نکردست ہیچ گہ   نمرود ایں عمل کہ تو شدّاد کردۂ

(۴) کام یزید دادۂ از کُشتن حسینؑ   بنگر۔ کرا بقتل کہ۔ دل شاد کردۂ

(۵) بہر خسے کہ بار درخت شقاوت ست   در باغ دیں چہ باگل و شمشاد کردۂ

(۶) با دشمنان دیں نتواں کرد آنچہ تو   با مصطفٰےؐ و حیدرؑ و اولاد کردۂ

بارِ احسان اہلِ دوِل کا نہ اُٹھایا"۔ ایسے بڑے بڑے صاحب کمال تھے۔ مگر دبیرؔ نے ثابت کر دکھایا۔ کہ اُن کے لئے گنجائش ہی نہ تھی۔ بلکہ خاص جگہ خالی تھی۔ یا یُوں کہو۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۳)

بیداد

(۷) حلقے کہ سودہ لعلِ لب خود نبیؐ بر آں
آزردہ اش بہ خنجرِ فولاد کردہ

ترسم ترا دمیکہ بہ محشر در آورند
از آتشِ تو دود بہ محشر بر آورند

یہ تو عرب و عجم کے اعلیٰ سے اعلےٰ درجہ کے مرثیہ گویوں کی نظمیں حقیر نے پیش کیں۔ اب ہندوستان میں آیئے۔ اردو کے شاعروں میں میرؔ و سوداؔ لاجواب مانے جاتے ہیں۔ یہ مصرع جناب شیخ ناسخ کا مثل کی طرح زبانوں پر ہے ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں۔ اور سوداؔ کی اُستادی کے لئے یہ لکھ دینا کافی ہے۔ کہ میرؔ ایسے عالی دماغ شاعر نے اُنہیں کو پُورا شاعر مانا۔ اور شعرائے مابعد بھی اُن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جناب ناسخ مرحوم فرماتے ہیں:-

کب ہماری طبع سے ہوتا ہے سوداؔ کا جواب
ہاں تتبّع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

اور جناب مرزا دبیرؔ مرحوم فرماتے ہیں۔ ع سوداؔ کے مرثئے کا تو ممکن نہیں جواب۔ اب ان میرؔ و سوداؔ کے مرثیوں کو دیکھئے۔ کہ یہ کس قدر تسلسل کا مرثئے میں خیال رکھتے ہیں +

حضرت میرؔ رح کا تو صرف ایک مربّع مرثیہ آج ملتا ہے۔ وہ بھی جناب سوداؔ کی بدولت۔ کہ اُنہوں نے اعتراضات کر کے اُس کو لکھا ہے۔ اور وہ کلیاتِ سوداؔ میں صفحہ ۴۸۸ پر (دیوان مرثیہ میں) چھپا ہے۔ اور وہ مرثیہ مربّع یہ ہے:-

شانِ مرثیۂ (میرؔ)

(۱) دلوں پر محبّوں کے حالت عجب ہے
مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے
حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے

(۲) محبّوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے
ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے
کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے

(۳) کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا
وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا
قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جو اب ہے

(۴) ہے چاروں طرف ہو رہا شور محشر
زمیں آسماں ہو رہا ہے تل اوپر

مرزا صاحب فرشتہ صفات تھے

کہ مرزا صاحب نے جگہ پیدا کر لی +

(بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ۴۸۳)

حسینِ علیؑ پر چلایا ہے خنجر ہر اک جان اِس غم سے خنجر طلب ہے

اُوپر کے دو بندوں میں تو شہادت کی رات کا ذکر فرما رہے تھے۔ یکایک روز عاشور بعد عصر شہادت کا حال تیسرے اور چوتھے بند میں نظم کر گئے۔ اب فرمائیے۔ وہ سلسلہ بندی مثنوی کی ایسی کہاں ہے +

مرثیہ سودا

اب خود حضرت سودا کے مرثئے کو لیجئے۔ اور مرثیہ بھی وہ مرثیہ جو چوٹی کا ہے۔ سنو میں بھی پڑھا جاتا ہے اور بہت مقبول و مشہور ہے۔ یہ مرثیہ مطبوعہ کلیات سودا میں صفحہ ۵۷۵ پر درج ہے:-

یارو سنو تو خالق اکبر کے واسطے انصاف سے جواب دو حیدرؑ کے واسطے
وہ بوسہ گہ نبی تھے پیمبرؐ کے واسطے یا ظالموں کی بُرّش خنجر کے واسطے

چار بند انہیں اسلحہ (تیر۔ تلوار۔ نیزہ۔ تبر۔ کارد) کی نسبت لکھ کر فرماتے ہیں:-

دیکھا جہاں میں کافر و دیندار کا بھی بیر ان کی سی پر قساوت قلبی نکی ہیں سیر*
پینے دیں آب انس سے لے تا بوحش و طیر مانع ہوں ابن ساقی کوثر کے واسطے

بند مذکورہ میں اس بات کو بیان فرمایا تھا کہ اہلبیت اطہار کو کلمہ گویوں نے پانی بھی نہ پینے دیا۔ اب ذیل کے بند میں مصنف علّام ایک دُوسرے واقعہ جاں سوز آتش زنی خیام کو بیان فرماتے ہیں:-

امّت ہو وہ کہ خانہ دیں کی ہو پاسباں یا لُوٹ لیوے اپنے پیمبرؐ کا خانماں
آتش برائے پخت و پز آئی تھی درجہاں یا دینے کو وہ فاطمہؑ کے گھر کے واسطے

اب پھر مصنّف مرحوم تمام شہدائے کربلا کی شہادت ذیل کے دو بندوں میں لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ پہلے لکھا ہے۔ اور واقعہ اول الذکر (آتش زنی خیام) مابعد کا واقعہ ہے:-

راوی لکھے ہے خرد و کلاں رن میں جب مُوا نیزے سے اور تیر سے سب کا لہو چُوا
ششماہہ طفل اصغرؑ معصوم تک ہُوا طعمہ عُقاب تیر ستمگر کے واسطے

* دُوسرے مصرع میں "ہیں" "میں نے" کی جگہ پر آیا ہے۔ اُس زمانے میں ایسی حذف "نے" کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ اکثر یوں ہیں (حذف نے) بولتے بھی تھے۔ اب ممنوع ہے +

تقویٰ و پرہیزگاری۔ جود و سخا۔ ایثار و ہمدردی وغیرہ کا اُن پر خاتمہ تھا۔ ایسے پاکیزہ نفس کی سوانح عمری لکھنا ایک واجب کفائی تھا۔ جس کو بحمد اللہ آپ نے ادا کیا۔ اور نہایت محنت سے ٭

(بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ۴۸۳)

تنہا پھر اُس زمیں پہ رہا شاہِ کربلا — اُس کا بھی تیغ ظلم سے آخر کٹا گلا
بعد اِس ستم کے خیمہ ہوا موردِ بلا — غارت گروں کے ہاتھ سے زینبؑ کے واسطے

اب پھر تاراجیٔ خیامِ اہلبیتؑ کا حال بیان فرماتے ہیں۔ مگر اِس بند میں کمال کیا ہے۔ واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے:۔

خیموں میں جب دھنسے وہ لعیں چھاتیاں تنے — بیٹی چھپی تھی ماں کنے۔ ماں بیٹی کے کنے
کیا ہووے اُن غریبوں پہ جن پر یہ آ بنے — جز۔ یہ کہ دیں خدا و پیمبرؐ کے واسطے

المختصر عرب عجم اردو کے جتنے شاعر کامل مرزا صاحب کے قبل گذرے ہیں۔ اُن میں سے مرثیہ میں تسلسل کا ہونا کسی ایک نے بھی لازم نہیں سمجھا۔ بنی نوع انسان کی طبیعتوں کا مذاق بھی مختلف ہے۔ کوئی تو مسلسل واقعات وحکایات سُننے کو پسند کرتا ہے۔ کسی کو ایک حال مسلسل وار سُننا اجیرن ہو جاتا ہے ٭

مرثیہ میں مثنوی و قصہ کا ایسا تسلسل لازمی نہیں

بہرحال مرزا صاحب کے مرثیوں میں بھی مثنوی اور ایشیائی قصّوں کی ایسی سلسلہ بندی عام طور پر نہیں ہے۔ بلکہ اکثر قصائد کی شان غالب ہے۔ اور جب وہ ایک واقعہ بیان کرتے کرتے دوسری بات چھیڑ دیتے ہیں۔ تو تشبیب و گریز کا لطف آتا ہے۔ اور نہایت خوبی سے ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ سے پیوند لگاتے ہیں۔ مگر اب مشکل یہ آپڑی ہے۔ کہ اُن کی اصلی ترتیب بھی موجودہ مطبوعہ مرثیوں میں قائم نہیں رہی ہے۔ لنساخ کے جواب میں مرزا محمد رضا معجز مرحوم نے اپنی کتاب لاجواب (تطہیر الاوساخ) میں کیا اچھی بات فرمائی ہے۔ کہ اکثر مرثیہ پڑھنے والے ایک مرثیہ کے بند دوسرے میں شامل کر لیتے تھے۔ اکثر بند اختصار کی ضرورت سے کم کر دیتے تھے۔ انہیں لوگوں کے بستوں کے مرثئے چھپنے کو پہنچے اور چھپے۔ خصوصاً اُن مرثیوں میں (علاوہ زیادہ غلط ہونیکے) یہ عیب زیادہ دیکھا گیا۔ جو مطبع منشی نول کشور آنجہانی میں چھپے ہیں۔ اور مرزا صاحب پر کچھ منحصر نہیں۔ یہ بے ربطی جناب میر انیس مرحوم کے مطبوعہ مرثیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حالانکہ زمانہ جانتا ہے۔ کہ میر صاحب مغفور تسلسل کا بہت

اس مضمون کو پڑھ کر کوئی صاحب شاید یہ فرمائیں یا دل میں خیال کریں۔ کہ موازنہ دبیرؒ و انیسؒ نہ کیا۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ اس مضمون کا یہ مقصد نہ تھا۔ کہ موازنہ کیا جائے۔ لیکن مجھ کو حضرت انیس مرحوم سے بھی اس قدر عقیدت ہے۔ کہ میں یہ کہے بغیر اس مضمون کو ختم نہیں کرسکتا۔ کہ میری رائے میں جتنے قلم کے بہترین مصورؔ روئے زمین پر گذرے ہیں

حضرت انیسؒ کے کمال کا اعتراف

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۸۳) خیال فرماتے ہیں۔ اور یہ بات اُن کے مشہور کمالات میں سے قابل مدح ہے۔

مگر کاتبوں سے سب مجبور ہیں۔ ہمارے مخدوم ومکرم جناب مسٹر نواب حامد علی خاں صاحب نے یہ خط مجھے مقام ڈومس (نزد سورت) سے لکھ کر ارسال فرمایا تھا۔ ڈومس میں جناب ممدوح اپنے علاج وتبدیل آب وہوا کی غرض سے مقیم تھے۔ وہیں چند کتابیں ساتھ لے گئے تھے۔ اُن میں ہی مطبع نولکشوری آں جہانی کی مطبوعہ ایک یا دو جلد (مراثی دبیرؒ) بھی تھی۔ اُن مرثیوں کی نسبت یہ کہنا (کہ از مطلع تا مقطع دست وگریباں نہیں ہیں) بالکل صحیح ہے۔ دفتر ماتم کی جلدوں میں اس قدر بے ربطی نہیں ہے۔ مگر (بقول مجتہد مرحوم) ذاکروں کے تصرف سے اُس کے مطبوعہ مرثئے بھی بہت کم بچے ہیں۔ پھر بھی بعض مرثئے مطلع سے مقطع تک دست وگریباں ہیں۔ اور مصرع سے مصرع اور بند سے بند چسپاں ہے۔

سلاست عام فہم الفاظ

اور بات میں سے بات نکلتی چلی گئی ہے۔ اب رہی یہ بحث کہ سلاست کم ہے۔ اور عموماً عام فہم الفاظ نہیں ہیں۔ یہ بات بھی ذرا غور طلب ہے۔ اور مولوی شبلی صاحب کے جوابات میں میں اس کو مفصل لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف اتنا کہونگا۔ کہ مرزا صاحب نے جس زمانہ (قبل غدر ۱۸۵۷ء) میں وہ اکثر مرثئے کہے ہیں۔ اُسی زمانہ میں لکھنؤ میں عربی۔ فارسی کے الفاظ بہت بولے جاتے تھے۔ اور جب عام طور پر بولے جاتے تھے۔ تو وہ عام فہم بھی تھے۔ آج نہیں بولے جاتے۔ تو عام فہم بھی نہ رہے۔ پس سچ یہ ہے۔ کہ وہ الفاظ آج تو واقعی عام فہم نہیں ہیں۔ مگر اُس زمانے میں لکھنؤ میں عام فہم وسلیس تھے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے۔ کہ بلاغت کے لئے کلام کا مقتضائے حال کے موافق ہونا ضروری ہے۔ پس جس جس موقع پر مرزا صاحب امام حسینؑ یا اُن کے اہلبیتؑ یا اصحاب کی زبانی کوئی کلام لکھتے ہیں۔ وہاں وہی الفاظ لاتے ہیں۔ جو اہل علم کی زبانوں پر جاری ہیں۔ اور یہی شان بلاغت کی ہے۔ اُس موقع پر اگر عام لوگوں کے عام فہم الفاظ بولیں۔ تو وہ نظم پایۂ بلاغت سے گر جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ کچھ کلام مرزا مرحوم ضرور دقیق ہے + ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

مثل ہومر - ورجل - ڈینٹی - فردوسی - کالی داس - شکسپیر - حضرت انیسؒ ایسے
پہلو بہ پہلو کرسی نظم پر جلوہ افروز ہیں +

خاکسار دارین

حامد علی

از سمر لاج ڈوس - نزد سورت - ۲۰ ر اپریل ۱۹۱۲ء

باب شانزدہم - آفتاب میں بڑے بڑے داغ

اِس زمانے کی تحقیقات میں آفتاب میں بڑے بڑے داغ دُور بینوں سے نظر آتے ہیں - اور حال کے نجومیوں نے مان لیا ہے - کہ آفتاب میں دھبے ہیں - مولوی شبلی صاحب کو شمس العلماء کا روشن خطاب ملا - اس سبب سے وہ آفتاب ہوئے - تو اُن میں بھی داغوں کا ہونا لازمی ہو گیا - پس پس جو جو داغ اُن میں یعنی اُن کی کتاب موازنہ انیس و دبیر میں نظر آتے ہیں - مَیں نے اُن کو سات قسم پر منقسم کیا ہے - نمبروار الگ الگ ہر قسم کو بیان کرونگا :-

(۱) ناواقفی یا نافہمی کا داغ

ناظرین! مجھ کو یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے - کہ دُوسری قوموں کا یہ حال و کمال ہے - کہ جب وہ ہمارے حالات و خیالات کو بیان کرتے ہیں - تو اکثر جزئیات تک نہایت صحیح بیان فرماتے ہیں - مَیں اگر اس موقع پر علماء و حکمائے یورپ کا (مثلاً) بیان کروں - تو شاید آپ یہ فرمائینگے - کہ ابھی یورپ کے علم و فضل کا مقابلہ ہندوستان نہیں کر سکتا - لہٰذا مَیں ایک شریف عالم بنگالی کا نام لیتا ہوں - وہ کون؟ مسٹر (بابو) شیاما چرن سرکار دیکھئے؟ شرع محمدی کے کیسے کیسے باریک و مشکل مسائل پر

نوٹ لکھ کر پانی کر دیا ہے۔ کیسے کیسے ہمارے عقائد و رواج بیان فرماتے ہیں۔ خدا کی شان نظر آتی ہے۔ ہندو صاحبوں میں ایسے ایسے اہلِ علم بہت سے ہیں۔ مَیں نے تمثیلاً صرف ایک صاحب کا نام لیا ہے + اب ہمارے مولوی شبلی صاحب کی معلومات کو ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) جن کے بزرگ نہ معلوم کے سنو برس سے نسلاً بعد نسلٍ مسلمان چلے آتے ہیں۔ (۲) اور ایک بڑے دار العلم (ندوۃ العلما) کے ممبر ہیں۔ (۳) برسوں سے لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں۔ (۴) تمام رُوم و شام و حجاز وغیرہ (گویا) دیکھے ہوئے ہے۔ (۵) بڑی بڑی مشہور کتابوں کے مصنّف و مؤلّف۔ بااین ہمہ اُن کی معلومات کی یہ کیفیت ہے۔ کہ

میر انیسؒ وا ایطا

(۱) موازنہ کے صفحہ ۲۲۷ میں (میر انیسؔ مرحوم پر اعتراضوں کی بوچھار کرتے ہُوئے) فرماتے ہیں۔ کہ "اکثر جگہ (میر صاحب کے کلام میں) شائگاں قافئے ہیں۔ چنانچہ نسّاخ نے بہت سے اِس قسم کے شعر نقل کئے ہیں۔ مجیب {مرزا محمد رضا صاحب معجز مرحوم جنہوں نے تمام اعتراضات (متعلقہ دبیر و انیس) کے نسّاخ کو معقول جواب دئے ہیں} نے ان تمام شعروں سے انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے۔ کہ وہ یُوں نہیں۔ یُوں ہیں۔ مثلاً اِس بند میں

شہ مرداں

ناگاہ بڑھی فوج ہُوا جنگ کا ساماں ۔۔۔ اور گھٹنے لگی طاقتِ جسمِ شہِ مرداں
شہزادے پہ جب پڑنے لگا تیروں کا باراں ۔۔۔ تلوار علم کر کے کھایا شہ مرداں

شہ مرداں مکرر آیا ہے۔ مجیب صاحب کہتے ہیں۔ کہ دُوسرے مصرع میں شہ مرداں کی بجائے شہ ذی شاں تھا۔ غلط نویسوں نے "ذیشاں" کا "شہ مرداں" بنا دیا لیکن اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ اور اگر اس کو وسعت دی جائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو۔ نہایت آسانی سے دعوٰے کیا جا سکتا ہے۔ کہ یُوں نہیں یُوں تھا۔ اِس شعر میں تو سرے سے اعتراض ہی غلط ہے۔ کیونکہ

شہ مرداں کوئی شیعہ یا صوفی امام حسینؑ کو نہیں کہتا

شہ مرداں سے ایک جگہ امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں۔ اس لئے قافیہ مکرر نہیں"۔ یہاں میں نے مولوی صاحب کا ارشاد انہیں کے الفاظ میں لکھ دیا۔ ہر چند ذرا طول ہوا۔ اب میں ادب سے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ کہ (غدر ہو جانے کے بعد جو آج کل ایران میں ہو رہا ہے) ایران کے ایک سرے سے چلئے۔ بلوچستان و پنجاب ہوتے ہوئے تمام ممالک متحدہ و متوسط و بنگال و بمبئی و راجپوتانہ و مدراس وغیرہ کی سیر فرمائیے۔ شیعوں اور صوفیوں کے بچے بچے سے پوچھئے۔ اگر ایک بچہ بھی کہدے۔ کہ شہ مرداں امام حسینؑ کو کہتے ہیں۔ تو میں مان لونگا۔ کہ آپنے درست فرمایا۔ افسوس ہزار افسوس ایسے مشہور لفظ کی تحقیق میں ایسی ٹھوکر کھائی۔ جناب امیرؑ۔ شاہ مرداںؑ۔ شیر خداؑ۔ شاہ نجفؑ۔ یہ تو ایسے مشہور القاب ہیں۔ کہ بجز امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کے کسی دوسرے امام یا بزرگ کو کہتے ہی نہیں۔ کسی ایرانی کا مشہور شعر ہے۔ ؎

شاہِ مرداںؑ۔ شیرِ یزداںؑ۔ قوتِ پروردگار   لافتیٰ اِلّا علیؑ لاسیف اِلّا ذوالفقار

ناظرین! جو بزرگوار شاہ مرداں کے مفہوم کو نہ سمجھیں۔ وہ زبان اُردو بھلا کیا جانیں۔ اور دبیرؒ و انیسؒ کے کلام میں کیونکر انصاف فرما سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی افسوس ہے۔ کہ ایسے کامل میر انیسؒ مرحوم کی شان میں اسی موازنہ میں صفحہ ۲۲۸ پر بحث ایطا میں فرماتے ہیں۔ کہ "جہاں واقعی قافیہ شائگاں ہے۔ وہاں بھی تاویل کی ضرورت نہیں۔ جو اساتذہ کثیر الکلام ہیں۔ اور جن کو سیکڑوں قسم کے مضامین ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ اس قسم کی قیدوں کی پابندی نہیں کرتے"۔ اس عبارت اور نیز عبارت مندرجہ بالا کا یہ صاف مفہوم ہے۔ کہ میر صاحب بے دھڑک ایطا قافیہ لاتے ہیں۔

نسبت ایطا بجناب انیس

استغفر اللہ۔ ایطا اور جناب میر انیس مرحوم۔ واللہ اُن کے ادنے شاگردوں کے شاگرد بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتے۔ لاکھ کثیر الکلام شاعر ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں۔ کہ شائگاں

قافیہ بے دھڑک لے آئے۔ حضرت یہ بڑا عیب ہے۔ اور کمال عجز شاعر کا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ روزمرّہ ہے۔ کہ اُس شخص کا قافیہ تنگ ہوگیا۔ یعنی عاجز ہوگیا۔ اور یہ محاورہ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں اسی موقع پر آتا ہے۔ جناب مفتی میر عباس صاحب طاب ثراہ کی مشہور و مطبوع مثنوی خطاب فاصل کا ایک مصرع یاد آگیا (جو مولوی امام بخش صاحب صہبائی کی مثنوی دمغ الباطل کے جواب میں ہے) ع چہ کند قافیہ بر او شدہ تنگ۔ اور یہ کیا فرمایا۔ کہ ایسی تاویلات پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اور جہاں اعتراض ہو۔ آسانی سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ یوں نہیں یوں تھا۔ جب کہ یہ ظاہر ہے۔ کہ مطبعوں

مطبعوں کی غلطیاں

میں عموماً کتابیں غلط چھپتی ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن شریف جو مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اُس میں ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ حالانکہ صحّت کے برابر انتظام والتزام کئے جاتے ہیں۔ تو دبیرؔ و انیسؔ کے یا اور کسی شاعر یا مصنّف کے کلام کا غلط چھپنا کیوں نہیں مانا جائیگا۔ اس کو تاویل نہیں کہہ سکتے۔ یہ حقیقت حال ہے۔ دیکھئے مرزا دبیر مرحوم کے جو چند مرثئے دو جلدوں میں منشی نولکشور صاحب آنجہانی کے مطبع میں چھپے ہیں۔ اور بار بار چھپتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ایک ایسا مرثیہ لے لیجے۔ جو دفتر ماتم میں بھی چھپا ہے۔ اور دونوں کو ملائیے۔ تو (دونوں میں) زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ ہزاروں لفظ بدلے ہوئے ملینگے۔ بیسیوں بندوں کی کمی بیشی پائیگا۔ پھر کیا کوئی بے درد یہ کہدیگا۔ کہ دبیر کے معتقدوں نے دفتر ماتم میں وہ الفاظ بدل دئے۔ وہ بند بڑھا دئے ہیں۔ حالانکہ دفتر ماتم کی جلدوں میں بھی غلطی چھاپہ کی ہے۔ مگر اتنی نہیں ہے +

مراثی دبیر مطبوعہ مطبع اودھ اخبار و دفتر ماتم

بہرحال جب ان دبیر و انیس کے مرثیوں کا غلط چھپنا پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے۔ تو جو لفظ صحیح قلمی مرثیوں میں ہے۔ اور واقف راز بتائیں۔ تو اُس کو ماننا پڑیگا۔ اس موقع پر واقعی میر صاحب نے ایک جگہ شہ ذی شاں اور دوسری جگہ شہ مرداں فرمایا ہے۔ اور مجیب اوّل نے صحیح جواب دیا ہے۔ مولوی شبلی صاحب کا خیال (کہ ایک جگہ شہ مرداں سے

امام حسینؑ مراد ہیں) بے حقیقت و غلط ہے۔ اور یہ غلطی مولوی صاحب موصوف کی پہلی غلطی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس سے پہلے المامون میں جناب امام رضاؑ کو امام ہفتم لکھ چکے ہیں۔ حالانکہ شیعہ و صوفی تو درکنار وہ تمام سُنّی مسلمان بھی جو تھوڑا بہت معلومات کا چسکہ رکھتے ہیں۔ امام رضاؑ کو امام ہشتم جانتے ہیں۔ اور اِن جناب کا لقب امام ضامن و ثامن[1] مشہور ہے۔ یہ فاش غلطی (آخر الذکر) وقت پر مرزا عابد علی بیگ صاحب قزلباش مرحوم نے گرفت فرما کر اپنے ریویو میں درج فرما دی ہے۔ جو میرے پاس مطبوعہ انہیں کا عطیہ خاص موجود ہے +

المامون اور امام رضاؑ کو امام ہفتم لکھنا

(۲) موازنہ کے صفحہ ۳۰ پر بذیل اعتراضات میر انیس مرحوم مولوی شبلی صاحب لکھتے ہیں "ے واللہ اُس سے زور عیاں لاتعدُ ہُوا + قتل اُس کے ہاتھ سے پسر عبد وُدّ ہُوا + عبد وَدّ۔ لاتعدُ کا قافیہ نہیں ہو سکتا" میں کہتا ہوں۔ کیوں نہیں ہو سکتا؟ مولوی شبلی صاحب شاید یہ سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ عبد وُد ہی صحیح ہے۔ واؤ کو پیش ہے۔ اور لاتعدُ میں حرف آخر کے ماقبل (عین) کو زبر ہے۔ یہ خیال مولوی صاحب کا غلط ہے۔ لُغۃً تو وُدّ بالضم اور وَدّ بالفتح دونوں صحیح ہیں۔ وَدّ ایک بُت کا نام ہے۔ جیسا کہ جوہری نے لکھا ہے۔ مگر اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ جب دونوں طرح صحیح ہے۔ تو فصیح کون ہے۔ اس کے واسطے وہ کتاب فیصلہ کریگی۔ جس کو کتاب اللہ کہتے ہیں۔ واضح ہو۔ کہ قرآن شریف کے ۲۹ ویں پارے سورۂ نوح میں قریب نصف یہ آیت موجود ہے۔ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا پس وَدّ کو بالفتح نظم کرنا شاعر کے کمال معلومات کی اور معترض کا اعتراض کرنا کمال ناواقفی کی دلیل[2] ہے۔

اعتراض موازنہ جواب لاتعدُ و وَدّ قافیہ صحیح ہے

سند میں آیۂ قرآن

---

[1] ثامن کے معنی آٹھویں کے ہیں۔ یہ آٹھویں امام ہیں۔ اس لئے امام ضامن و ثامن مشہور ہیں +

[2] میرے کرم فرما یادگار حضرت انیسؒ جناب نفیس مرحوم میر علی محمد صاحب عارف سلمہ اللہ وابقاہ نے اس موقع کو سُنکر فرمایا۔ کہ یہ بیت میر انیس مغفور کی نہیں بلکہ الحاقی ہے۔ اِس لئے مَیں نے لکھ دیا ہے کہ شاعر کے کمال معلومات کی دلیل ہے جس کسی نے یہ بیت کہی وہ واقف تھا اور معترض ناواقف ہیں +

اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کا اس پر معترض ہونا اُن کے دامن علم و تحقیق پر ایک ایسا بدنما دھبہ ہے۔ جو اُن کے یا اُن کے کسی معتقد کے مٹائے نہیں مٹ سکتا +

مولوی شبلی صاحب کا قول

(۳) موازنہ کے صفحہ ۱۸ پر مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ (۱) اگر یہ پتہ لگ سکتا۔ کہ دبیر و انیس میں سے اوّل کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا۔ اور خاص خاص مرثئے اور خاص خاص بند جو دونوں کے یہاں قریب المعنی ہیں۔ اوّل کس نے کہے۔ تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہو جاتے۔ لیکن افسوس کہ مجھ کو باوجود بہت جد و جہد کے اس بارے میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ (۲) پھر آگے بڑھ کر لکھتے ہیں۔ کہ زمانے کی تقدیم و تاخیر نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعین ہوتا۔ کہ ایجاد کا فخر کس کو حاصل ہے۔ اور کس نے کس سے اثر لیا ہے۔ (۳) میر انیس جا بجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں۔ کہ اُن کے حریف اُن کے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً ؎

دگا رہا ہو دا مضامین لو کے پھر انبار + خبر کرو مری خرمن کے خوشہ چینوں کو۔ ؎

لو سنجیوں نے تری اے انیس + ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا۔ ؎ ملتی نہیں

دزدان معانی سے نجات + سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے + ان چوٹوں کو سُن کر

دبیر برابر کا جواب نہیں دیتے

مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے۔ یعنی یہ نہیں کہتے۔ کہ میں نہیں میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔ بلکہ صرف تبرے کرتے ہیں۔ کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎ شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں + ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں ؎ ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے + یعنی بری ہوں سرقۂ مضمونِ غیر سے + اس سے (۴) اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے۔ کہ میر انیس مرزا دبیر صاحب کے مقابلہ کا قصد نہیں کرتے تھے۔ اور اُن کے مرثیوں کا جواب لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ورنہ مرزا صاحب ضرور اس کا اشارہ کرتے۔ (۵) اس کے ساتھ جب بعض

مرثیوں سے صاف ثابت ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے پر لکھے گئے
ہیں۔ تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ مقابلہ وہم طرحی و مسابقت کی کوشش مرزا
صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔ میر انیس نے اسی کی طرف ایک موقع
پر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎ بھلا تردّد بے جا سے اُس میں کیا حاصل +
اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو۔ اور پھر صفحہ ۲۶۶ پر مولوی صاحب موصوف
فرماتے ہیں۔ کہ مرزا دبیر نے میر انیس پر کہیں سرقہ کی تعریض نہیں کی ہے

جواب

اب میں کہتا ہوں۔ کہ جناب مولوی صاحب آپ جدّ و جہد کے ساتھ اگر لکھنؤ وغیرہ
میں بڈھے بڈھے ذی علم آدمیوں سے دریافت فرماتے۔ تو ضرور آپ کو معلوم ہو جاتا۔ کہ مرزا
صاحب کو میر صاحب سے بہت عرصہ پہلے لکھنؤ میں شہرت ہو چکی تھی۔ اور
وہ اُستاد مان لئے گئے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا۔ کہ مرزا صاحب کے مقابلے پر بڑے
بڑے کامل شاعر برسوں کوشش کرتے رہے۔ مگر ملک نے اُن کو مرزا صاحب کا مدِّ مقابل
نہیں مانا۔ جیسے جناب امانت مرحوم۔ جناب عشق مغفور۔ اختر [1] مرحوم۔ جناب منشی
مظفر علی خاں صاحب اسیر مبرور۔ شہرت مرحوم [2]۔ یہ سب شاعر بجز شہرت مرحوم کے
جن کا حال مجھے معلوم نہیں ہے اپنی اپنی طرز میں کامل تھے۔ معلومات بھی سب کی اعلےٰ درجہ
کی تھی۔ زمانہ بھی موافق تھا۔ مگر دبیرؒ کے مقابلے پر مرثیہ گو نہیں مانے گئے۔ میر انیسؒ
صاحب کا یہ بھی کمال سمجھا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے مقابلہ فرمایا۔ اور کامیاب ہوئے۔
ملک نے مان لیا۔ کہ دبیرؒ و انیسؒ آسمان مرثیت کے دو آفتاب ہیں۔ + مرزا صاحب کو

؎۱ آغا محمد تقی خاں مرحوم مرزا صاحب کے ایک شاگرد تھے۔ بعد کو انہوں نے برسر منبر کہا تھا۔ کہ میں مرزا صاحب کا شاگرد نہیں ہوں
انہیں کا یہ بے نقط مرثیہ ہے ؎ ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا +

؎۲ شہرت میر ضمیر صاحب کے ایک شاگرد تھے جنہوں نے برسوں کوشش کی۔ کہ مجھے ملک مرزا دبیر کا ہمسر مان لے۔ میر ضمیر صاحب نے بھی ان کے لئے
کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ کہ آج صحیح نام بھی شہرت مرحوم کا کوئی نہیں بتاتا۔ شہرت ہونا تو درکنار +

عہد غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر میں شہرت ہو جاتے اور میر صاحب کے مشہور نہ ہونیکی
بڑی دلیل فسانہ عجائب کی وہ عبارت ہے جو میں (اپنی) اس کتاب میں ایک دوسرے
مقام پر لکھ چکا ہوں۔ اور یہاں پھر لکھونگا کہ ناظرین کو ورق گردانی کی تکلیف نہ ہو۔
(کیونکہ فسانۂ عجائب غازی الدین حیدر کے عہد میں شروع اور نصیر الدین حیدر کے زمانے
میں تمام ہوا)۔ وہ عبارت یہ ہے "مرثیہ گوے بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک
ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مرد مسکین۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔
اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع۔ بصورت گدا۔ بار احسان۔
اہل دول کا نہ اٹھایا۔ عرصہ قلیل میں مرثیہ اور سلام کا دیوان کثیر فرمایا" دیکھئے۔ اس
عبارت میں گویا میر خلیق صاحب کا نام نامی اور مرزا دبیر کا اسم سامی ہے۔ مگر
میر انیس صاحب کا تخلص نہیں ہے۔ اور ہوتا کہاں سے۔ وہ تو بقول مشہور جس کو
مصنف واقعات انیس نے بھی لکھا ہے۔ اس وقت فیض آباد میں تھے۔ اور
فسانۂ عجائب کی تصنیف کے زمانے سے قریبا ۳۰ یا ۲۵ سال بعد عہد سلطنت
امجد علی شاہ مرحوم میں (جو سنہ ۱۲۵۸ ہجری سے شروع ہوتا ہے) لکھنؤ آکر مستقل
سکونت پذیر ہوئے ہیں۔ صاحب واقعات انیس لکھتے ہیں۔ کہ خود میر انیس
مرحوم فرماتے تھے۔ کہ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا ہے۔ تو
اس وقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے۔ ایک
میر مداری صاحب جو پار میں رہتے تھے۔ دوسرے مرزا سلامت علی
دبیر (مرحوم)۔ میر مداری صاحب اگر وہی بزرگ ہیں۔ جن کا شہرت تخلص تھا۔
جب تو ان کا حال اس کتاب میں آچکا ہے۔ ورنہ آج لکھنؤ میں کوئی نہیں بتاتا۔
کہ ان کا کیا تخلص تھا۔ عہد امجد علی شاہ مرحوم میں میر صاحب لکھنؤ میں آئے۔ اور
مرثئے کہے۔ اور پڑھے۔ اس کے بعد شہرت ہوئی۔ اور عہد مذکور میں مرزا صاحب کو

فسانۂ عجائب

اس قدر شہرت ہو چکی تھی۔ کہ اُن کے شاگردوں تک کے شاگرد اُس زمانے کے تذکرہ سراپا سخن میں نظر آتے ہیں*۔ چنانچہ شاہزادہ دہلی خورشید قدر کو مصنّف نے صفحہ ۲۴ پر لکھا ہے کہ "شاہزادہ خورشید قدر قیصر تخلّص بن آسمان قدر ابن محمد خرّم بخت ابن مرزا جہاندار شاہ کو مشورہ سخن گوہر علی مشیر مرثیہ گو سے اتفاقاً ہوتا ہے۔ کہ بسبب سیر و تصنیف کتاب تاریخ فکرِ شعر کمتر کرتے ہیں" اور مشیر مرحوم ایسے مشہور مرثیہ گو وہ ہیں۔ گو شاگرد مرزا صاحب ہیں۔ جو آفتاب سے زیادہ مشہور ہیں۔ الحاصل جب یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ مرزا صاحب کو میر صاحب سے پچیس تیس برس پہلے اس قدر شہرت ہو چکی تھی۔ تو مولوی شبلی صاحب کا (جو بڑے محقق و مؤرخ سمجھے جاتے ہیں) یہ لکھنا کہ اُن کو باوجود بہت سی جدّ و جہد کے پتہ نہ لگا۔ کہ دبیر و انیس میں سے اوّل کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے۔ مولوی صاحب اگر پتہ لگاتے۔ تو اُن کو ضرور معلوم ہو جاتا۔ اور خاص کر مرزا صاحب کے باب میں تو دو کتابیں شمس الضحےٰ و تنقید آبِ حیات بھی اب سے تیس چالیس برس پہلے کی چھپی ہوئی جابجا ملتی ہیں۔ وہ دیکھ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے تو پہلے ہی سے مرزا صاحب کے گھٹانے پر کمرِ ہمت چُست باندھ لی تھی (جیسا کہ اُن کی اور میری کتاب پڑھنے سے منصف مزاج آدمی کو معلوم ہوگا)۔ پھر وہ ایسی کتابوں کو کیوں دیکھتے۔ اور جب مرزا صاحب کی شہرت مقدم قابل یقین ثابت ہو چکی۔ تو ہر شخص منصف مزاج یہی فیصلہ کریگا۔ کہ مقابلہ کی کوشش میر صاحب کی طرف سے ہوئی۔ کیونکہ مشہور شخص کے مقابلہ کی ہر شخص فطرۃً کوشش کرتا ہے۔ غیر مشہور کے مقابلہ کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ میرا کام محض مولوی صاحب کی غلطیوں کا دکھانا نہیں ہے۔ بلکہ امر واقعی جو مجھے معلوم ہُوا ہے۔

شاگردِ دبیر

اوّل مقابلہ کی کوشش میر صاحب کی طرف سے ہوئی

*سراپا سخن عہد امجد علی شاہ میں شروع ہُوا۔ عہد واجد علی شاہ مرحوم میں ختم و مکمل ہُوا۔ اس تذکرہ میں جناب میر انیس مرحوم کی [illegible] خبر نہیں ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

اُس کا چھپانا میں شانِ مُورخی کے خلاف اور گناہِ اخلاقی سمجھتا ہوں۔ مجھے معمّر اور معتبر لکھنؤ کے بزرگوں سے یہ معلوم ہُوا ہے۔ کہ اوّل اوّل میر صاحب نے مرزا صاحب کے مشہور مشہور مرثیوں کے جواب کہے[1]۔ پھر مرزا صاحب نے (جبکہ میر صاحب کی شہرت عہدِ واجد علی شاہ مرحوم میں ہو گئی۔ تو) میر صاحب کے بعض مرثیوں کے جواب لکھے۔ جن میں سے شائد دو تین مرثئے نکلے ہیں۔ باقی ایسے مرثئے حسبِ وصیت جناب مرحوم اُستاذی مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہٗ کے پاس محفوظ ہیں*

اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ مرزا صاحب کی نسبت مولوی شبلی صاحب کا یہ ارشاد (کہ وہ صرف تبرّے کرتے ہیں) بھی غلط ہے[2]۔ مرزا صاحب صرف دشمنانِ اہلِ بیت پر تبرّے کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ) کسی مدّاحِ اہلِ بیت یا اُس کے کلام پر وہ تبرّا نہیں کرتے[3]۔ ہاں ڈنکے کی چوٹ یہ ضرور کہتے ہیں۔ کہ میں مُوجد ہُوں۔ میرے مضامین دُوسرے شعرا لیتے

---

[1] چنانچہ بعض مرثیوں کے مطلع بھی ملتے جُلتے ہیں۔ مثلاً مرثیہ دبیر۔ جب قیدیوں کو راہ میں ماہِ صفر ہُوا۔ (انیس) جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہُوئی۔ (دبیر) جب پریشاں ہُوئی مولا کی جماعت رن میں۔ (انیس) جبکہ خاموش ہوئی شمعِ امامت رن میں۔ (دبیر) زنجیرِ جہنم سے جب آزاد ہُوا۔ (انیس) دوزخ سے جب آزاد کیا حر کو خدا نے۔ سُنا ہے کہ مرزا صاحب کا یہ مرثیہ۔ دستِ خدا کا قوتِ بازو حسین ہے۔ بہت مشہور و مقبول تھا جب میر انیس صاحب لکھنؤ میں آئے۔ پس حال داخلہ کربلا میں انھوں نے یہ مرثیہ فرمایا۔ جب کربلا میں داخلہ شاہِ دیں ہُوا + ۱۲ مُولف۔

[2] یہاں تبرّے کے لفظ پر حضرت ذوق دہلوی کی ایک اصلاح یاد آئی جو لکھنؤ میں مخدومی پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی اے کی زبانی (حکایت) سُنی تھی۔ وہ یہ ہے کہ دہلی میں ایک عزادار نے عشرۂ محرم میں ایک سبیل رکھی اُس پر یہ مصرع لکھا تھا۔ تبرّا کر کے پی لو یہ نذرِ حضرت ہے۔ اتفاقاً جناب ذوق بھی اُدھر سے گذرے۔ وہ صاحب جناب ذوق کے بھی ملنے والے تھے۔ آپ سے کہا دیکھئے۔ یہ مصرع میں نے کہا ہے۔ کچھ عیب شاعری ہو تو فرما دیجیگا۔ جناب ذوق نے کہا عیب تو کچھ بھی نہیں مگر میری رائے میں تو یُوں مصرع لکھدو۔ تبرّک کا اسے پی لو یہ نذرِ حضرت ہے۔ پھر خود ہی یہ بھی کہا کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ ذوق سُنّی ہے لفظ تبرّا سے بُرا معلوم ہوتا ہے۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ یہ نذر و نیاز کی چیز ہے۔ یہاں تبرّک کا ہی لفظ ہونا چاہئے۔ سچ ہے ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ خوب اصلاح ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

[3] مولوی شبلی صاحب نے تبرّا کو بجائے تبریّت برأت استعمال فرمایا گو لغۃً یہ صحیح ہو۔ مگر اردو کی زبان پر تبرّے ایک خاص معنی پر بولا جاتا ہے یعنی کسی شخص سے بیزار ہونا اور عام لوگوں نے تو اس کے مفہوم کو اور بھی سطح کر دیا ہے جس کی تشریح کا یہ محل و موقع نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے لفظ تبرّا بے محل استعمال کیا اسی لئے میں نے لکھ دیا کہ مرزا صاحب کسی مداحِ اہلبیت پر تبرّا نہیں کرتے۔ ورنہ مولوی صاحب کے کلام کا یہ مفہوم ہے کہ مرزا صاحب کسی مداح پر تبرّا کرتے

ہیں - افسوس مولوی شبلی صاحب کو دفترِ ماتم کی مطبوعہ بیس جلدوں میں سبھی ایسے اشعار نہ ملے - صرف دو ہی شعر ملے - اُن میں سے بھی شعر ثانی غلط لکھ دیا - صحیح مجھ سے سُنئے - اور یوں ہیں (صحیح چھپا بھی ہے) ؎

ہے مجھ کو استفادہ حدیثوں کی سیر سے + واللہ ننگ و عار ہے مضمونِ غیر سے

احادیث وسیر کے کیا معنی (کیونکہ سیرت کی جمع سِیَر بکسرِ اوّل و فتحِ ثانی ہے - بفتحِ اوّل و سکونِ ثانی نہیں ہے - جو غیر کا قافیہ ہو سکے - اب ایسے اشعار سُنئے - جن میں اُنہوں نے صاف صاف دعوے فرمایا ہے - کہ میرے کلام سے دُوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں - اور دُوسروں کا بازار سرد ہے - اور میں مُوجد اور دُوسرے خوشہ چیں و مقلّد ہیں :-

(۱) مضمون نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ | کہتا ہے سخن حضرتِ اُستاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تاثیرِ خداداد ہمیشہ | بھولے سے بتادوں تو رہے یاد ہمیشہ
بے لُطفِ خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی* | پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

(۲) اور لیجئے :-

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی | ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہر بحر میں ہے بحرِ طبیعت کی روانی | ہے زورِ سخن شور پہ موجوں کی زبانی
قطرے سے مگر کشتی میں مُصرف نہیں ہوں | دریا ہوں سخن کا میں تنک ظرف نہیں ہوں

پہلے مصرع میں صاف صاف دعوے کرتے ہیں - کہ میرے الفاظ اور میرے مضمون وقف ہیں - جن کو سب لیتے ہیں - جو شاعر کے الفاظ و مضامین لیگا - وہ سرقہ نہیں کریگا

صاف دعوےٰ ایجاد و تعریف سرقہ

اور لیجئے

شرح کلام مرزا مرحوم

*تعجب ہے کہ مولوی صاحب نے صفحہ ۲۷۶ پر موازنہ میں خود یہ بند لکھا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے - اور کس طرح برابر کا جواب دیتے صاف تو کہہ رہے ہیں - کہتا ہے سخن حضرتِ استاد ہمیشہ - جب سخن کے اُستاد ہیں - تو اہلِ سخن کے بھی اُستاد ہوئے - مولوی صاحب نے اعتراض یہ فرمایا ہے کہ جو چیز خداداد ہے - اُس کے لئے ہمیشہ کی قید حشو ہے - میں کہتا ہوں کہ مرزا صاحب کا مطلب ہے کہ تاثیر خداداد میرے کلام سے کبھی الگ نہیں ہوتی - اب مولوی صاحب خیال فرمائیں کہ اُن کا اعتراض حشو محض ہے یا نہیں ۱۲ مولف حقیر -

تو اور کون سارق ہوگا۔ پھر اُس کے ساتھ تشبیہ و تمثیل کی شان شرافت کا پہلو لئے ہوئے دیکھئے کہ میٹھے پانی کو (دریا کے) سب ہی پیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دُوسرے مجھ سے مضامین والفاظ لینے پر مجبور ہیں۔ اُن کا وہاں تک ذہن ہی نہیں پہنچتا۔ پھر وہ میرے کلام سے سرقہ نہ کریں۔ تو کیا کریں۔ تیسرے مصرع میں کہتے ہیں۔ کہ عروض وغیرہ باقاعدہ پڑھا ہوا ہوں اس لئے ہر بحر میں نظم کرتا ہُوں۔ اُن شاعروں کی طرح نہیں ہُوں۔ جو چند مشہور بحروں کے سوا اور بحروں میں کہنے سے (ناواقفیت عروض کے سبب سے) مجبور ہیں۔ کہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ (بعض حروف) عین یا ھ وغیرہ گر جاتے ہیں۔ اور اُن کو خبر نہیں ہوتی۔ مصرع تقطیع سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ آگاہ نہیں ہوتے۔ افسوس یہ ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے یہ بند بھی موازنہ میں لکھا ہے * مگر مطلب شائد نہیں سمجھے ہیں۔ جو (چوتھے مصرع کی نسبت) فرماتے ہیں۔ کہ مقصد یہ ہے۔ کہ زورِ سخن شور پر ہے۔ لیکن اس بات کو مَیں نہیں کہتا۔ بلکہ موج کی زبان کہتی ہے۔ یہ قطرۂ ناچیز عرض کرتا ہے۔ کہ زورِ سخن موجوں کی زبانی شور پر ہونے سے مرزا صاحب کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ موجیں۔ یعنی مصرع خود پکارتے ہیں۔ کہ ہم چُست و زوردار ہیں مضمون زبانِ حال سے آواز دے رہے ہیں۔ کہ ہم نئے ہیں۔ الفاظ اپنی شان دکھا رہے ہیں۔ کہ ہم کو اب تک کسی اور شاعر اردو نے نہیں باندھا۔ چنانچہ وہ اسی مضمون کو دُوسرے مرثیہ مابعد میں بھی فرماتے ہیں۔ ؎

اب فخر کے بیان سے چپ ہو گئے ہیں ہم مصرع پکارتے ہیں کہ سُن لو نئے ہیں ہم*

مولوی صاحب کا یہ بھی ارشاد وایراد ہے۔ کہ بحث میں صرف ہونا کون سا محاورہ ہے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ یہ ہم لکھنؤ والوں کا محاورہ ہے۔ اعظم گڈھ کا اگر محاورہ نہ ہو۔ تو ہمیں کیا۔ اور ہو تو ہمیں کیا۔ (بقول میر مرحوم) ؎

* ایک اور مرثیہ میں کہتے ہیں۔ جتنے ہمہ داں ہیں وہ میرے مرثیہ داں ہیں۔ یہ نظم وہ دیکھیں جو فصیحانِ جہاں ہیں مصرع نہیں یہ موجیں یہ فصاحت کی رواں ہیں۔ پس موجوں سے مراد مصرعوں سے ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

گفتگو ہم سے ریختہ میں نہ کر   یہ ہماری زبان ہے شبلیؔ*

صرف ہونا بجائے مصروف ہونے کے پہلے بھی بولتے تھے - اور آج بھی بولتے ہیں جس طرح "رنگ فق سے ہوگیا" اور "رفق ہوگیا" دونوں طرح بولتے تھے - اور لسّان نے جناب میر صاحب کے اس مصرع پر اعتراض جڑ دیا ع رنگ رخ کفّار عرب ہوگیا فق سے - اور مولوی شبلی صاحب نے بھی اُنہیں کے حوالہ سے لکھ دیا - کہ محاورہ نہیں - حالانکہ لسّان نے اُس کو محاورہ عوام بتایا ہے - پس مولوی صاحب نے یہ دُوسری ٹھوکر کھائی - اور اس کے ساتھ ہی صرف ہونے کو بھی محاورہ نہ ہونا وہ سمجھے - حالانکہ لسّان نے بھی ایسا ہی اعتراض کیا تھا جناب مجر مرحوم نے اُن کو جواب دے دیا تھا - کہ محاورہ ہے - جیسے کہتے ہیں - کہ آپ کے پندرہ۱۵ روپے ہمارے پاس سے صرف ہوگئے - پس جس طرح یہاں "صرف ہوگئے" "مصروف ہوگئے" کی جگہ پر بولتے ہیں - اُسی طرح "صرف ہوگئے" "کسی کام میں مصروف ہونیکے" معنی پر بھی بولتے ہیں - مگر مولوی صاحب کے ماننے والے خصوصاً نئے تعلیم یافتہ اُس وقت تک شاید نہ مانینگے - جب تک میں یہ محاورہ کسی اور شاعر کے کلام میں نہ دکھاؤں ہر چند دبیرؔ کے کلام سے اور شعرا سند لیتے ہیں - پھر دبیرؔ کے واسطے دُوسرے شعرا کے کلام سے سند لانا سورج کو چراغ دکھانا ہے - مگر خیر نئی روشنی کا زمانہ ہے - ہم سے دُوسرے مستند شاعر کا شعر بھی سن لیجئے - اور وہ دُوسرا شاعر بھی مرزا صاحب کے پہلے کا نہیں (جس کو سُن کر آپ یہ کہدیں - کہ مرزا صاحب کے پہلے محاورہ ہوگا - مرزا صاحب کے وقت میں ترک ہوگیا تھا) بلکہ مرزا صاحب کا معاصر و مستند شاعر لیجئے - جس کو تمام ملک مستند مانتا ہے - وہ کون ؟ منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب منیرؔ مرحوم - وہ اپنی مستند و معتبر مثنوی معراج المضامین میں فرماتے ہیں - ؎

صرف ہونا محاورہ ہے - اس کی سند

* میر صاحب کا اصل مصرع یہ ہے "یہ ہماری زبان ہے پیارے" - مگر مولوی صاحب شاید عمر میں مجھ سے بڑے ہیں - اس لئے میں نے یہاں اُنکا تخلص و نام لکھ دیا - اور اُن کی بزرگی کا خیال رکھا - پیارے کا لفظ نہیں لکھا ۱۲ مولف حقیر -

مگر تھے صرف فیضانِ دعنایت کیا کرتے تھے عالم کی ہدایت

کیوں مولوی صاحب سچ فرمائیگا۔ کیسی ہندی کی چندی میں نے سمجھائی ہے +

(۳) اور لیجئے :۔

خلاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

اس سے بڑھ کر کوئی تعریض ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ میں نئے نئے مضمون پیدا کرتا ہوں۔ اُنہیں کو میرے معاصر و مدمقابل شعرا اڑا لیتے ہیں۔ میں شعر کہنا چھوڑ دوں۔ تو اُن کی قلعی کھل جائے۔ اُن کے کلام میں پھر ایک بھی مضمون نظر نہ آئے۔ فرمائیے۔ یہ سرقہ کی تعریض صاف صاف ہے یا نہیں۔ اگر اب بھی آپ کی تسکین نہیں ہوئی۔ تو

(۴) یہ اور سہی

بڑھتا ہوں صف نظم میں ہٹنا نہیں آتا سب آتا ہے مضمون اُلٹنا نہیں آتا

اس کا یہی مطلب ہے یا اور کچھ۔ کہ میرے معاصر میرا مضمون اُلٹ لیتے ہیں یعنی سرقہ کرتے ہیں۔ اور مال مسروقہ کی حیثیت بگاڑ کر (ذرا تغیر و تبدل کر کے) لوگوں کے سامنے (بازار سخن میں) لاتے ہیں۔ میرا یہ شیوہ نہیں ہے۔ کیونکہ میری طبیعت خلاق عالم نے ایسی نہیں بنائی ہے۔ میں خود مضمون پیدا کرتا ہوں +

اگر اب بھی آپ کو کچھ کلام ہے۔ کہ مرزا برابر کا جواب نہیں دیتے۔ تو اور بھی سُن لیجئے :۔

(۵) منصف ہو تو دعوے نہ کرے لاف زنی کا سگ ہے مرے نام پہ شیریں سخنی کا

یہ صاف صاف ادعائے شاعرانہ ہے۔ کہ میرے سامنے دوسرا شاعر شیریں سخنی کا دم نہیں مار سکتا +

اس کے ساتھ یہ دعوے اور بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

(۶) کس طرز کو رونق ہو اس انداز کے آگے جادو کہیں چل سکتا ہے اعجاز کے آگے

شاعر اپنے کلام کو اعجاز اور دُوسرے کے کلام کو افسون و جادو بتا رہا ہے +

کُھلم کُھلا چوٹ

اور بھی کُھلم کُھلّا چوٹ دیکھئے۔ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں:۔

(۷) سرقہ ہے کہ تالیف ہے مضمون کہن کے یہ سبب ہے زکوٰۃ اپنے زرِ نقد سخن کی

کہا اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ میرے مضامین جو معاصرین چُراتے ہیں۔ وہ گویا میری خیرات کھاتے ہیں +

اور سنئے

اب بھی اگر جناب کی تسکین نہیں ہُوئی ہے۔ تو اور سُنئے:۔

(۸) جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں اُن مرثیوں گو بوں کو سلام اپنا ہے

اس سے بڑھ کر کون سا دعوےٰ ہو سکتا ہے (کہ صاف صاف کہ رہے ہیں) کہ ہمارے معاصرین بند کے بند ہمارے اُڑا لیتے ہیں۔ ہم بجائے اس کے کہ سرقہ کا استغاثہ کریں۔ ان کو سلام الزامی کر لیتے ہیں +

صاف صاف تعریض

سب سے بڑھ کر صاف صاف یہ فرماتے ہیں:۔

(۹) دُزدانِ مضامین پہ نہ کر منع کی تاکید تو مجتہدِ نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

کہتے ہیں۔ کہ مَیں مجتہد ہُوں۔ اجتہاد و کوشش و دماغ سوزی سے بات میں سے بات نکالتا ہُوں۔ معاصرین میری تقلید کرتے ہیں۔ وہ مضمون چُراتے ہیں۔ تو (اے نفس) چُرانے دے۔ منع نہ کر۔ کہ مقلّد کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ کہ اُس میں مادّہ اجتہاد ہی نہیں ہے۔ اب تقلید نہ کرے۔ تو اُس کا کام کیونکر چلے +

یہ نو نمبر مَیں نے لکھ دئے ہیں۔ کہ ۹ کے عدد میں ایک خاص صفت یکرنگی کی ہے۔ کہ ہر عدد سے ضرب کھا کر حاصل ضرب میں سے گویا ۹ نو ہی حاصل ہوتے ہیں۔ ورنہ مرزا مرحوم نے ایسی شاعرانہ چوٹیں بہت کی ہیں۔ اور سُنئے۔ اُنہوں نے اپنے منکران کمال کی بھی جا بجا خبر لی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

منکروں کی بھی خبر لی ہے

منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے انصاف تو کہتا ہے خداوند یہی ہے

اور یہ بھی کہا ہے۔ ؎

جو حاشیہ کی طرح طرفدار نہ ہونگے ۔۔۔ میرے سخن صدق سے بیزار نہ ہونگے

لطیفہ میر محب علی سلیس مرحوم

ایک لطیفہ جو میں نے ایک صاحب سے سُنا تھا یاد آگیا۔ میر و مرزا کے زمانے میں کچھ اور بھی مرثیہ گو شاعر ایسے تھے۔ کہ ان کے مُقابلہ میں مرثیے کہتے تھے اور چوٹیں کرتے تھے۔ اور میر و مرزا کی چوٹوں کی شان نزول اپنی ذات ستودہ صفات کو سمجھتے تھے۔ سُنا ہے۔ کہ اُنہیں بزرگواروں میں سے ایک صاحب میر محب علی صاحب مرحوم سلیس تخلص اکبر آباد میں مدرّس تھے۔ جو علم کے ساتھ زبان و طبیعت بھی سلیس و سلیم رکھتے تھے*۔ اُن کو یہ خیال تھا۔ کہ میر انیس کا میں مد مُقابل ہُوں۔ جب یہ سلام اُن تک پہنچا۔ تو یہ مقطع پڑھ کر "نواسنجیوں نے تری الخ" خیال کیا۔ کہ میں اکثر چوٹیں کرتا رہتا ہُوں۔ میر صاحب نے یہ چوٹ مجھی پر کی ہے۔ فوراً وہ سلام میر صاحب کا (جس کا مقطع یہ ہے ؎ نواسنجیوں نے تری اے انیس۔ ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا) تضمین کر کے ڈاک میں میر صاحب کے پاس لکھ کر بھیج دیا۔ مقطع پر یُوں مصرع لگائے تھے۔

نہ مونس رح کی باتیں تھیں ایسی نفیس رح ۔۔۔ نہ تھی اُنس رح کی نظم اتنی سلیس

یہ سچ ہے بقول انیس رح اے سلیس ۔۔۔ نواسنجیوں نے تری اے انیس رح

ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

جب میر صاحب کو یہ خمسہ پہنچا۔ ایک نظر دیکھ کر چپ ہو گئے۔ وہ کوہ حلم و وقار ایسی ایسی باتوں کی کب پروا کرتے تھے۔

---

* ان سلیس مرحوم کا میں نے ایک مطبوعہ مرثیہ دیکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎ زندہ ہیں ابد تک شہدا راہ خدا کے۔ جس میں اُس معجزہ مشہور کو نظم کیا ہے جو اُن کے زمانے میں ہُوا تھا۔ کہ ایک رُومی افسر حالت نجاست میں شراب پی کر روضۂ امام حسینؑ میں جاتا تھا۔ کہ ایک طمانچہ لگا منہ سیاہ ہو گیا۔ اُن کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھا کہتے تھے۔ مگر میر انیس کی بات اُن کے دم کے ساتھ تھی۔ مولوی مرزا خادم حسین صاحب متخلص ہمارے کہ میر انیس کے شاگرد آگرہ میں سُنے جاتے ہیں اور تذکرہ خمخانۂ جاوید جلد اوّل صفحہ ۲۷۶ پر سلیس مرحوم کے فرزند میر محمد جعفر صاحب آسمان تخلص سلمہ کا ذکر خیر ہے ۱۲ مؤلف

(۳۴) صفحہ ۲۶۶ میں بلاغت کی بحث میں مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ کہ "یہ وہ چیزیں ہیں۔ کہ جہاں دبیر و انیس کی شاعری کی سرحدیں بالکل الگ ہو جاتی ہیں۔ مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں۔ لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا" یہ فقرہ کہ "گو تمام اوصاف پائے جاتے ہوں" اس دُور اندیشی سے غالباً لکھا ہے۔ کہ اس ناپرسٹی اردو کے زمانے میں اوّل تو کون اتنی محنت گوارا کریگا۔ کہ ہر قسم کی مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے نکال کر پیش کرے۔ اور اگر کوئی ایسا کرے (جیسا کہ حقیر نے ہر قسم کا کلام محنت کر کے اکٹھا کیا* اور ناظرین کے سامنے پیش کر دیا)۔ تو اُس وقت کہنے کو ہو گا۔ کہ ہم نے تو ایسا فقرہ پہلے ہی لکھ دیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ فرمایا۔ کہ تمام اوصاف شاعری ہی کا تو دُوسرا نام گویا بلاغت ہے۔ اب میں اس کو خدا کی شان کہوں۔ یا توفیق جبری۔ کہ خود صفحہ ۲۷۹ پر پہنچکر مولوی صاحب نے رنگ ہی بدل دیا شہادت علی اصغر شیر خوار کے واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں۔ کہ اس واقعہ کو میر ضمیر صاحب سے لیکر آج تک نئے نئے پیرایوں میں لوگوں نے ادا کیا۔ میر انیس صاحب نے مختلف مرثیوں میں یہ واقعہ لکھا۔ اور یہ واقعہ (تمام) واقعات کربلا میں نہایت درد انگیز ہے۔ مگر مرزا دبیر نے جس بلاغت سے مضمون ادا کیا ہے۔ اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے۔ وہ میر انیس صاحب یا اور کسی سے آج تک ادا نہ ہو سکا۔ ناظرین! خدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے۔ یا تو مرزا دبیر ایسے تھے۔ کہ اُن کے کلام میں کہیں بلاغت کا شائبہ نہ تھا۔ بلاغت چھو نہ گئی تھی۔ یا ایک ایسے واقعہ کے بیان میں وہ ایسی بلاغت اور درد انگیز سماں دکھلاتے ہیں۔ کہ جو نہ اور کسی شاعر ماقبل و مابعد سے ہو سکا نہ میر انیس صاحب سے۔ پھر وہ مرثیہ بھی دیکھئے۔ کوئی آخری زمانہ کا مرثیہ نہیں ہے۔ بلکہ درمیانی حصہ عمر کی تصنیف۔ اور اُس عہد محمد علی شاہ مرحوم کی تصنیف ہے۔ کہ جس زمانہ تک میر انیس صاحب لکھنؤ میں

*ملاحظہ ہو جلد ثانی اس کتاب کی جس میں ہر قسم کا کلام کثرت سے حقیر نے جمع کیا ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

بلاغت دبیر سے انکار

شہادت علی اصغر و دبیر مرحوم و اعتراف مولوی شبلی صاحب نسبت بلاغت دبیر

تشریف ہی نہ لائے تھے۔ اُن کی شہرت ہوتا تو کیسا۔ جو کوئی شخص یہ کہ سکے۔ کہ میر صاحب کا طرز مرزا مرحوم نے اُڑا لیا۔ اور پھر یہ بھی مولوی صاحب خیال نہیں فرماتے۔ کہ جو شخص تمام واقعات میں سے زیادہ اہم اور نازک واقعہ کو سب سے بہتر نظم کر دیگا۔ اُس کو دُوسرے مرثیوں میں اور حالات (جو اہمیت و نزاکت میں اُس سے کم ہیں) نظم کرنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے۔ یہ وہی مرثیہ ہے۔ جس کے چند بند مَیں بطور نمونہ ایک جگہ اس کتاب میں پیش کر چکا ہُوں۔ اور جس کا مطلع یہ ہے* ؎ بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے۔ اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ ملک کے اس عام مقولہ کو مولوی صاحب نے اپنی خوش فہمی و دلیل سے باطل کرنا چاہا ہے۔ کہ **کلام میر صاحب میں فصاحت اور کلام مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے**۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ یہ مقولہ غلط ہے۔ کیونکہ فصاحتؔ بلاغت کو حریف قرار دینا اجتماع نقیضین ہے۔ کہ بلاغت کا جزو فصاحت ہے۔ مرزا کے کلام میں فصاحت نام کو نہیں۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ مقولہ اہل ملک کا مطلب یا تو مولوی صاحب خود غلط سمجھے ہُوئے ہیں۔ یا دُوسروں کو غلط سمجھاتے ہیں یہ تو کوئی بھی (بجز مولوی شبلی صاحب کے) نہیں کہتا۔ کہ مرزا صاحب کے کلام میں فصاحت چھو نہیں گئی۔ فصاحت نام کو نہیں۔ ضرور فصاحت بھی ہے۔ اور اُس کے ساتھ بلاغت بھی۔ کہ مرزا مرحوم کا اکثر کلام بلیغ اور بعض کلام محض فصیح ہے۔ اور بیشک فصاحت بلاغت کی تابع اور جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ **مؤرخ اودھ** صاحب بوستان اودھ بھی (شعرائے اودھ کے حال میں جہاں دبیر و انیس کا حال لکھا ہے) یہی لکھتے ہیں۔ (اس کتاب فارسی کا ترجمہ اردو بہارستان اودھ کے نام سے چھپا ہے۔ اصل کتاب فارسی ایک ہندو صاحب ذیعلم تعلقدار سندیلہ کی تصنیف ہے۔ جو لکھنؤ میں معزز عہدے پر

کلام دبیر میں بلاغت زیادہ ہے

مؤرخ اودھ

* مخدومی جناب مسٹر نواب حامد علیخاں صاحب حامد (بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ) نے جو مضمون مقابلہ ملٹن و دبیر کا لکھا ہے۔ اُس میں بھی اس مرثیہ کے کچھ بند لکھے ہیں۔ جو قابل دید ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

مولوی شبلی صاحب کی بلاغت سے ناواقفی ذرا دیکھئے

زمانہ شاہی میں ممتاز تھے۔ یہ لکھتے ہیں) کہ حضرت دبیرؒ نے میدان بلاغت میں علم یکتائی بلند کیا تھا حضرت انیسؒ نے ساحت فصاحت میں انا ولاغیری کا ڈنکہ بجایا تھا۔ اب طرفداران مولوی شبلی صاحب! ذرا آپ یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ خود (مولوی شبلی صاحب کی) کتاب موازنہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب بلاغت سے بالکل بے خبر ہیں۔ ثبوت بیّن اس کا یہ ہے۔ کہ صفحہ ۶ پر وہ لکھتے ہیں کہ "ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے" تمام اہل بلاغت کا اس پر اتفاق و اجماع ہے۔ کہ بلیغ کا اطلاق جملہ پر ہوتا ہے۔ لفظ پر نہیں ہوتا۔ لفظ کو بلیغ نہیں کہہ سکتے۔ مختصر المعانی کے شروع ہی میں صاحب تلخیص کی عبارت اور یہ بحث درج ہے* اور بھی تمام کتابوں میں (معانی و بیان کے) یہ مسئلہ اسی طرح ہے۔ ناظرین انصاف گزین! اب تو آپ کے خیال شریف میں آگیا۔ کہ مولوی شبلی صاحب گو اور علوم میں علامہ زمان ہی ثابت ہوں۔ مگر علم ادب (اردو) و معانی و بیان تو وہ بالکل نہیں جانتے۔ یہ وجہ ہے۔ جو دبیرؒ کے کلام میں بلاغت کے وہ قائل نہیں ہیں +

مولوی شبلی صاحب کی تعریف

مجھے مولوی شبلی صاحب سے کوئی [illegible]ش نہیں ہے۔ اور ایک حد تک انکی انشاپردازی کی مَیں داد دیتا ہوں۔ اور اس کا بھی معترف ہوں۔ کہ موازنہ میں بھی بہت سی کارآمد و مفید باتیں

* صاحب تلخیص المفتاح جس کی شرح (مختصر المعانی ہے) لکھتے ہیں "اَلْفَصَاحَۃُ یُوْصَفُ بِھَا الْمُفْرَدُ وَالْکَلَامُ وَالْمُتَکَلِّمُ وَالْبَلَاغَۃُ یُوْصَفُ بِھَا الْاٰخِرَانِ فَقَطْ۔ اس کے فقرہ آخر کی شرح میں صاحب مختصر المعانی ملا سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں۔ اَیِ الْکَلَامُ وَالْمُتَکَلِّمُ دُوْنَ الْمُفْرَدِ اِذْ لَمْ یُسْمَعْ کَلِمَۃٌ بَلِیْغَۃٌ۔ اس سب کا مطلب یہ ہے کہ فصاحت کا اطلاق کلمہ کلام متکلم تینوں پر ہوتا ہے کہتے ہیں یہ کلمہ فصیح ہے۔ یہ کلام فصیح ہے یہ متکلم فصیح ہے۔ مگر بلاغت کا تعلق صرف کلام و متکلم سے ہے۔ کلمہ سے نہیں ہے۔ کبھی نہیں سُنا کہ یہ کلمہ (لفظ) بلیغ ہے۔ افسوس ملا تفتازانی آج زندہ نہ ہوئے۔ ورنہ مولوی شبلی صاحب کی خدمت میں انکو لیجا کر سنوا دیتا "ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے"۔ اسی طرح صاحب شجرۃ الامانی لکھتے ہیں "لفظ فصیح اطلاق میکنند بر کلمہ و کلام و متکلم ہر سہ۔ و اطلاق بلیغ بر کلام و متکلم صحیح بود۔ و بر کلمہ غیر صحیح" + ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

سلیس عبارت میں انہوں نے بیان کی ہیں۔ بایں ہمہ جو مرزا مرحوم کی حق تلفی انہوں نے کی ہے۔ اس کا ایک زمانے کو اور مجھ کو بھی ایک زمانے میں بہت افسوس تھا۔ مگر سوانح مولانا رُوم کے صفحہ ۵۰ کی عبارت دیکھ کر تسکین ہو گئی۔ اور معلوم ہو گیا۔ کہ وہ میر صاحب کو ترجیح دینا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ سب جتن کئے۔ کیونکہ انہوں نے میر صاحب کو اپنا ہیرو سمجھا ہے۔ وہ صفحہ ۵۰ کی عبارت مولوی شبلی صاحب کی یہ ہے۔

میر صاحب کو اپنا ہیرو سمجھا

"مولانا رُوم کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا۔ کہ اِن کے معاصرین سعدی و عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا۔ تینوں بزرگوں کی غزلوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں۔ اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں۔ اس لئے مذاق حال کے موافق خواہ مخواہ بھی اُن کو ترجیح دی جاتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرض کے بالکل خلاف ہے۔" اب رہی یہ بات کہ میر انیس صاحب کو مولوی صاحب اپنا ہیرو سمجھے ہیں۔ یہ تمام کتاب موازنہ سے اور بالخصوص اس فقرہ سے جو ٹائٹل پیج پر درج ہے "میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و دبیر* کا موازنہ" ثابت ہے۔ پس انہوں نے کچھ تو معانی و بیان کی ناواقفی کے سبب سے دھوکہ کھایا۔ کچھ اپنی طبیعت کے سبب سے میر صاحب کو اپنا ہیرو (موضوع و ممدوح) سمجھ کر مرزا صاحب پر ترجیح دی۔ اور مرزا صاحب کو ناقص بتانے کی کوشش کی۔ ورنہ جو شخص موازنہ لکھے۔ اُس کا یہ فرض یہ ہے۔ کہ دونوں مصنفوں کا ہر قسم کا کلام دکھائے۔ اگر مولوی صاحب ایسا کرنا چاہتے۔ تو اُن کو ہر موقع پر مرزا صاحب کا کلام مطبوعہ (جو کلام میر صاحب سے کئی گونہ زیادہ ہے) مل جاتا۔ اور جس جس طرح میر صاحب کی کمزوریاں اور غلطیاں (عام اس سے کہ وہ غلط ہوں یا صحیح) قبول کر کے کثیر الکلامی کا عذر کیا ہے۔ مرزائے مظلوم کیواسطے

*اس موقع پر اسم میر انیس صاحب کے قریب قریب بغیر لفظ مرزا کے صرف دبیر کا لفظ لانا بھی میرزا صاحب کے معتقدوں کو سخت ناگوار ہوا ہے۔ اور ٹائٹل پیج ہی سے مولوی صاحب کے دلی منشا کو ظاہر کر دیا ع می تراود و چکنم آنچہ در آوند من ہست ۱۲ مؤلف حقیر۔

سخت زبانی

بھی عذر کرتے۔ مگر افسوس کہ اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور بجائے اس کے مرزا صاحب کے حق میں سخت زبانی سے کام لیا۔ اور سفیہانہ وعامیانہ وغیرہ وغیرہ الفاظ مرزا صاحب کی شان میں استعمال کئے۔ جو مرزا صاحب کی شان سے تو کیا خود مولوی صاحب کی شان سے بھی بہت بعید ہیں۔ جن کی تفصیل آئندہ آتی ہے۔ ازبسکہ طُول ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اب مَیں مولوی صاحب کی عبارت اعتراض کو ذرا مختصر کرکے لکھُونگا۔ اور جواب میں بھی اختصار کا خیال رکھُونگا +

فصل ۵ مقابلہ کلام

(۵) دبیر ؎ یُوں متصل رسن سے بندھے تھے وہ دلفگار۔ رشتہ میں جیسے دانہ تسبیح آبدار +

انیس۔ گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن۔ جس طرح رشتہ گلدستہ میں گلہائے چمن + صفحہ ۲۸۵ پر دونوں شعروں کو (بالمقابل) لکھ کر مولوی صاحب

اعتراض

لکھتے ہیں۔ کہ "تسبیح کے دانے رشتے میں بندھے ہُوئے نہیں ہوتے۔ بلکہ پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا صاحب کے یہاں آبدار کا لفظ محض فضول وبیکار

جواب

ہے" + میں کہتا ہُوں۔ کہ جس طرح اہلبیت اطہار ایک کے بعد دُوسرے رسّی میں بندھے ہُوئے تھے۔ اس کی تشبیہ تامہ تسبیح سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تشبیہ بھی مرزا صاحب کے یہاں موجود ہے۔ وہ (فرماتے ہیں) جناب رسول خدا صلعم سے خطاب کرکے عرض کرتے ہیں۔ ؎

تشریح تشبیہ گلدستہ و تسبیح

فریاد کہ پیارے ہُوئے مقتول تمہارے گلدستہ کی مانند بندھے پھُول تمہارے

مگر تشبیہ گلدستہ کی تسبیح کو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ گلدستہ میں ایک ہی جگہ پھُولوں کا جھگھٹا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ سے (یکے بعد دیگرے) وہ نہیں بندھے ہوتے۔ اب یہ بھی سُنئے کہ تشبیہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ جزئیات میں بھی مطابقت ہو۔ بہادر کو جو شیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اُس کے لئے یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ بہادر گوشت کے

سوا اور کچھ کھاتا ہی نہ ہو۔ یا اُس کے پنجے اور ناخن بھی ایسے ہوں جیسے شیر کے۔ پس گلدستہ کی تشبیہ بھی صحیح ہے۔ اور تسبیح کے دانوں کا ڈورے میں پرو یا ہونا عین بندھنا ہے۔ کہ وہ سب ڈورے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ڈورہ ٹوٹ جائے تو دانے بکھر جائیں۔

لفظ آبدار

مولوی صاحب یہ کیا آپنے فرمایا۔ کہ آبدار کا لفظ محض فضول و بیکار ہے۔ کیا آپ کے فرمانے سے بیکار و فضول ہو جائیگا۔ تسبیح عقیق البحر کی ہو یا خاک شفا یا زیتون یا لکڑی کی۔ عام طور پر دانوں پر آب اور جلا ہوتی ہے۔ اس کے قطع نظر آبدار کی یہاں یُوں ضرورت ہے۔ کہ اہلبیتؑ اطہار کو مصنف نے ایسی تسبیح سے تشبیہ دی ہے۔ جو آبدار ہو۔ آب کے معنی عزت کے بھی ہیں۔ یہ بھی اشارہ ہے۔ کہ راہ خدا میں اسیر ہونے سے اہلبیتؑ کی خداداد عزت میں فرق نہیں آیا۔ وہ ویسے ہی صاحب عزت اب بھی ہیں۔ تسبیح کے دانوں پر بھی آپنے اعتراض جما دیا۔ اور آبدار ہونا آپ کو ناگوار گذرا۔ سُنئے جناب! یہ تسبیح کسی زاہد ریائی کی نہیں ہے۔ جس کی شان میں ایک ایرانی شاعر کہتا ہے ؎

زاہد چہ بلائی تو کہ ہر دانۂ تسبیح   از خوف تو سوراخ بسوراخ گریزد

یہاں دانہ ہائے تسبیح میں ایک تلمیح لطیف اہل بیتؑ کے گریہ وزاری سے بھی ہے۔ جب آپ کو ہمارے ساتویں اور آٹھویں امام کا حال معلوم نہیں۔ تو آپ ہمارے خصوصیات کو کیا سمجھینگے۔ وہ تلمیح یہ ہے۔ کہ جس طرح تسبیح کے دانوں کے دل فگار ہوتے ہیں۔ اہلبیتؑ اطہار کے مقدس قلوب بھی محض خدا کے واسطے فگار تھے۔

لفظ تسبیح ... ...

مولوی صاحب نے اس موقع پر پُورا بند مرزا صاحب کا نہیں لکھا۔ جس سے اُن کی قوت دماغی کا زور اور تخئیل کا کمال معلوم ہوتا۔ خیر۔ ناظرین! پُورا بند مجھ سے سُنئے:۔

یُوں متصل رسن سے بندھے تھے وہ دلفگار   رشتے میں جیسے دانۂ تسبیح آبدار
اور سب کے پیش پیش امام فلک وقار   عابدؑ کی یہ دلیل امامت تھی آشکار
شبیح کا اُس رسن کو شرف لاکلام ہے   جس کا امام دونوں جہاں کا امام ہے

کلام کی خوبیاں

اب غور سے باقی خوبیاں بند کی دیکھئے۔ تسبیح میں امام ہوتا ہے۔ جس کو پیش اور پیش امام اور امام کہتے ہیں۔ خواجہ وزیر صاحب کا مشہور مصرع ہے ع شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں۔ مرزا صاحب کا کمال دیکھئے۔ امام پیش امام پیش سب الفاظ نہایت بے تکلفی سے نظم فرما گئے۔ پھر تسبیح کے ذکر میں عابدؑ کا لفظ دیکھئے۔ جو خاص لقب مشہور امامؑ چہارم کا ہے۔ اُس کے ساتھ دلیل کی لطیف لفظ ملاحظہ فرمائیے۔ دلیل کے معنی راہ نما کے بھی ہیں۔ امام زین العابدینؑ کی تشبیہ امام سے اور باقی اہلبیتؑ کی تشبیہ تسبیح کے دانوں سے دے کر ایسا بلیغ مضمون ادا فرمایا ہے۔ کہ سبحان اللہ جسکی سوا دصرف وہ پاک دل دانا دے سکتے ہیں۔ جن کے دل بے جا طرفداری سے پاک وصاف اور خدا کی یاد سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں میر صاحب کا بھی پورا بند لکھ دیتا۔ مگر اس وقت میرے پاس وہ مرثیہ نہیں ہے جس میں یہ بند ہے۔ میں میر صاحب کے کلام کی بھی دل سے داد دیتا ہوں۔ کہ اپنے رنگ میں وہ تشبیہ بھی اچھی ہے۔ اور دونوں کاملوں کے کلام "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست" کے مصداق ہیں۔ مرزا صاحب کو مولوی شبلی صاحب نے بے جا گھٹا دیا تھا۔ اس لئے مجھے اتنا انہیں سمجھانا پڑا +

تقابل کلام میر و مرزا در تحکیم شبلی صاحب برق و مبارزان

(۹) صفحہ ۲۸۴ پر مولوی شبلی صاحب نے یہ دونوں شعر دونوں صاحبوں کے لکھے ہیں :-

انیسؒ	دبیرؒ
اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے ستمگاروں کی	گرد عباسؑ کے کثرت تھی ستمگاروں کی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی	منہ تو تیروں کا تھا اور برق تھی تلواروں کی

جواب

اور پھر شان تحکم کو دکھایا اور مرزا مرحوم کو ان لفظوں میں گھٹایا ہے۔ کہ میر انیس کے شعر سے اس کو کچھ نسبت نہیں۔ صفائی و برجستگی کے علاوہ چمکنے کے جملہ فعلیہ نے جو حالت پیدا کی۔ وہ "برق تھی" سے کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ اب میں کہتا ہوں۔ کیوں

نہیں پیدا ہوسکتی۔ برق کے لفظی معنی چمکنے کے بھی ہیں۔ یہی تو کمال اختصار شان بلاغت دکھا رہا ہے۔ (مینہ تو تیروں کا تھا اور برق تھی تلواروں کی) کہ ایک ہی مصرع میں دونوں حالتیں مینہ برسنے اور بجلی چمکنے کی پیدا ہوگئی ہیں* قبلہ! اس آپکے تحکم کو کوئی منصف مزاج نہیں مان سکتا۔ حق یہ ہے۔ کہ دونوں شعر اچھے ہیں۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہے + مولوی صاحب نے اس کے ساتھ مرزا صاحب کا ایک اور شعر دوسرے بحر کا لکھ دیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

یکنشد
دو شد

رن میں جو گھرا ابر غلیظ اہل سقر کا — بجلی سا کڑکنے لگا کرکیت عمر کا

اور پھر لکھا ہے۔ کہ "یہ شعر بالکل بھدا اور بدترکیب ہے" +

جواب

میں کہتا ہوں۔ کہ جناب اخدا جس کا دماغ شاعری کے کام کا بنا تا ہے۔ وہی ان باریکیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اور جس دماغ و طبیعت میں یہ مادہ و قوت ہی نہیں۔ اُسے ایسے ایسے اعتراض سوجھتے ہیں۔ بیت آخر الذکر میں کوئی سبب ثقاہت و تنافر کا نہیں ہے۔ مضمون بھی اعلےٰ درجہ کا ہے۔ جب زیادہ گھرا ہوا بادل ہو۔ تو اُس کو ابر غلیظ ہی بولتے ہیں۔ اب فرمائیے۔ اُن قاتلان امام حسینؑ کے واسطے غلیظ کا لفظ کیسا مناسب و موزون ہے۔ اور ابر غلیظ میں بجلی کے چمکنے کی بہار ہوتی ہے۔ اور کرکیت کا میدان جنگ میں کڑکنا۔ اور بجلی کا چمکنا اور کڑکنا۔ یہ سب کیسی عمدہ تشبیہیں اور استعارے اور کیسے دلچسپ محاورے ہیں۔ آپکے فرمانے سے میں اس بیت کو بھدا اور بدترکیب کب مان سکتا ہوں۔ البتہ کچھ تو نہیں ہے برائے نام آپکے مذاق کے خلاف ہے۔ سو اس کا علاج نہ مرزا صاحب کے پاس تھا۔ نہ میرے پاس ہے۔ بقول شاعر

*۔ بارش میں ہر بوند کی شکل مثل تیر کے معلوم ہوتی ہے۔ اور اُس میں بجلی کا شعلہ جوالہ العینہ ایسا نظر آتا ہے۔ کہ جیسے چمکدار تلوار کو سرعت سے پھرایا جائے۔ کیسی عمدہ تصویر شعر میں پیدا ہوگئی ہے۔ اور لڑائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ گیا ہے۔ کہ سبحان اللہ پھر اُس کے ساتھ مینہ: اُر سندش کی سونے پر سہاگہ ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

خاطر یک دو کس از از تو شود شاد بس ست
زندگانی بہوائے ہمہ کس نتواں کرد

(۷) صفحہ ۲۸۳ پر بالمقابل میر و مرزا کے یہ دو شعر لکھے ہیں:۔

قول شبلی صاحب

میر صاحب	مرزا صاحب
یوں رُوح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے	یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے	جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں

مرزا صاحب پر اعتراض

اور تحکم فرمایا ہے۔ کہ "بندش کی صفائی و برجستگی نے میر انیس صاحب کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ **صاحب مکان** کی تخصیص بیکار ہے۔ زلزلہ آتا ہے۔ تو ہر شخص مکان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ جسم رعشہ دار کی ترکیب نا مانوس ہے۔ اور اس قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ کہ صرف اُن لوگوں کی رُوحیں نکلیں۔ جن کے جسم رعشہ دار تھے"۔

میر صاحب پر اعتراض

اب مرزا صاحب کے بعد میر صاحب پر مولوی صاحب ڈھلے اور جھکے ہیں۔ فرماتے ہیں "میر صاحب کا پہلا مصرع بھی کچھ اچھا نہیں۔ سر کا لفظ بالکل حشو بلکہ موقع کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ رُوح سر میں نہیں رہتی۔ نہ سر سے اسکو کوئی خصوصیت ہے"۔

جواب اعتراض مرزا صاحب

مَیں مختصر لفظوں میں عرض کرتا ہوں۔ کہ **ناظرین!** اوّل مرزا صاحب کا پورا بند سُنئے۔ جس کو کتر بیونت کر کے مولوی صاحب نے غارت کرنا چاہا ہے۔

ابرو کی شکل تھی خم **شمشیر** سے عیاں	چلتے ہی رن میں بندھ گیا بھونچال کا سماں
یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں	جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں
حیرت سے بعضے خاک کا پیوند ہو گئے	واں تو نصیب سو گئے یاں پاؤں سو گئے

تشریح بھون اور بھونچال کی

ابرو بھون کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ تلوار میں بھون کی شکل تھی۔ تلوار کے چلنے میں رن میں بھونچال کا سماں بندھ گیا۔ بھونچال میں ہر چیز کانپتی ہے۔ دشمنوں کے جسم بھی بھونچال اور خوف سے کانپ رہے تھے۔ جانیں اس طرح بھاگیں کہ جیسے زلزلے میں مکان کو چھوڑ کر

صاحب مکان یعنی اُس کے موجودہ آدمی بھاگ جاتے ہیں۔ صاحب مکان سے وہی لوگ مراد ہیں۔ جو اُس مکان میں ہوں۔ پھر خدا جانے۔ صاحب مکان کی تخصیص میں کیا حرج ہے۔ جو مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ تخصیص بیکار ہے۔ جو شخص مکان کو چھوڑ کر زلزلے میں بھاگتا ہے۔ اُسی کو مرزا صاحب صاحب مکان کہ رہے ہیں۔ اور بندش کی صفائی اور برجستگی کی داد وہ اردو کے شعراء دے سکتے ہیں۔ جو اہل زبان یا زبان دان ہیں اور سمجھتے ہیں۔ جسم رعشہ دار سے جان نکلنے کی تشبیہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ہلتے ہوئے مکان سے ساکنان مکان کا بھاگ کر مکان کو سونا کر جانا بعینہ ایسا ہے۔ کہ جیسے جان اپنے مکان یعنی جسم کو چھوڑ کر روانہ ہو جائے۔ روان کا لفظ بھی نہایت لطیف ہے۔ کہ روان کے معنی جان کے بھی ہیں۔ اور ماہران علم طب واقف ہیں۔ کہ مرنے کے وقت ہر شخص کو رعشہ لاحق ہوتا ہے۔ کہ رعشہ موت کی علامت ہے۔ ایک شعر میں کتنی خوبیاں ہیں۔ اور بھونچال سے شدت جدال وقتال اور میدان جنگ کا تہ وبالا ہونا نکلتا ہے۔ جسم رعشہ دار کی ترکیب بھی ہرگز نامانوس نہیں ہے۔ رات دن بولتے ہیں۔ اور بیشک اُن لوگوں کی روحیں فوراً نکل کر بھاگیں۔ جو (بزدلی) بھونچال اور خوف کے مارے کانپ رہے تھے۔ ایک جماعت تو یہ کانپنے والوں کی ہوئی۔ دوسری اُن حیرت زدہ آدمیوں کی حالت بیان کی ہے۔ جو حیرت سے خاک کا پیوند وزمین گیر ہو گئے۔ اُن کے بارہ میں فرماتے ہیں۔ کہ اُدھر تو نصیب سو گئے۔ اِدھر پاؤں سو گئے۔ پاؤں سو جانا روزمرہ ہے۔ سُن ہو جانے کے معنی پر بولتے ہیں۔ دیکھئے ایک بند میں کتنا بڑا مضمون باندھ دیا ہے۔ یہ کمال بلاغت نہیں تو کیا ہے؟ اب میر صاحب پر جو آپ نے عنایت فرمائی ہے۔ اُس کا جواب سُن لیجئے۔ سر کا لفظ نہ حشو ہے نہ غلط۔ بلکہ موقع کے لحاظ سے بہت ضروری وصحیح ہے۔

جواب اعتراض برصاحب

میر صاحب کی مراد یہ ہے۔ کہ جب تلوار نے جسم پر سے سر (دشمن کا) اُڑا دیا۔ تو روح کے طائر جو سر اور بدن میں پھڑک رہے تھے۔ وہ اس طرح فوراً سر اور بدن کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

میر صاحب کا مصرع توڑ مروڑ کے (یعنی الفاظ بدل کر) دکھایا ہے۔ جس کو میں آئندہ سلسلہ کلام میں بیان کرونگا۔ اوّل یہ سُنئے۔ کہ مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ "دونوں مصرعوں کی شُستگی و برجستگی و صفائی میں جو فرق ہے۔ وہ ایک بچّہ بھی سمجھ سکتا ہے"۔ میں افسوس سے عرض کرتا ہوں۔ کہ بچّے تو کیا آپ ہی نہیں سمجھ سکتے۔ اگر آپ کو موازنہ و مقابلہ ہی منظور تھا۔ تو کم سے کم ایک ایک شعر تو لکھتے۔ مصرع کا کیا موازنہ۔ ایک مصرع جب تک دوسرے مصرع کے ساتھ ملا کر نہ پڑھا جائے۔ اُس کا حسن و قبح نہیں معلوم ہو سکتا۔ بلکہ عربی میں (کہ جس شاعری کے تابع فارسی و اردو کی شاعری ہے) تو یہاں تک جائز ہے۔ کہ شاعر ایک لفظ کے دو ٹکڑے کر کے ایک جزو مصرع اوّل میں دوسرا مصرع ثانی میں لے آئے۔ جیسا کہ جناب امیرؑ کے اس شعر میں ہے ؎

وردالیوم ناصحابینذر النا   س جیوش کالبحر ذی الامواج

اس شعر میں لفظ "النّاس" کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں۔ "النّا" مصرع اوّل میں اور حرف "س" مصرع ثانی میں آیا ہے۔ فارسی و اردو میں اتنی آزادی تو نہیں ہے۔ مگر ہاں مبتدا ایک مصرع میں اور خبر دوسرے میں لانا یہاں بھی جائز و رائج ہے۔ گو ہمیشہ اور ہر شاعر ایسا نہیں کرتا*۔ بہرحال دونوں مصرعوں کے پڑھنے سے مطلب بھی صاف سمجھ میں آتا ہے۔ اور حسن و قبح بھی کھلتا ہے۔ اس لئے اوّل میں دونوں صاحبوں کے پورے پورے صحیح شعر لکھتا ہوں۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہو جائیگا۔ کہ میر صاحب کے شعر کو مولوی صاحب توڑ مروڑ کر مقابلہ و موازنہ کو لائے ہیں:۔

* بالخصوص خاندان جناب شیخ ناسخ مرحوم میں اس کی بہت احتیاط رکھی جاتی ہے۔ اور اب اور بعض شعراء اردو بھی خیال رکھتے ہیں۔ مگر ذوق و مومن و غالب و دبیر و انیس کے یہاں کہیں کہیں مبتدا ایک مصرع میں اور خبر دوسرے میں ملتی ہے۔ وہ اساتذہ اس کے جواز کے شاید حامی تھے۔ اب جتنی پابندیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اُتنی ہی اردو کی شاعری گھٹتی جاتی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

روح

کہ جیسے ہر انسان بھونچال میں اپنا مکان چھوڑ کر جان بچا کر بھاگتا ہے۔ رُوح کا گھر آدمی کا تمام جسم ہے ع سر میں بھی رُوح رہتی ہے دھڑ میں بھی رہتی ہے۔ خدا جانے یہ کس فلسفہ کی بنا پر ارشاد ہوتا ہے۔ کہ رُوح سر میں نہیں رہتی۔ نہ مضامین شاعرانہ کی بنا کسی فلسفہ خاص پر قائم ہے۔ نہ شاعر اس بات پر مجبور ہے۔ کہ جو فلسفی کہے۔ اُس کے خلاف نہ کہ سکے* اگر فلسفی کے اقوال کی بنا پر شاعروں کے کلام کی تنقید کی جائے۔ تو کوئی شاعر نقص سے خالی نہ رہیگا۔ اس بحث کو اگر آپ مجھ سے نہیں سُننا چاہتے۔ تو جناب مفتی میر عبّاس صاحب شوستری اعلی اللہ مقامہ سے سُنئے۔ کہ اُن جناب کا یہی ارشاد میں اس کتاب میں ایک جگہ نقل کر چکا ہُوں۔ مولوی صاحب! یہ بھی آپنے اُلٹی کہی۔ کہ رُوح سر میں نہیں رہتی۔ سر تمام جسم میں سردار ہے۔ پس فیصلہ تو سر امر کا وہی کرتا ہے۔ اور خیر سلّا (خیر وصلاح) سے حکماء میں آج تک رُوح کی بابت اتفاق ہی نہیں ہُوا ہے۔ کہ وہ در اصل کیا چیز ہے۔ اور کہاں اور کیونکر رہتی ہے۔ شاعر تو مشاہدہ کا قائل ہے۔ جب سر کٹنے کے بعد وہ سر اور دھڑ کو الگ الگ پھڑکتا ہُوا دیکھتا ہے۔ تو یہی سمجھتا ہے۔ کہ رُوح دونوں مقاموں میں تھی۔ اب بھاگ رہی ہے سبحان اللہ کیسی عمدہ تشبیہ ہے۔ جس کو مولوی شبلی صاحب نہیں سمجھتے۔ اور زبردستی لفظ سر کو حشو اور غلط بناتے ہیں۔ اور اس فہم عالی پر دبیرؒ و انیسؒ میں موازنہ فرماتے ہیں۔ اُن کے کلام کو تو سمجھتے ہی نہیں۔ اُن کے کلام میں موازنہ و محاکمہ کیا کر سکتے ہیں*

(۸) صفحہ ۲۸۴ پر ایک ایک مصرع حسب ذیل دونوں بزرگواروں کا لکھا ہے:۔

مرزا صاحب	میر صاحب
کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں

اصل اصول مضامین شعر

*تحقیقات جدید فلسفہ سے کبھی کبھی پُرانی تحقیق رد ہو جاتی ہے جیسے کہ آجکل فلسفہ جدید نے بعض مضامین فلسفہ قدیم کو غلط ثابت کیا ہے تو شعرا کے کلام اگر فلسفیوں کے کلام کے تابع ہوں۔ تو آئے دن غلط ثابت ہُوا کریں شعرا کے کلام اکثر عام خیالات کے موافق ہوتے ہیں شاعر کو اس سے بحث نہیں کہ وہ خیال غلط ہے یا صحیح + ۱۲ مؤلف حقیر

تشریح

میر صاحب	مرزا صاحب
قیمت نہ دے سکا کوئی جس کی حجاز میں	کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں
سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں	آیہ نہ آیا مثلِ علیؑ مدح جود میں

میر صاحب کی بیت کا تو یہ مطلب ہے۔ کہ جناب امیرؑ نے وہ بے بہا انگوٹھی نماز پڑھتے میں سائل کو دے دی۔ جس کی قیمت تمام ملک حجاز میں کوئی شخص نہیں دے سکتا تھا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جب جناب امیرؑ حالت رکوع میں سائل کو انگوٹھی عطا فرما چکے۔ تو ان کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی انگوٹھیاں (کسی نے رکوع میں کسی نے سجدے میں) دینا شروع کیں۔ مگر جس طرح آیہ (اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ) آیا تھا۔ اور خدا نے سخاوت جناب امیرؑ کو سراہا تھا۔ اُن منافقوں کی شان میں کوئی حرفِ مدح قرآن میں نہ آیا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دیکھو ریا کاری بُری چیز ہے۔ دکھاوے کا دینا کچھ کام نہیں آتا۔ اعمال ریائی بیکار جاتے ہیں*۔ دونوں بزرگوں کا مفہوم جدا جدا ہے۔ میر صاحب نے نہایت سلاست و فصاحت سے اپنا مطلب ادا فرمایا ہے۔ مرزا صاحب نے شان بلاغت دکھائی ہے۔ آیہ ایک جگہ آیت کے معنی پر لائے۔ دوسری جگہ آیا صیغہ ماضی ہے۔ تجنیس لفظی کی یہ صنعت ہے۔ دوسری صنعت شبہ اشتقاق کی یہ ہے۔ کہ جود و سجود ایک دوسرے

لطیفہ

* حکایت لطیفہ۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں آغا احمد علی خاں مرحوم کے مکان پر زمانۂ چہلم کی ایک مجلس میں میر محمد شاہ صاحب مرحوم محدث مشہور و مقبول یہی روایت برسر منبر بیان فرما رہے تھے کہ اوروں نے بھی انگوٹھیاں دیں۔ مگر بجز جناب امیرؑ کے اور کسی کی مدح خدا نے قرآن میں نہ کی۔ ایک کشمیری (نقال) بولا کہ حضت (حضرت) وہ اوروں کی انگوٹھیاں ملمع کی ہونگی۔ سب مجلس ہنس پڑی۔ ملمع کے لفظ پر اور اس کے مقصد تلمیح پر خیال فرمائیے۔ لکھنؤ کے معمولی آدمیوں کی یہ ذہانت تھی یہ سب علم کی برکت تھی۔ جو شاہی زمانے کا اثر چلا آتا تھا۔ ریاکاری کی تصویر روشن گویا لفظ ملمع دکھا رہا ہے۔ کہ وہ دیکھنے کو اوپر سے کچھ ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں کچھ اور ہی ہوتا ہے یہی ریا کا نقشہ ہے ۔۱۲ مؤلف حقیر۔

سے بظاہر مشتق معلوم ہوتے ہیں۔ (سجود کا سین اُڑا دو۔ تو جود رہ جائے)۔ حالانکہ دراصل یہ دو لفظ جدا جدا ہیں۔ جود سخاوت کے معنی پر ہے۔ اور سجود سجدہ کے معنی پر ہے۔ الحاصل دونوں صاحبوں کی ٹیپیں اچھی ہیں (خدا جزائے خیر دے)۔ اور ایک کو دُوسرے پر ترجیح نہیں۔

؎ ہر گلے را رنگ و بُوئے دیگر ست ؞

اعتراض مولوی شبلی صاحب

(۹) صفحہ ۲۸۴ پر مولوی صاحب نے دونوں صاحبوں کی حسب ذیل ایک ایک بیت لکھی ہے:۔

انیسؒ	دبیرؒ
سب نشہ غرور جوانی اُتر گیا تلوار تھی۔ کہ حلق سے پانی اُتر گیا	کس آب و تاب سے یہ سرِ فوج پر گئی پانی کا گھونٹ بن کے گلے سے اُتر گئی

ایراد و جواب

اس کے بعد مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "دونوں شعروں کا فرق بھی ظاہر ہے"۔ مَیں کہتا ہُوں۔ دونوں شعر اچھے ہیں۔ کچھ بھی ایسا فرق نہیں۔ جس کی بنا پر ایک شعر کو دُوسرے پر ترجیح دی جائے۔ میر صاحب کے یہاں صاف صاف لفظوں میں مضمون بیان ہُوا ہے۔ مرزا صاحب کی بیت میں آب و تاب میں رعایت لفظی ہے۔ کہ آب پانی کے معنی پر بھی آتا ہے۔ دُوسرے مصرع میں پانی کے ساتھ گھونٹ کی لفظ بھی ہے۔ اور یہ بھی روزمرہ ہے۔ کہ پانی کا گھونٹ گلے سے اُتر گیا۔ زبان بھی دونوں کی فصیح۔ حسن بیان بھی قابل تعریف ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۸۵ پر جو اشعار بالمقابل دونوں بزرگواروں کے لکھے ہیں۔ وہ یہاں بخوف طوالت مَیں نہیں لکھتا۔ کہ دونوں کے اشعار اچھے ہیں۔ البتّہ یہ لکھنا میرا فرض ہے۔ کہ مولوی صاحب نے ایک شعر مرزا صاحب کا اپنی خوش فہمی یا اور کسی سبب سے غلط لکھ دیا ہے۔ وہ شعر یُوں لکھا ہے ؎ روشن پدر کا زور ہے دُنیا و دین پر ششدر تھے جبرئیل کٹے جب کہ تین پر۔ صحیح یُوں ہے ؎

تصحیح

روشن پدر کا زور ہے دُنیا پہ دین پر ششدر تھے جبرئیل کٹے جب کہ تین پر

کیونکہ "دنیا و دین" میں جب عطف واقع ہوگا۔ تو پھر اعلان نون کا ناجائز ہوگا۔ یہ مرثیہ مرزا صاحب کا درمیانی زمانہ شاعری کا ہے۔ ابتدائی کلام میں اُن کے یہاں کہیں کہیں بحالت عطف و اضافت اعلان نون ضرور ہے۔ جیسا کہ میں ایک جگہ مفصل لکھ چکا ہوں۔ مگر جس زمانہ کا یہ مرثیہ ہے۔ اُس زمانہ میں وہ اس قاعدہ کی پابندی کر چکے تھے۔ اس لئے جس طرح میں نے عرض کیا۔ اُسی طرح صحیح ہے۔ اور اسی طرح دفتر ماتم کی آٹھویں جلد میں (صحیح) چھپا بھی ہے +

(۱۰) صفحہ ۲۸۲ پر حسب ذیل میرؔ و مرزاؔ کی ایک ایک بیت مولوی صاحب نے لکھی ہے:۔

میر صاحب	مرزا صاحب
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی	چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زمین پر
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی	گردوں کی ڈھال چیر کے رکھ دوں زمین پر

اُس کے بعد لکھا ہے۔ کہ "مرزا صاحب کے شعر کا پہلا مصرع نہایت بدترکیب ہے۔ اس کے علاوہ ایک اُنگلی سے چیرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ کھونچہ دینا ہوتا ہے۔ ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے زیادہ موزون ہے"

میں کہتا ہوں۔ چیرنا اردو میں شق کرنے کے معنی پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضور صلعم (روحی لہ الفدا) نے ایک اُنگلی کے اشارہ سے چاند کو چیر (یعنی شق کیا) تھا۔ مولوی صاحب! یہ کیا ارشاد فرمایا۔ کہ ایک اُنگلی سے چیرنا نہیں ہوتا۔ آپ مہربانی فرماکر ایک گیلہ پاپڑ یا ایک گیلی چپاتی لائیے۔ (جو توے پر ڈالنے سے پہلے گیلی ہوتی ہے) ایک اُنگلی سے ایک بچہ بھی اُس کو چیر دیگا۔ اس کو چیرنا ہی کہینگے۔ کھونچہ دینا کوئی اہل زبان ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ آپ کی زبان دانی کی قلعی اسی ایک لفظ میں کھل گئی۔ کھونچہ دینا اس موقع پر کبھی کہیں نہیں بولتے۔ یہ بالکل آپ خلاف روزمرہ بولے ہیں۔ کھونچہ تو لباس۔ دامن وغیرہ میں جو از خود لگ جاتا ہے۔ اُس کو بولتے ہیں۔ کھونچہ کوئی لگاتا نہیں

ڈھال کی تشبیہ آسمان سے

اعتراض مرزا صاحب پر ایراد مولوی شبلی صاحب

جواب اعتراض

مولوی شبلی صاحب اور محاورہ کی غلطی

کھونچہ دینا کہیں نہیں بولتے معاورہ نہیں

کوچہ لگانا اور کوچہ دینا محاورہ سے مشیر لکھنوی

کھونچہ ہمیشہ لازمی آتا ہے متعدی آتا ہی نہیں۔ اور جو انگلی اور برچھی وغیرہ سے لگاتے ہیں

اُس کو کوچہ بولتے ہیں۔ وہ دُوسرا لفظ ہے۔ سند میں جناب مشیر لکھنوی علیہ الرحمہ

کا مصرع پیش کرتا ہوں ؎ کیا پھولی تافتاں پہ کوچہ لگایا ہے ٭ جو نرز گوار

کھونچہ اور کوچہ کے فرق و محل استعمال و لازمی و متعدی ہونے کو نہیں

سمجھتے۔ وہ دبیر و انیس میں کیا انصاف کر سکتے ہیں۔ شجاعان ازلی (خاصان خدا) کی یہ

خداداد طاقت کا بیان ہے۔ کہ وہ اس طرح آسمان کی ڈھال ایک انگلی سے چیر سکتے ہیں جیسے

ایک بچہ پاپڑ اور چپاتی کو چیر سکتا ہے۔ یہ جو ارشاد ہوا۔ کہ پہلا مصرع نہایت بدترکیب

ہے۔ یہ آپ کی زبردستی اور سینہ زوری ہے۔ ہرگز مصرع مذکور بدترکیب نہیں۔ اور

ڈھال کی تشبیہات آفتاب اور آسمان دونوں کے ساتھ صحیح ہیں۔ کہ ڈھال بھی گول ہے۔

آسمان و آفتاب بھی گول نظر آتے ہیں۔ لیکن آسمان کے ساتھ تشبیہ میں چار وجہ

شبہ ہیں۔ (۱ و ۲) آسمان کی گلائی (گولائی) خم کے ساتھ۔ (۳) آسمان کے

ستاروں سے ڈھال کے پھولوں کی تشبیہ۔ (۴) رنگ کے اعتبار سے۔ کہ آسمان

بھی ازرق (نیلا) رنگ ہے۔ جو قریباً ڈھال کا رنگ ہے۔ اور آفتاب کے ساتھ اُس

کی تشبیہ صرف ظاہری گولائی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی آفتاب کی مد اصل کروی شکل ہے

مگر بظاہر مثل سپر کے گول نظر آتا ہے۔ اس لئے تشبیہ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ تشبیہ کے واسطے

فرہنگ آصفیہ

٭ اس موقع پر مجھے خیال آیا۔ کہ مولوی شبلی صاحب کھونچے اور کوچے کے بارے میں شاید میرے کہنے اور مشیر مرحوم کی نظیر کو نہ مانیں۔ اس لئے میں دونوں لفظوں کو فرہنگ آصفیہ جناب سید احمد صاحب دہلوی سے لکھ دوں۔ جو ایک مستند دہلوی اہل زبان کی تالیف جدید و مختصر ہے۔ (۱) فرہنگ آصفیہ جلد سوم مطبوعہ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵۸ کوچا۔ اسم مذکر کچو کا۔ کسی نوکدار چیز یا تلوار وغیرہ کا زخم تھوڑا سا جو آر پار نہ ہوا ہو۔ (کوچا دینا) (ہندی) فعل متعدی۔ چبھونا۔ نیزہ وغیرہ کی نوک گھسیڑنا۔ گودنا۔ کچوکنا۔ (۲) صفحہ ۲۳۹۔ کھونچا۔ (ہ) اسم مذکر بڑی کھونچ۔ (کھونچ) ہندی مؤنث اسم۔ کیل یا کانٹے وغیرہ سے جو اُلجھ کر کپڑا پھٹ جائے۔ اُس پھٹی ہوئی جگہ کو کھونچ کہتے ہیں۔ کھونچ آنا یا لگنا فعل لازم ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ہر اعتبار و ہر صورت سے مشابہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اب آپ کے فہم عالی میں آیا۔ کہ مرزا مرحوم کا کلام کس قدر بلاغت کے پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ جس بلاغت کو آپ کہتے ہیں کلام دبیر میں نام کو نہیں ہے۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس +

(۱۱) اسی صفحہ ۲۸۲ پر مولوی شبلی صاحب نے میر صاحب کا ایک مصرع اور مرزا صاحب کا شعر لکھ کر دکھایا ہے:-

انیس رح	دبیر رح
چلنے میں نیزے کانپتے تھے شل پائے پیر	دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند
	تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کی مانند

پھر فرماتے ہیں۔ کہ "میر صاحب کا مصرع فصیح و صاف ہے۔ ان الفاظ سے "کانپتے تھے" جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے۔ وہ "رعشہ" کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک چلنے کی قید مذکور نہ ہو۔ پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں۔ اس کے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزے دونوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزے چلانے کی حالت میں نیزے کو لچک ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا۔ نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب نے چونکہ نیزے کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا" +

اب میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب! یہ عذر بھی آپ کا نہیں چل سکتا۔ مرزا صاحب کے مصرع اوّل میں بھاگنے کی لفظ موجود ہے۔ یعنی ع دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند۔ اور ان جوانوں کے ہاتھوں میں جو نیزے تھے ان کو

فصل پنجم نیزوں کی لچک اور رعشہ

ایراد مولوی شبلی صاحب

جواب رعشہ و نیزہ

قدم پیر کی مانند رعشہ تھا۔ اوّل تو تیر کی مانند بھاگنا خاص روزمرّہ ہے۔ دُوسرے جب بھاگتے تھے۔ تو جنبش و حرکت وغیرہ جتنے لوازم بھاگنے کے ہیں۔ وہ سب سامع سمجھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ کودن نہ ہو۔ پھر یہ کیا اعتراض فرمایا۔ کہ مرزا صاحب نے نیزے کی جنبش و حرکت کا ذکر نہیں کیا۔ اور کس طرح ذکر کرتے۔ آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ تو مرزا صاحب کا کیا قصور ہے۔ ؎

فہم سخن تا نکند مستمع قوت طبع از متکلم مجوئے

اور یہ جو ارشاد ہوا ہے۔ کہ بُوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں۔ اوّل تو یہ ادّعا بھی غلط ہے۔ کیونکہ رعشہ ہوگا۔ تو بغیر چلنے کے بھی کانپینگے۔ دوم جب بھاگنے کا ذکر کردیا۔ تو چلنا تو خود بخود آگیا۔ اور جب آدمی بھاگینگے۔ تو اُن کے ہاتھ میں نیزے ضرور ہلتے ہُوئے جا ئینگے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔ کہ نیزوں کو قدم پیر کی مانند رعشہ تھا جب چلنے کی حالت میں نیزے کو لچک ہوتی ہے۔ تو بھاگنے میں زیادہ ہوگی۔ بہرحال میر صاحب کا مصرع بھی اچھا ہے۔ مرزا صاحب کی ہیبت بھی اچھی ہے۔ میری سمجھ میں کسی کلام کو اس موقع پر (دُوسرے کلام پر) ترجیح نہیں ہے۔ ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ اور دونوں فصیح ہیں۔ بندش بھی دونوں کی اچھی ہے۔ اور جو تصویر "کانپتے تھے" سے کھنچ جاتی ہے۔ وہی "رعشہ" سے اور "بھاگتے تھے" سے کھنچ جاتی ہے۔ پھر کیونکر ایک کو دُوسرے پر ترجیح ہوسکتی ہے *

(۱۲) پھر اسی صفحہ ۲۸۳ پر اپنی عادت کے موافق دونوں صاحبوں کے (ایک ایک مصرع) حسب ذیل دو مصرع مولوی صاحب مقابلۃً لکھتے ہیں:۔

انیسؔ	دبیرؔ رح
ہوگیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش	چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں

اور لکھتے ہیں۔ "جلاجل کے دونوں حصّے جو بجانے میں مل جاتے ہیں۔ اس کی تعبیر دونوں

شکایات صاحب
ابیات مولوی

بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جلاجل چلّا کر الاماں کہتا تھا۔ اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلّانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلّق نہیں۔ اس لئے گو تشبیہ صحیح ہے۔ لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں۔ کہ حضرت امام حسینؑ کا رُعب اس قدر غالب ہُوا۔ کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چُپ ہو گیا۔ رُعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے۔ اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصّے جب مل جاتے ہیں۔ تو پھر جب تک جدا نہ ہوں۔ آواز نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ کہ وہ ہاتھ جوڑ کر بالکل چُپ ہو گیا"۔

جواب

مَیں کہتا ہُوں۔ کہ میر صاحب کے مصرع کی جو تعریف مولوی صاحب نے فرمائی۔ وہ صحیح بلکہ کچھ کم ہے۔ مجھے اس میں کلام نہیں ہے۔ مگر مرزا صاحب کے مصرع کی نسبت یہ ارشاد کہ "چلّانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلّق نہیں۔ اور ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں"۔ میرے نزدیک مولوی صاحب کی محض خوش فہمی ہے۔ جلاجل (یعنی جھانج) کے دونوں حصّے دونوں ہاتھوں سے مشابہ ہیں۔ اور جب وہ بجنے کے شروع میں ملینگے تو بالکل ہاتھ ملنے کی صورت پیدا ہو گی۔ اُس کے بعد آواز نکلیگی۔ پس مرزا صاحب کا یہ فرمانا کہ ع چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں۔ بہت درست ہے۔ کیونکہ جو شخص الاماں کہتا ہے وہ اپنے فعل پر ضرور نادم ہوتا ہے۔ اور ندامت کے وقت آدمی دستِ افسوس ملتا ہے۔ اسی طرح جلاجل کفِ افسوس مل مل کر الاماں پکارتے تھے۔ دیکھئے کیسی عمدہ تشبیہ ہے۔ اور کتنا بڑا مضمون کتنے مختصر مصرع میں منظم ہے۔ جس کو خود بھی مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ تشبیہ صحیح ہے۔ مگر پھر بھی خواہ مخواہ اپنی خوش فہمی بیانہ جانے کس سبب سے اعتراض فرماتے ہیں۔ ع اے فراست اسے کیا کہتے ہیں۔ ایسے ایسے فضول اعتراض فرما کر مرزا صاحب کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے۔ کہ فہمیدہ و سنجیدہ شخص ایسے بیجا اعتراضوں کو دیکھ کر مولوی صاحب کو ناقص و نافہم کا خطاب دیتے ہیں۔ اور مرزا صاحب کی دلیل کمال

جلاجل کی تشریح

گردانتے ہیں۔ بقول متنبی ؎

واذا اتتک مذمتی من ناقصٍ — فھی الشھادۃ لی بانی کاملٗ[1]

واضح ہو۔ کہ یہ دونوں مصرع دونوں بزرگواروں کے دو مختلف حالات کے (اور دو مختلف بحروں کے) ہیں۔ اس لئے بھی یہ موازنہ ناقص ہے۔ اس موقع پر میں دونوں بزرگوں کے پورے پورے بند لکھتا ہوں۔ تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے۔ کہ دونوں کامل دو جداگانہ موقعوں کی تصویریں کھینچ رہے ہیں +

رعایت لفظی و میر صاحب

میر صاحب کا بند تو خود مولوی صاحب نے صفحہ ۲۳۱ موازنہ میں اس تمہید سے لکھا ہے۔ کہ "اکثر جگہ لفظی رعایت کی پابندی کی وجہ سے کلام اوچھا اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ مثلاً حضرت امام حسینؑ کا تمہیدی فقرہ سُن کر تمام لشکر میں جب سناٹا چھا گیا ہے۔ تو اُس موقع پر لکھتے ہیں" :-

یہ صدا سُنتے ہی خود رُک گیا قرنا کا خروش — تھم گیا طبل وغا کی بھی صدا کا جوش

ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش — کیا بتائے کہ بجاتے تھے نداسی شیپور کا ہوش

چھیڑنا اُن کو سرود دل کا بھی ناساز ہوا — رعب فرزند نبیؐ سے سر مونہ آواز ہوا

تشریح رعایت

مولوی صاحب اس موقع پر اس کلام کو اوچھا اور بے اثر بتلاتے ہیں[2] گو میر صاحب کی شان میں اُنہوں نے سفیہانہ، عامیانہ وغیرہ وغیرہ اوچھے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ مگر میں اس موقع پر بھی یہ نہ کہونگا۔ کہ خود اُن کا اوچھا پن اعتراض سے ٹپکتا ہے۔ صرف اتنا کہنا کافی ہوگا۔ کہ اگر لفظیں بامعنی نہ ہوتیں۔ اور بعض لفظی رعایات کے خیال سے

---

[1] متنبی کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ جب کوئی ناقص میری مذمت کرتا ہوا تجھے ملے۔ تو سمجھ لے کہ میں کامل ہوں۔ وہی اُس کا بیان نقص میرے کمال کی شہادت ہے۔ کہ اگر میں کامل نہ ہوتا۔ تو ناقص میری مذمت نہ کرتا ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] ذرا اس طرز خرام تکلم کو دیکھئے۔ اُوپر دبیر کے مقابلہ میں انیس کے کلام کو اچھا بتایا۔ اب یہاں اُسی کلام انیس کو اوچھا اور بے اثر۔ اگر خدا کی مرضی ہو گا نا دیوانا۔ مگر مولوی شبلی صاحب کیا اور کسی مدعی سخن کے ہٹانے سے دبیر و انیس نہیں ہٹ سکتے۔ اُن کا کلام خدا کی مرضی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

رعایت لفظی سے حسن کلام

ٹھونس دی جاتیں۔ تو اوچھا اور بے اثر کلام ہو جاتا۔ اب رعایت لفظی سے ماشاء اللہ حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ کلام سے اثر ہرگز زائل نہیں ہوا ہے۔ ایسے ہی ایسے غلط اعتراضوں کی وجہ سے کوئی طرفدار میر انیس مرحوم بھی مولوی صاحب کا شکر گذار نہیں۔ اور وہ لوگ بھی موازنہ کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔*

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا
دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسّر شود ایں مقام
کہ با دوستانت خلاف ست جنگ

خیر اب مرزا صاحب کا جواب بھی سُنئے۔ میر صاحب نے تو اُس موقع کی تصویر کھینچی تھی۔ کہ جب رجز امام حسینؑ کے وقت لشکرِ شام نے باجوں کا بجانا موقوف کیا تھا۔ برخلاف اس کے مرزا مرحوم اُس موقع کا نظارہ (سین) دکھاتے ہیں۔ کہ جب قاتلان امام حسینؑ لڑائی پر آمادہ ہوئے۔ جنگ کی طیاری شروع کی۔ علم کھولے۔ باجے بجائے۔ (وہ بند یہ ہے):-

ناگہ عمر کو قصد ہوا قہر نازنے کی فغاں
بیداد کی گواہی کو ہر سو اُٹھے نشاں
چلاّئے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں
نقّارے سینے پیٹتے آگے ہوئے رواں
دی بوق نے ندا کہ دم شور و شین ہے
زہرا سے کہدو۔ نوبت قتلِ حسینؑ ہے

دیکھئے اس ایہام و لطیف پیرایہ میں طیاری جنگ کو نظم فرمایا ہے۔ کہ قہر نازنے کی فغاں اُس نے ہوا کیا؟ سردار لشکر (عمر ابن سعد) کے اس ارادہ پر کہ فرزند رسول کو قتل کریگا گویا فغاں کی۔ اس گواہی دینے کو کہ آل رسول پر بیداد و ظلم ہو رہا ہے۔ نشان اُٹھے۔ جلاجل جو بجے۔ تو یہ ثابت ہوا کہ

* چنانچہ مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے (اڈیٹر اخبار زمیندار پنجاب) اپنے پرچہ دکن ریویو اگست ۱۹۰۵ء میں شائع کی ہیں۔ کہ معترضین انیس کی طرف سے بھی مولوی شبلی صاحب کو داد ملی۔ اور یہ امر سکوت سخن شناس ہو کر موازنہ کی قدر شکنی کا باعث ہو گیا۔ اور اسکو وہ شیعی دنیا کے ایک فرقہ کی عدم اعتدال سے بڑھی ہوئی عصبیت لکھتے ہیں۔ انکا غصہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ مگر ذرا موازنہ کی گستاخیاں اور بے اعتدالیاں اور ناحق کوشیاں کبھی تو دیکھیں۔ پھر تو وہ متعصب لکھتے ہیں اور خود منصف بنتے ہیں۔ مگر کیا یہی انصاف ہے۔ وہ خوب سمجھ لیں کہ جب اُن کا پیسہ کھوٹا ہے۔ تو پرکھنے والے کو وہ کوئی الزام دینے کے مستحق نہیں ہیں۔ ۱۲ مولف حقیر

یہ ظالم لشکر پر دست ندامت و تاسف مل مل کر الامان پکار رہے ہیں۔ نقارے پر جو چوب پڑ رہی تھی
اور وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا۔ کہ سینے پیٹتے ہوئے جا رہے ہیں۔ بوق میں سے
یہ آواز نکلتی تھی۔ کہ شور و شین کا وقت ہے۔ کہ نبیؐ کا نواسا امّت کے ہاتھ سے پیاسا قتل
ہوتا ہے۔ اور بوق گویا زبان حال و زبان اشارہ سے کہ رہا تھا۔ کہ اب جناب فاطمہ زہراؑ سے
کہدو۔ کہ گویا یہ نوبت قتل حسینؑ کی بج رہی ہے۔ کہ قتل بادشاہ مخالف پر نوبت فتح بجانیکا
دستور ہے۔ اس مصرع کے ایک تو یہ معنی ہوئے۔ دوسرے معنی اس کے یہ ہو سکتے ہیں۔
کہ اور سب انصار اور عزیز تو شہید ہو چکے۔ اب امام حسینؑ کے قتل ہونے کی باری ہے۔ نوبت
کا لفظ اس معنی پر بھی اردو کے محاورے میں بولا جاتا ہے۔ کہ اس کام کی اب نوبت آگئی یا اب نوبت
ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھئے۔ کہ اس میں اثر اور رقت کس قدر زیادہ ہے۔
ایسے بلیغ و مؤثر کلام کو (کاٹ چھانٹ کر) مولوی صاحب بدنما کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔
یا خود ان بلاغت کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔ یا جان بوجھ کر تجاہل عارفانہ فرماتے ہیں۔ مگر
سخن شناس کب اُن کی باتوں میں آتے ہیں۔ ع

من انداز قدت را مے شناسم بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش

اعتراض مولوی شبلی صاحب

(۱۳) صفحہ ۲۶۴ پر مولوی صاحب مرزا صاحب پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کرتے
ہوئے یہ (اعتراض عجیب) خلاف بلاغت کی ایک مثال تحریر کرتے ہیں:۔
"مثال ۷۔ حضرت سکینہؑ کو قید خانہ میں غش آگیا ہے۔ اُن کی ماں حضرت شہر بانوؑ کو خیال
ہوا۔ کہ مر گئیں۔ انہوں نے نوحہ شروع کیا حضرت زینبؑ اُن کو سمجھاتی ہیں۔ اس واقعہ کو
مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

زینبؑ نے رو کے بانوئے مغموم سے کہا بے آس ہو نہ بھابھی ہے غش میں یہ مہ لقا
اور مر گئی تو خیر جو اللہ کی رضا اب اس کے رفع غش کی یہی وقت ہے دوا
ہے عاشق حسینؑ یہ پیاری حسینؑ کی سب غل کرو کہ آئی سواری حسینؑ کی"

رضا رضا

خلاف آدمیت

پھر مولوی صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ "تسکین اور تسلی دینے میں یہ کہنا کہ خبر مر گئی تو کیا کر دگی" جو اللہ کی رضا" کس قدر ناموزون اور خلاف آدمیت ہے"*

جواب

اخلاق محمدؐ و آل محمدؐ

میں باادب مولوی شبلی صاحب کی خدمت میمون و مبارک میں گزارش کرتا ہوں۔ کہ شاید آپنے اب تک وہ کتابیں نہیں دیکھیں جن میں حقیقی انسانوں یعنی محمدؐ و آل محمدؐ اور اون کے سچے پیرووں کے اخلاق و عادات درج ہیں۔ کہ جن (محمدؐ و آل محمدؐ) کی شان میں خدا نے قرآن میں سورۂ ہل اتٰی نازل فرمایا ہے۔ کہ جس کو سورۂ دہر اور سورۂ انسان بھی کہتے ہیں۔ ورنہ اللہ کی رضا کے بیان کو آپ کبھی خلاف آدمیت نہ فرماتے۔ اگر اور ایسی عربی و فارسی کی کتابیں جو ہزاروں کی تعداد میں عام اہل اسلام (سُنّی و شیعہ) نے اُن کے اخلاق میں لکھی ہیں۔ آپنے نہیں دیکھی تھیں۔ تو کم سے کم وہ اُردو ہی کی کتابیں دیکھ لیتے۔ جو زمانۂ حال میں ائمۂ اطہارؑ کے حال میں (بطور سوانح عمری) لکھی گئی ہیں۔ میں ایک کم قیمت اُردو کی کتاب کا نام لیتا ہوں۔ یہ کتاب مولوی سید مظہر حسین صاحب قبلہ سہارنپوری مدرس اوّل علوم مشرقی ایم۔ بی سکول لدھیانہ نے تصنیف فرمائی ہے۔ اور لاہور کے مطبع مفید عام میں مولوی غلام عباس صاحب تاجر کتب لاہور لوہاری منڈی نے چھپوا کر مشتہر کی ہے۔ کشف الحقائق فی احوال جعفر الصادق اس کا نام ہے۔ شائد عہ یا اس کے قریب قریب ہو گی۔ کتاب مذکور کے صفحہ ۶۵ و ۶۶ پر عبارت ذیل ملاحظہ فرمائیے۔ جس سے عادات آل محمدؐ کا پتہ چلتا ہے*:۔

کشف الحقائق

رضائے امام جعفر صادقؑ علیہ السلام

اخلاق اہل بیت اطہارؑ

"عنبسہ (راوی) کہتا ہے۔ کہ میں حاضر حضرت (امام جعفر صادقؑ) ہُوا۔ آقازادوں (فرزندان امام جعفر صادقؑ میں) سے ایک مریض تھے۔ اُنہیں کی عیادت منظور تھی۔ دیکھا میں نے کہ حضرت حزین و ملول در دولت پر کھڑے ہیں۔ پس اندر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر وہاں توقف ہُوا ہو گا پھر جو باہر تشریف لائے۔ تو حالت بدل گئی

* اصل روایت دیکھنا ہو۔ تو بحار الانوار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ مقام ملاحظہ فرمائیے + ۱۲ ثابت۔

تھی۔ (یعنی) آثار حزن و ملال اب چہرۂ مبارک پر نہ رہے تھے۔ ہم کو گمان ہُوا۔ کہ اب لڑکے کو آرام ہے۔ عرض کی۔ صاحب زادے کی کیا کیفیت ہے؟ فرمایا۔ اُس نے قضا کی۔ عرض کی زندگی میں پریشانی تھی۔ انتقال پر رنج و ملال نہیں۔ فرمایا۔ ہم اہلبیتؑ کا یہی قاعدہ ہے۔ کہ نزول بلا سے پہلے مضطرب و پریشان ہوتے ہیں۔ بلا جب نازل ہوگئی۔ تو قضائے خدا پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اور اُس کو تسلیم کر لیتے ہیں[۱]"

اِس ارشاد فیض بنیاد سے آپ کو ثابت ہو گیا ہوگا۔ کہ اہل بیت محمد مصطفےٰ صلعم کا یہ عام طریقہ تھا۔ کہ نزول بلا سے پہلے تو مضطرب ہوتے تھے۔ مگر بلا نازل ہونے کے ساتھ ہی قضائے خدا پر راضی ہو جاتے تھے۔ اسی کا نام تسلیم و رضا ہے۔ اسی عادت کو۔ اس موقع پر مرزا صاحب نے حضرت زینبؑ کی زبانی دکھایا ہے۔ کہ (گویا) وہ معظمہ فرما رہی ہیں۔ کہ بھابھی بے آس نہ ہو۔ سکینہ غش میں ہے۔ اچھی ہو جائیگی۔ اور اگر واقعی مر گئی ہے۔ تو ہم اہلبیتؑ کے شیوۂ اخلاقی کے موافق تمکو صبر کرنا چاہئے۔ جو اللہ کی رضا وہی مصلحت ہے۔ اُسی پر ہم راضی ہیں۔ پھر یہ اضطراب کیوں ہے؟[۲] یہی باتیں تو مرزا صاحب کی کثرت معلومات پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اُن کے تاج کمال کی طرّہ طراز ہیں۔ کہ وہ جناب حالات اہلبیت اطہارؑ میں اکثر وہی خیالات ظاہر فرماتے ہیں۔ جو اُن کی شان کے شایاں ہیں۔ اور جن پر اُن حضرات کے صحیح تاریخی حالات شاہد

(حاشیہ: تسلیم و رضا — کثرتِ معلومات)

---

[۱] ناظرین دیکھئے ہر فقرہ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے۔ اردو میں ترجمہ ہونے پر جس کلام میں یہ اثر ہے کہ دل ہی میں (ہر فقرہ) گھر کرتا ہے۔ تو اصل کلام بلاغت نظام کیا اثر رکھتا ہوگا ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] اس موقع پر مجھے اپنے اُستاد جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی صوفی کا ایک شعر یاد آگیا۔ لکھنا چاہتا ہوں۔ ؎ عادت تو امیر اچھی ہے فریاد و بُکا کی۔ پر شیوہ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے۔ دیکھئے تسلیم و رضا کی کیا شان دکھائی ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

(حاشیہ: جناب منشی امیر مینائی)

عادل ہیں۔ عام آدمیوں کی عام عادات سے الگ کر کے خاصان خدا کی شان دکھلانا یہی تو مقتضائے بلاغت ہے۔ اور یہی درحقیقت (نیچرل) فطرتی رنگ ہے۔ اور جب خاصان خدا کے اخلاق و عادات ہمرشتما کی طرح دکھائے جائینگے۔ تو وہ رنگ دراصل خلاف فطرت و خلاف واقع ہوگا۔ ہر چند ہم میں اور گروہ صوفیہ میں مسائل توحید وغیرہ میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ مگر تسلیم و رضا کا مسئلہ علمائے صوفیہ میں بھی اسی طرح ملتا ہے۔ جن لوگوں نے صوفیوں کے اخلاق کی کتابیں۔ اُن کے ملفوظات وغیرہ دیکھے ہیں۔ مجھے امید ہے۔ کہ وہ میرے کلام کی تائید فرمائینگے۔ اگر طول کتاب کا خوف نہ ہوتا تو میں اس موقع پر بعض کتب تصوّف سے بہت کچھ لکھتا۔ مجھے اِس موقع پر سخت تعجّب اور اُس سے بڑھ کر افسوس ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے مولانا رومؒ کی سوانح عمری لکھی جسکی تالیف کے وقت اور اُس سے پہلے صوفیوں کی غالباً بہت سی کتابیں دیکھی ہونگی۔ مگر یہ مسئلہ رضا و تسلیم کا اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور اِس (رضا و تسلیم) کو خلاف آدمیت سمجھے۔ حالانکہ یہ عین آدمیت ہے۔ مگر ہر آدمی میں نہیں ہوتی۔ مرزا غالب نے سچ فرمایا ہے ؎

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اور میر تقی میرؒ ان سے پہلے اور ان سے بہتر فرما گئے ہیں ؎

شیخ جی صاحب فرشتے ہوں تو ہوں
آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں*

مولوی صاحب! آپ ایمان سے فرمائیگا۔ کہ آپ مرزا صاحب کے ایسے عارفانہ کلام پر ایسا بیجا اعتراض فرماتے ہیں۔ اور "خلاف آدمیت" کا ثقیل و ناموزوں لفظ

*نوٹ۔ اگرچہ دوسرا مصرع محاورہ حال کے موافق یوں تبدیل ہو سکتا ہے ع آدمی ہونا بہت دشوار ہے۔ مگر میں نے میر صاحب کا تبرکاً سمجھ کر (جُوں کا توں) لکھ دیا ہے۔ میر صاحب کے قریب قریب حافظ شیرازی بھی فرما گئے ہیں ؎ واعظ شہر کہ مردم ملکش میخوانند۔ قول ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست۔ اگر اس بات کا ثبوت ہوتا۔ کہ میر صاحب کو حافظ شیراز کے شعر کا علم تھا۔ تو یوں کہنا مناسب ہوتا۔ کہ اُنہوں نے فارسی سے اردو میں ترجمہ فرما دیا۔ اب یہ کہنا مناسب ہے۔ کہ مضمون توارد ہو گیا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

لکھتے ہیں۔ کیا یہ آپ کی شان کے شایاں ہے؟ فرمائیے۔ یہ مقام دیکھ کر اُن کے معتقدوں کے دل کیسے پاش پاش ہو گئے ہونگے۔ مرزا صاحب کے کریمانہ اخلاق تمام ہندوستان میں مشہور اور زباں زد خاص و عام ہیں۔ کچھ دبیریوں پر منحصر نہیں۔ انیسیئے بھی اُن کو ایک فرشتہ خصال آدمی سمجھتے ہیں۔ آپ اُن کی شان میں ایسے گستاخانہ بے باکانہ الفاظ فرماتے ہیں۔ اور جب اُن کے شاگرد (مثل میر افضل علی صاحب ضو مصنّف ردّ الموازنہ) جواب ترکی بہ ترکی دیتے ہیں۔ تو آپکے طرفدار مثل سابق اڈیٹر پرچہ دکن ریویو ایسے بگڑتے ہیں۔ کہ ردّ الموازنہ کو بازاری آدمیوں کی گالیاں کہتے ہیں۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال نہیں دیکھتے۔ خیر آپ ندوۃ العلما کے ممبر اور معمّر اور اہل علم میں سے سمجھے جاتے ہیں۔ مَیں جواب میں بھی کوئی لفظ خلافِ آدمیت کہنا نامناسب سمجھتا ہوں۔ بقول میر انشاء مرحوم

جو لُوچ چھٹے تو بڑا آج کام مَیں نے کیا • جب اُس نے گالی دی جُھک کر سلام مَیں نے کیا*

اعتراضوں کا طوفان

(۱۴) صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۳ پر مولوی صاحب نے مرزا صاحب کا یہ بند لکھ کر

حامی جو سلیمانؑ دو عالم نظر آئے • مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے
طاؤس تصوّر کی طرح دل میں در آئے • شیشے میں پر یزاد معانی اُتر آئے
یاقوت بدخشاں سے دُر آتے ہیں عدن سے • لعل اُگلونگا مَیں طوطی سدرہ کے دہن سے

اعتراض استفہامیہ مولوی شبلی صاحب

بے جا اعتراضوں کا طوفان مچا دیا ہے۔ کاش وہ کوئی معقول اعتراض فرماتے جسکو دیکھ کر کسی اہل فن کو فائدہ ہوتا۔ یا جواب اُس کا سُن کر کچھ معلومات بڑھتی۔ بالکل اٹکل پچّو اعتراض ہیں۔ اور وہ بھی سوالات کے پیرایہ میں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فہم عالی میں (مضمون دقیق) نہیں آیا۔ اور دُوسرے سے پُوچھنا اپنی کسرِ شان سمجھا۔ اعتراض کے پردے میں سوال یا سوال کی آڑ میں اعتراض فرماتے ہیں۔ وہ سوالات یا اعتراضات

* خلاق المعانی کمال اصفہانی بھی اسی کے قریب قریب فرما گئے ہیں ۔ دوش بگذشتم و دشنام ہمیں داد مرا۔ خدمتش کردم و پند اشست کہ من نشنیدم + ۱۲ مؤلف حقیر۔

حسب ذیل ہیں:-

(۱) حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہے۔ (۲) تصوّر کی تشبیہ طاؤس سے کس بنا پر ہے۔ (۳) پھر اس کے کیا معنی کہ عنقائے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جس طرح طاؤس تصور دل میں اُترتا ہے۔ (۴) طاؤس دل میں نہیں اُترتا۔ (۵) اگر تصوّر کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہے۔ تو مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے۔ طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہے۔ (۶) ٹیپ میں عجب بے ربطی ہے۔ شاعر لعل اُگلیگا۔ لیکن طائر سدرہ کے دہن سے اُگلیگا۔ اس کے کیا معنی؟ شائد اُگلنے کو اُگلوانے کے معنی میں لیا ہے۔ یا اپنے آپ کو طائر سدرہ قرار دیا ہے"+

جواب باصواب

اب ہر فقرہ کا جواب باصواب سُنئے:- (۱) حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اوّل تو یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ الفاظ میں گہرا تعلق ہو۔ اور جب الفاظ میں تعلق خاص ہوتا ہے۔ تو اُس کو شعرا صنعت مراعات النظیر یا رعایت لفظی کہتے ہیں۔ میر صاحب مرحوم کے یہاں جابجا یہ گہرا رنگ دیکھ کر مولوی صاحب جابجا اعتراض جما چکے اور کلام کو بے اثر بتا چکے۔ اب مرزا صاحب کے یہاں وہی تعلق ڈھونڈتے ہیں۔ مولوی صاحب کو کسی پہلو قرار نہیں ہے۔ اگر واقعی وہ ایسے تعلق کلام یا اُبھری ہوئی رعایت لفظی کو ناپسند کرتے تھے۔ اور انصاف سے موازنہ کرنے کو بیٹھے تھے۔ تو کہیں کم سے کم اتنا ہی لکھتے۔ کہ مرزا مرحوم کے یہاں یہ گہرا رنگ کم ہے یا نہیں ہے۔ اب مجھ سے سُنئے مرزا صاحب نے صنعت رعایت لفظی کو کم برتا ہے۔ یا یوں کہئے۔ کہ جب تک بے تکلفی سے کوئی مناسب لفظ نہیں آیا ہے۔ اُنہوں نے نہیں باندھا ہے۔ اس کی وجوہ مفصّل میں اسی کتاب میں دوسرے موقع پر لکھ چکا ہوں۔ اُن کو ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا۔ کہ الفاظ میں رعایت و تعلق ایسا باریک ہو۔ کہ غور کرنے

جنابِ سلیمانؑ، عنقا

سے وہ سمجھ میں آئے۔ یہاں بھی وہ باریک تعلق موجود ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ
جن و انس و وحش و طیر کے بادشاہ تھے۔ عنقا کل طائروں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔
با ایں ہمہ حضرت سلیمانؑ کا مطیع ہے۔ اب ایک باریک نکتہ زبان دانی کا عرض کرتا
ہوں۔ یہی وہ باتیں ہیں۔ جن سے لغت کی کتابیں خالی ہیں۔ اور جب تک اہلِ زبان
نہ بتائیں۔ یہ باتیں نہیں آ سکتیں[۱]۔ عنقا کے معنی اس موقع پر اُس طائر کے نہیں ہیں
بلکہ یہاں عنقا کے معنی نایاب کے ہیں۔ یہ روزمرہ ہے۔ کہ وہ چیز آج کل عنقا ہے۔
یعنی نایاب ہے۔ پس اسی معنی پر مرزا مرحوم کہتے ہیں۔ کہ جب سلیمان دو عالم (امام حسینؑ)
میرے حامی ہو گئے۔ تو جو مضمون نایاب تھے۔ وہ پر جوڑ کر آئے۔ پر جوڑ کر آنے کے
مضمون میں بھی ایک اعلےٰ درجہ کی بلاغت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ طائر ہمیشہ اپنے اصلی
مقام و مسکن پر پر جوڑ کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ پر جوڑ کر آنے سے مطلب شدّت سرعت
ہے۔ مولوی صاحب! میرے معروضہ کی تصدیق منظور ہو۔ تو کسی ایسے مقام پر
تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے چلئے۔ جہاں کبوتر اُڑتے ہوں۔ اور اپنی آنکھ سے
کبوتروں کو اُن کے مقام پر پر جوڑ کر آتے ہوئے دیکھ لیجئے۔ مرزا مرحوم اس مضمون کو
ادا کر رہے ہیں۔ کہ مضامین میرے گھر کو اپنا اصلی مسکن سمجھ کر آتے ہیں[۲]۔ اب دُوسری

طاؤسِ تصور

بات سُنئے:۔ (۲) (طاؤسِ تصور کی طرح دل میں وہ آئے)۔ طاؤسِ تصوّر ایک استعارہ
لطیف ہے۔ یعنی مضامین دل میں اسی طرح بے تکلف آ گئے۔ جیسے تصوّر آتا ہے۔
طاؤس ایک خوش رنگ خوش وضع طائر ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے استعارے

---

[۱] میر تقی میر مرحوم انہیں باتوں کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ میرے اشعار سمجھنے کیلئے دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کی فردت(؟)
ہے۔ مطلب یہ تھا کہ وہ خاص خاص روزمرّے اور محاورے ہیں جن کو ہر جگہ کے آدمی نہیں جانتے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] پر جوڑ کر آنے کے ایک معنی با ادب آنے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے بڑھ کر بلیغ مضمون کسی اور
شاعر اردو کے یہاں بھی ہے۔ ایسے نادر مضامین و تشبیہات لانا مرزا مرحوم کا حصہ ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

شعرا نظم کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ حمد میں حکیم فیضی کا مشہور شعر ہے ؂

اے در رنگ و بوئے تو زآغاز طاؤس نظر بلند پرواز

طاؤس بھی رنگین ہوتا ہے مضمون بھی رنگین ہوتا ہے۔ اس لئے طاؤس تصور سے اُس کو استعارہ کرکے تشبیہ دی۔ جو کمال بلاغت کی دلیل ہے۔ طاؤس جس وقت باغ میں یا کسی اور مقام پر دیوار سے اُترتا ہے۔ تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ چوتھا مصرع بھی مولوی صاحب کی شمشیر اعتراض سے کیوں نہ چورنگ ہو گیا۔ اس پر بھی لگے ہاتھ کوئی اعتراض جما دیتے۔ اور وہ پریزاد حسین و فصیح مصرع یہ ہے۔ ع شیشے میں پریزاد معانی اُتر آئے۔ شعرا شیشہ کو دل سے (بوجہ نزاکت) تشبیہ دیتے ہیں۔ اور شیشے میں پری و جن کا اُتر نا یہ بھی ایک مشہور بات ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ دل کے شیشے میں پریزاد مضامین اُتر آئے۔ اب سوالات (۵) تک کے جوابات ہو چکے۔ (۶) ٹیپ کو لیجئے۔ جس کو مولوی صاحب اپنی خوش فہمی سے بے ربط بتا رہے ہیں۔ ٹیپ واقعی دقیق اور دقّت طلب ہے۔ مگر واضح ہو۔ کہ یہ مرثئے اُس زمانے کی تصنیف ہیں۔ جب لکھنؤ دار السلطنت ہونے کی وجہ سے مرجع اہل علم و منبع کمال ہو رہا تھا مرزا صاحب کے پڑھنے کی مجلسوں میں اکثر اہل علم نظر آتے تھے۔ جو عموماً علوم عقلیہ و نقلیہ مشرقیہ کے لباس و سلاح سے آراستہ ہوتے تھے۔ اِدھر خاندان اجتہاد کی نکہت علم و فضل و تقدس سے لکھنؤ مہک رہا تھا۔ اُدھر علمائے فرنگی محل نے اشاعت علوم و فنون سے اس کو دار العلم و العمل کا معزز خطاب دے رکھا تھا۔ لکھنؤ کا تو کیا ذکر ہے۔ اُس کے ارد گرد کے بعض قصبہ اور گاؤں گاکوری جرول۔ کنتور۔ موہان۔ بلگرام۔ بدایوں۔ سندیلہ وغیرہ وغیرہ میں اہل علم و اہل فہم کثرت سے تھے۔ کہ جن کا مرکز لکھنؤ تھا۔ ایسے دقیق اشعار کی لوگ توقیر کرتے تھے۔ اُن علم دوست حضرات کا گویا یہ سخن تکیہ تھا کہ اجی سیدھا سادہ کلام تو تُک بندی ہے۔

شمع بزم علم لکھنؤ کی شان

خاندان اجتہاد

نظم کو تشبیہ و استعارہ کے لباس و زیور سے آراستہ کرو۔ بلیغ مضمون مختصر الفاظ میں لاؤ۔ اُس میں صنائع و بدائع بے تکلفی سے جابجا اپنا جلوہ دکھاتے ہوں جب لطف شاعری ہے۔ نہیں تو سیدھی سادی بات نثر ہی میں نہ کہدو۔ خیر اب مَیں مطلب سمجھنے کے واسطے آپ سے ایک مختصر و معتبر حدیث بیان کرنے کی اجازت مانگتا ہوں یہ حدیث شیخ صدوق علیہ الرحمہ* نے اپنی کتاب عیون اخبار الرضا میں لکھی ہے۔ جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

شیخ صدوق و عیون اخبار الرضاؑ

حدثنا احمد[۱] بن زیاد بن جعفر الھمدانی۔ قال حدثنا علی[۲] بن ابراھیم ابن ھاشم عن ابیہ[۳] عن عبد السلام[۴] بن صالح الھروی۔ قال سمعت[۵] دعبل بن علی الخزاعی۔ یقول انشدت مولای الرضاء قصیدتی۔ اولھا مدارس ایاتٍ خلت من تلاوۃٍ۔ ومنزل وحیٍ مقفر العرصات۔ فلمّا انتھیت الی قولی۔ خروج امامٍ لا محالۃ خارج۔ یقول علی اسم اللّٰہِ والبرکات یمیّز فینا کلّ حقٍّ و باطلٍ و یجزی علی النعماء والنقماتِ۔ بکی الرضا علیہ السلام بکاءً شدیدًا ثمّ رفع راسہٗ الیّ۔ فقال یا خزاعی نطق روح القدس علی لسانک بھٰذین البیتین۔ فھل تدری من ھٰذا الامام ومتی یقوم۔ فقلت لا۔ یا مولای الّا انّی سمعت بخروج امامٍ منکم یطھّر الارض من الفساد و یملاھا عدلاً۔ فقال یا دعبل الخ +

یہ بزرگوار چار راویوں کے ذریعہ سے یہ روایت دعبل خزاعی سے بیان فرماتے ہیں۔ جو (دعبل) امام رضاؑ کے مدّاح شاعر و معاصر ہیں۔ دعبل کہتے ہیں۔ مَیں نے اپنا یہ قصیدہ جس کا مطلع مدارس ایاتٍ الخ ہے۔ امام رضاؑ کی خدمت اقدس میں پڑھا۔

*شیخ صدوق شیعوں کے ایک معتبر عالم ہیں جنکا انتقال ۳۸۱ھ میں ہوا ہے۔ تخمیناً تین سو کتابیں انکی تصنیف بتائی جاتی ہیں۔ شیخ مفیدؒ انکے شاگرد تھے اور شیخ مفید کے شاگرد سید مرتضے علم الہدیٰ اور سید رضی جامع نہج البلاغہ ہیں ۱۲+ مؤلف حقیر۔

یہاں تک کہ میں قصیدہ پڑھتے پڑھتے اِن دو شعروں پر پہنچا۔ جن کا مفہوم یہ ہے۔ کہ ضرور ہے۔ کہ ایک امامؑ ظاہر ہوں۔ جو خدا کے نام اور برکتوں پر کلام فرمائینگے۔ اور ہم میں سے ہر حق و باطل کو چھانٹ دینگے۔ اور (نعمات) نیکیوں کی جزا اور (نقمات) بُرائیوں کی سزا دینگے۔ یہ سُن کر حضرت (امام رضاؑ) بہت روئے۔ پھر میری طرف سر اُٹھا کر فرمایا۔ اے دعبل خزاعی اِن دونوں شعروں کے کہنے میں رُوح القدس (جبریلؑ) تیری زبان پر ناطق ہوا ہے۔ تجھے معلوم ہے؟ یہ امام کون ہے۔ (دعبل) میں نے عرض کی۔ آقا مجھے خبر نہیں۔ میں نے تو بس اتنا سُنا تھا۔ کہ آپ اہلبیتؑ میں سے ایک امام ظاہر ہونگے۔ جو زمین کو فساد سے پاک کر دینگے۔ اور عدل و داد سے بھر دینگے۔ پھر حضرت (امام رضاؑ) نے پُوری کیفیت ظہور امام اثنا عشرؑ کی بیان فرمائی۔ جو باقی حدیث میں ہے۔ اور جس کے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔

روح القدس و شاعرِ اہلبیتؑ

تمہید تمام ہُوئی۔ اسی قصّہ کی طرف (جو اُس زمانہ کے اہل علم میں مشہور تھا) مرزا صاحب نے اس مصرع میں اشارہ فرمایا ہے۔ (ع لعل اُگلو نگا میں طوطی سدرہ کے دہن سے) سدرۃ المنتہےٰ کے نیچے حضرت جبریلؑ کا مقام مشہور ہے۔ اس لئے حضرت جبرئیلؑ کو (جن کا نام رُوح القدس و رُوح الامین بھی ہے) طوطی سدرہ کہتے ہیں۔ مطلب مرزا صاحب کا یہ ہے۔ کہ جبریلؑ مدّاحِ محمدؐ و آلِ محمدؐ میں میری زبان پر ناطق و گویا ہونگے۔ ناظرین آپ کو اس موقع پر مولوی شبلی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ کہ نہ وہ ایسے اُلٹے پُلٹے استفہامیہ اعتراض فرماتے۔ نہ میں اس طرح ہندی کی چندی کر کے سمجھاتا۔ ضرور مرزا صاحب کے کلام میں سے کچھ کلام ایسا دقیق و قصّہ طلب بھی ہے۔ اور میں اس کی بحث ایک مقام پر اسی کتاب میں کر چکا ہوں۔ اور کہ چکا ہوں۔ کہ ہر ذی علم متکلم ناظم و ناثر کے کلام میں ضرور کچھ حصّہ دقیق کلام کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نہج البلاغہ ایسی لاجواب کتاب میں بھی ہے۔ اِس سے مرزا

صاحب کے علم وفضل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ بھی ایک دلیل اُن کے کمال کی ہے۔ اس بنا پر کوئی شخص مرزا صاحب کے کمالات کو مٹانا چاہے۔ تو نہیں مٹ سکتے۔ ایسے ایسے استفہامیہ اعتراضات مولوی شبلی صاحب نے اور بھی چند بندوں پر فرمائے ہیں۔ مگر میں ہندی کی چندی کہاں تک سمجھاؤں۔ کتاب زیادہ طولانی ہوئی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض بند دوسرے مقام پر میں نے سمجھا دئے ہیں۔ اور یوں بھی اب ضرورت نہیں ہے۔ کہ میرے کرم فرما اُستاد بھائی منشی چودھری سید نظیر الحسن صاحب رئیس جہابن ضلع متھرا نے موازنہ مولوی شبلی صاحب کے جواب میں ایک مستقل کتاب (المیزان) لکھی ہے۔ جو غالباً میری کتاب کے ساتھ ساتھ شائع ہوگی۔ کہ آج کل چھپ رہی ہے۔ جو صاحب چاہیں۔ اُس کتاب میں ان تمام بندوں کی شرح ملاحظہ فرمالیں۔ کتاب المیزان ایک محققانہ لاجواب کتاب ہے*

فصل ۲
دُوسرا داغ
زبان دانی
کی غلطیاں
تمہید

دُوسرا داغ۔ زبان دانی کی غلطیاں

رباعی مؤلف حقیر

(۱) جو لوگ اہل زباں پہ مُنہ آتے ہیں — آجاتا ہے جو مُنہ میں وہ کہ جاتے ہیں
ثابت اُن کو سزا بھی ملتی ہے ضرور — مُنہ آتے ہیں جب تو مُنہ کی بھی کھاتے ہیں

ایضاً

(۲) اہل جوہر کا مرتبہ عالی ہے — ہر بزم میں صدر ان کے لئے خالی ہے
ہیں سکۂ زن نظم دبیرؒ اور انیسؒ — ان کی اردو زبان ٹکسالی ہے

میرے خیال میں مولوی شبلی صاحب نے سب سے بڑی غلطی یہ کی۔ کہ جا بجا موازنہ میں دبیرؒ و انیسؒ کی زبان پر بھی اعتراض فرمائے۔ یہ امر ہرگز اُن کو سزاوار نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مولوی شبلی صاحب گویا سرحد بنگالہ کے قریب کے (ایک قصبہ کے) رہنے والے ہیں۔ دہلی و لکھنؤ کی زبان مستند سے اُن کو اتنا ہی بُعد ہے۔ جتنا اُن کے وطن کو۔ تھوڑے دن وہ

علی گڑھ میں ضرور رہے۔ مگر ہنوز دلّی دور ہے۔ مرزا دبیر مرحوم کی پیدائش دہلی کی۔ پانچ سات برس کی عمر میں وہ دہلی سے اپنے والدین کے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ پھر تمام عمر (گویا) لکھنؤ ہیں رہے۔ لکھنؤ سے راہئ جنّت ہوئے۔ اسی طرح میر انیس مغفور فیض آباد میں پیدا اور جوان ہوئے۔ آخر عہد شباب میں لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ سے فردوس بریں کو تشریف لیگئے۔ ان کے بزرگ بھی اردو کے مستند شعرا تھے۔ دہلی فیض آباد۔ لکھنؤ۔ یہ شہر اُس زمانے میں مرکز فیض و مرجع اہل کمال تھے۔ وہاں کے رہنے والوں کی زبان سند ہی سمجھی جاتی ہے۔ پھر ایک بیرونی کو کب یہ حق ہے۔ کہ اُن کی زبان پر مُنہ آئے۔ جو پنجابی وغیرہ آج کل اہل زبان یا زباندان ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ وہ بھی تو ساتھ ساتھ یہی کہتے جاتے ہیں۔ کہ تمام مستند گزشتہ شعرائے دہلی و لکھنؤ کو ہم اپنا سرتاج اور قابل تقلید اُستاد مانتے ہیں۔ اگر کلام ہے تو اس میں ہے۔ کہ اب بھی دہلی و لکھنؤ میں ویسے شعرا باقی ہیں یا نہیں۔ کہ جن کی تقلید مثل سابق واجب ہو۔ مَیں کہتا ہوں اور میری دلی آرزو بھی یہی کہتی ہے۔ کہ اب بھی ہیں۔ اور انشاءاللہ آئندہ بھی اُمید ہے۔

غیر ؎ کجا بودم اکنوں کجا آمدم ۔ زجا رفتم امّا بجا آمدم +

اب وہ زبان کے متعلق غلطیاں مولوی شبلی صاحب کی غور و انصاف سے سُنئے:۔

(۱) صفحہ ۲۳ موازنہ میں میر انیس مرحوم کے اس مصرع پر ؎ اس مژدہ کو سُنتے ہی خوشی ہوگئی شبیر۔ اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ "خوش" چاہئے۔ (مطلب یہ ہے کہ خوشی غلط ہے)۔ ناظرین! اب ذرا میری سُنئے۔ دو گھڑی غم غلط کیجئے:۔

بات یہ ہے۔ کہ خوشی ہونا اور خوش ہونا دونوں صحیح محاورے ہیں۔ دہلی و لکھنؤ میں پہلے خوشی ہونا زیادہ بولا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی نظیر لیجئے۔ حضرت آتش فرماتے ہیں ؎

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اعتراض میر صاحب کہ خوشی بجائے خوشی [illegible]

اور دہلی کی نظیر درکار ہو۔ تو اصغر علی خاں صاحب نسیم دہلوی کا یہ پھڑکتا ہوا شعر سُنئے ؎

جس طرف دیکھئے دو تین پھڑکتے ہیں اسیر — کیوں نہ صیّاد خوشی ہو چمن آباد ہیں سب [1]

اب بھی کوئی صاحب نہ مانینگے۔ تو اُن کو نسیم کا یہ شعر سُننا پڑیگا ؎

نسیم دہلوی۔ ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں — کوئی اردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

یہ دو شعر اتفاقیہ اس وقت مجھے یاد آ گئے۔ لکھدئے۔ ورنہ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ دبیر و انیس نے جس کثرت سے محاورے اور الفاظ نظم فرمائے ہیں۔ وہ غزل گو۔ قصیدہ گو شعرا کے یہاں نہیں ملتے۔ اور یہ دونوں بزرگوار خود مستند ہیں۔ ان کے واسطے دُوسرے شعرا کے کلام سے سند لانا بھی ضرور نہیں ہے۔ بلکہ ان کے کلام سے سند و نظیر لی جاتی ہے۔ بقول شیخ امان علی صاحب سحر لکھنوی ؎

بیرونیوں کو چاہئے تقلیدِ لکھنؤ — ہم خود سند ہیں ہم کو سند کیا ضرور ہے [2]

(۲) صفحہ ۲۷۰ پر یہ مصرع مرزا صاحب کا ع آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں" لکھکر مولوی صاحب فرماتے ہیں "چھوٹا مسافر مرزا صاحب کا ایجاد ہے"۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ مرزا صاحب کا ایجاد نہیں ہے۔ ٹکسالی زبان اردو کا سکّہ پڑا ہُوا لفظ ہے۔ اور چھوٹا مسافر۔ ننّھا مسافر۔ ننّھا سا مسافر۔ چھوٹا سا مسافر یہ سب الفاظ تمام ہندوستان میں بولے جاتے ہیں۔ آزاد مرحوم نے آبِ حیات کے صفحہ ۲۳ پر

اعتراض مرزا صاحب پر

[1] آزاد مرحوم نے آبِ حیات میں صفحہ ۴۰۰ پر کسی شخص لا معلوم الاسم کے اعتراضوں کی ذیل میں آتش مرحوم کا یہ شعر لکھکر لکھا ہے کہ خوش چاہئے۔ اس پر صفیر بلگرامی نے جلوہ خضر جلد دوئم میں صفحہ ۱۱۲ پر جواب دیا ہے کہ خوشی پھڑنا بڑا محاورہ نہیں جیسے کہتے ہیں خوشی خوشی جاؤ۔ اردو میں مستعمل ہے چنانچہ نسیم دہلوی کہتے ہیں ؎ نہ زندگی سے خوشی ہُوں نہ موت سے راضی۔ نہ اختیار میں دل ہے نہ اختیار میں روح۔ حقیر ثابت عرض کرتا ہے۔ کہ خوشی بجائے خوش اردو میں اس طرح مستعمل ہے۔ جیسے عربی میں زیدٌ عدلٌ بجائے زیدٌ عادلٌ کے۔ اور خوشی بجائے خوش کے آج تک اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ دہلی میں بھی غالباً بولا جاتا ہے۔ جس کی شہادت نسیم دہلوی کے دو شعر دے رہے ہیں ۱۲ سید بضاعت ثابت۔

[2] جناب مرزا دبیر بھی اس نکتہ سے واقف تھے۔ چنانچہ امیر اللغات کے ریویو میں لکھتے ہیں کہ منشی امیر صاحب خود سند ہیں انکو دُوسروں کے کلام سے سند لانے کی ضرورت نہ تھی۔ بس یہی دبیر و انیس کا سمجھئے ۱۲ ثابت۔

ننّھا کو (خورد کے معنی پر) گجراتی لکھا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ چھوٹا (بھاشا) تمام ہندوستان کا لفظ ہے۔ اور ننّھا صرف (ایک حصّہ ملک) گجرات کا۔ مگر اب یہ بھی ہندوستان میں رائج ہے۔ اس لئے یہ بھی اردو ہے۔ اور اگر ایجاد مرزا صاحب سے آپ کی یہ مراد ہے۔ کہ شاعروں میں پہلے پہل مرزا مرحوم نے اس کو باندھا۔ تو ہر لفظ و محاورہ کو اوّل اوّل جس شاعر نے جس زبان میں نظم کیا ہوگا۔ وہ اُس کا موجد قرار پائیگا۔ اور ہر لفظ و محاورہ ضرور کسی نہ کسی شاعر نے پہلے پہل باندھا ہوگا۔ اس صورت میں یہ بات اُس شاعر کے کمال پر دال ہے۔ افسوس کہ آپ اس پر طعن فرماتے ہیں۔ میر مونس مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہنر کو عیب سمجھتے ہیں اس زمانے میں ہزار شکر کہ ہم کچھ ہنر نہیں رکھتے

یورپ میں ایسے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہر نثار و شاعر مستند کے بیان میں لکھے جاتے ہیں۔ جو اُس نے اوّل اوّل نظم یا استعمال کئے ہوں۔ اور اُس کے تاج کمال کے طرّہ کے تار (گویا) سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں مولوی شبلی صاحب طعن فرماتے ہیں ع اے کمال۔ افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے +

اعتراض میر صاحب پر

(۳) صفحہ ۲۲۹ پر میر صاحب پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کرتے ہُوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں ؎ گمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عبّاسؑ۔ گمتی الفاظ اراذل کی زبان ہے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ یہ مولوی صاحب کی زبان اردو سے ناواقفی ہے۔ گمتی لکھنؤ کے محلات شاہی اور شریف زادیوں کی زبان کا لفظ ہے۔ گو عوام بھی اس کو بولتے ہیں۔ مگر محلات شاہی میں بولے جانے کی وجہ سے خصوصاً عورتوں کی زبانی جب شاعر نظم کریگا۔ فصیح سمجھا جائیگا۔ میر صاحب نے کمال تو یہی کیا ہے۔ کہ ایک معظّمہ کی زبانی نظم فرمایا ہے۔ ہائے شیخ علی حزین رحمہ تم کیا خوب اور سچ فرما گئے ہو ؎

کس زبان مرا نمی فہمد بعزیزاں چہ التماس کنم

اب مَیں بادب مولوی شبلی صاحب سے پُوچھتا ہُوں۔ کہ حضرت یہ "الفاظ" کہاں کی

زبان ہے +

اعتراض مرزا صاحب پر (مبتذل الفاظ)

(۴) صفحہ ۲۳ پر موازنہ میں (مولوی صاحب) لکھتے ہیں۔ کہ "مرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں۔ اکثر اُن کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔ مثلاً جہاں حضرت شہر بانوؑ نے حضرت عباسؑ کی لاش پر نوحہ کیا ہے۔ شہر بانو کی زبان سے فرماتے ہیں ؎ ہے ہے مرے دیور مرے دیور۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎ ناٹرہ تو ان کی سالگرہ کا نکال لا۔" اب میں

جواب

کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب دیور اور ناٹرہ کو مبتذل سمجھ گئے ہیں۔ ہائے ناواقفی

مبتذل کیا چیز ہے

بندہ پرور! مبتذل وہ لفظ ہوتی ہے۔ جس کو بازاری آدمی بولتے ہیں۔ اور ثقہ و شریف آدمی اُس کے بدل دُوسری لفظ بولیں۔ اور جب کسی زبان میں ایک معنی پر ایک ہی لفظ ہو۔ کہ اُس کو سب شریف و وضیع بولتے ہوں۔ تو اُس لفظ کو کوئی عاقل زباندان مبتذل نہیں کہ سکتا۔ اب سُنئے۔ دیور اور جیٹھ یہ دونوں لفظ عورتوں کی زبان کے ہیں۔ جو تمام ہندوستان

جواب

میں (تمام قوموں میں) بولے جاتے ہیں۔ دیور وہ ہے۔ جو عورت کے خاوند سے عمر میں چھوٹا بھائی ہو۔ جیٹھ* وہ ہے جو بڑا ہے۔ حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اس لئے زوجہ امام حسینؑ جناب بانوؑ فرماتی ہیں ؎ ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور۔ مرزا مرحوم نے کمالِ بلاغت سے اس موقع پر کام لیا ہے۔ کہ حضرت بانو کی زبانی وہی لفظ (دیور) باندھا۔ جو عورتیں بولتی ہیں۔ مجھے سخت تعجب ہے۔ کہ ایسے لفظ پر بھی مولوی صاحب نے اعتراض جڑ دیا۔ جو دہلی و لکھنؤ کے علاوہ اور بھی تمام ہندوستان کی عورتوں میں بولا جاتا ہے۔ اور کوئی دُوسرا لفظ ہی اس کا قائم مقام

* سر سید صاحب تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون "مذہب عام تعلیم" میں فرماتے ہیں۔ "کہ یہ جو ہندی مثل مشہور ہے کہ "جیٹھ کے بھروسے پیٹ" اسکی عادت اٹھا دیں بلکہ آپ کام دہاکام کی نصیحت حکیمانہ سے نصیحت پکڑیں" ملاحظہ ہو تہذیب الاخلاق جلد دوم مطبوعہ مطبع مصطفائی لاہور سنہ ۱۳۱۲ھ صفحہ ۱۵۹

اب دیکھئے مولوی شبلی صاحب دیور کے ساتھ جیٹھ کو اور اسکے ساتھ اس مثل کو بھی مبتذل قرار دیتے ہیں یا نہیں + ۔ تا بہت ہیچ دان ۔

(بالخصوص عورتوں کی زبان میں) نہیں ہے[۱]۔ ہاں خوب یاد آیا۔ ایک صاحب نے مجھ سے ذکر کیا۔ کہ بنگالہ میں اور اُس کی سرحد کے قریب عورتیں دیور کو دیورا کہتی ہیں۔ شاید مولوی صاحب نے اسی خیال سے اعتراض فرمایا ہوگا۔ کہ دیورا کیوں نہ باندھا۔ (واللہ اعلم) + اب دُوسری لفظ ناڑہ لیجئے۔ تمام محلات شاہی لکھنؤ کی مستورات اور تمام لکھنؤ کی شریف وضع کی عورتیں سالگرہ کا ناڑہ ہی پہلے بھی بولتی تھیں۔ اور آج بھی بولتی ہیں۔ اور لکھنؤ کے مرد بھی ناڑہ سالگرہ کا کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی مرزا صاحب نے حضرت زینبؑ کی زبانی نظم فرما کر فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے۔ اس کے عوض بھی فصحائے لکھنؤ بالخصوص عورتوں کی زبان میں دُوسری لفظ ہی نہیں ہے[۲]۔ واضح ہو۔ کہ لکھنؤ والے سالگرہ کا ناڑہ اور محرم کا ناڑہ بولتے ہیں۔ جناب شیخ ناسخ مرحوم فرماتے ہیں ۔ ؎

ہے محرم اُس پری پیکر کو ناڑا چاہیے[۳]　　جلد رنگ اے دیدۂ خوں بار اب تار نگاہ

اس کے ساتھ یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے ناڑے کو کیوں مبتذل لفظ سمجھا۔

ناڑہ

---

[۱] اس موقع پر یہ بھی لکھ دوں۔ کہ یہ جواب مَیں نے لفظ دیور کی نسبت دیا ہے۔ اور میری غرض یہ ہے۔ کہ دیور مبتذل لفظ نہیں ہے ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ مصرع اُس مرثئے میں نہیں ہے جو حضرت دبیرؔ کے پڑھنے کا جناب مرزا اوج مدظلہ کے پاس موجود ہے۔ اور وہ جناب مرحوم کے کاتب مرحوم کا قلمی ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے یہ حال مجھے معلوم ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بند کسی اور ذاکر نے لکھ کر ملا دیا۔ مگر میری غرض صرف اتنی ہے کہ دیور کا لفظ مبتذل نہیں ہے۔ یہ حاشیہ ناظرین کی اطلاع کیلئے لکھا گیا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۲] واضح ہو کہ "لفظ" دہلی میں بالعموم مذکر بولا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے اکثر خاندان مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں۔ خاندان جناب مرزا دبیر مرحوم میں یہ ترجیح ہے۔ کہ دونوں طرح بولتے ہیں۔ اسی خیال سے مَیں نے اس کتاب میں کہیں مؤنث کہیں مذکر لکھا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

[۳] مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ کے لائق و محقق مؤلف نے کتاب مذکور کی جلد چہارم کے صفحہ ۵۲ پر ناڑہ کو کلاوہ کے معنی پر جہاں لکھا ہے وہاں یہی شعر جناب ناسخ مرحوم کا سند میں دیا ہے۔ جو اُن کی کمال معلومات زبان کی دلیل ہے۔ اور اُنکی کوشش قابل داد ہے۔ اچھی کتاب بہت محنت سے لکھی ہے۔ سالگرہ کا ناڑہ آج بھی لکھنؤ کے شاہی خاندانوں اور شرفا میں بولا جاتا ہے۔ مولوی شبلی صاحب بیاہر صاحب چاہیں۔ اُن معزز و شریف خاندانوں میں تحقیق و تصدیق فرمالیں + ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

لفظ

غالباً اُن کا خیال اس طرف گیا۔ کہ اکثر بیرونی ناڑہ آزاربند کو کہتے ہیں۔ سو واضح رہے۔ کہ لکھنؤ کے شرفا (جن کی زبان فصیح اردو سمجھی جاتی ہے) ہرگز آزاربند کے معنی پر ناڑہ نہیں بولتے۔ اور جو اہل دہات وقصبات پڑھے لکھے ہیں۔ وہ بھی ناڑہ آزاربند کے معنی پر نہیں بولتے۔ ہائے اردو آج یہ روز بد تجھ کو دیکھنا نصیب ہوا۔ کہ جاہل دیہاتیوں کی زبان کی بنا و خیال پر تجھے نشانہ تیر ملامت بنایا جاتا ہے۔ تیرے فصیح الفاظ کو مبتذل خطاب دیا جاتا ہے۔ دیکھئے کل کیا تیری قسمت کا لکھا پیش آئیگا۔ اب ایک بات اور مجھے کہنا ہے۔ وہ یہ کہ مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ "مرزا صاحب واقعہ نگاری و معاملہ بندی میں میر صاحب کی تقلید کرتے ہیں" دروغ بے فروغ ہے۔ میں روایت سے۔ درایت سے۔ تاریخ سے یہاں تک کہ خود میر انیس صاحب مرحوم کے قول (مندرجہ واقعات انیس) سے ثابت کر چکا ہوں۔ کہ مرزا صاحب کی شہرت میر صاحب سے مقدم ہے۔ اور برس چھ مہینہ مقدم نہیں۔ بلکہ ~~پچیس~~ تیس برس مقدم ہے۔ کہ اُس زمانے تک میر صاحب لکھنؤ آئے ہی نہ تھے۔ پھر مرزا صاحب کیا خواب و خیال میں اُن کی تقلید کر لیتے۔ خصوصاً اُن سیکڑوں (یا ہزاروں) مرثیوں میں جو اوّل اوّل (۳۰ برس کے اندر) اُنہوں نے کہے ہیں۔ اور میر صاحب کے لکھنؤ میں آنے پر بھی نہ کوئی منصف مزاج مرزا کو میر کا مقلد کہہ سکتا ہے۔ نہ میر کو مرزا کا۔ ایک معاصر دوسرے کا مقلد نہیں سمجھا جاتا خدا جانے مولوی صاحب کس ملک کی اصطلاح بولتے ہیں۔ جو مدِّمقابل کو مقلد کہتے ہیں مقلد کے لئے ضرور ہے۔ کہ یا تو اُس کا شاگرد یا متبع ہو۔ یا زمانہ مابعد میں ہو۔ جیسے ہمارے مولوی صاحب بے سر و پا بے سوچے سمجھے اعتراض فرماتے میں نساخ بنگالی کے مقلد ہیں۔ جیسا کہ اس زمانہ میں اُن کے اعتراضوں کو دیکھ دیکھ کر منصف مزاج لوگ کہہ رہے ہیں۔ یہ بالکل نئی اپیچ ہے۔ جو مولوی صاحب مرزا مرحوم کو میر صاحب کا مقلد بتاتے ہیں۔ آج تک کسی انیسئے نے بھی مرزا صاحب کو میر صاحب کا مقلد نہ کہا تھا +

میر صاحب کی تقلید کا الزام مرزا صاحب پر

دبیر اور مبتذل الفاظ

علم دوست منصف مزاج ناظرین! میں چالیس سال سے برابر مرزا صاحب کا کلام دیکھتا رہتا ہوں۔ اور اب پانچ سال میں (جب سے حیات دبیر لکھنے کا عزم بالجزم کیا) اُن کا تمام کلام جس قدر مجھے ملا بہت نظر غور و انصاف سے میں نے دیکھا۔ مرزا صاحب بھی آخر بشر تھے۔ فرشتے نہ تھے۔ اُن کے کلام میں بھی قبح و عیب نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے اب تک اُن کے کلام میں ایک لفظ بھی ایسی نظر نہ آئی جس کو مبتذل کہا جا سکے۔ افسوس مولوی شبلی صاحب ایسے متین و مہذب و ذیعلم شاعر پر ایسا (مبتذل الفاظ لانے کا) الزام لگاتے ہیں جس سے اُن کے کلام کو کچھ بھی لگاؤ نہیں۔ ع اے عدالت انسے کیا کہتے ہیں*

اعتراض دبیر پر

(۵) صفحہ ۲۶۰ پر مرزا صاحب کا یہ شعر لکھ کر ؎

تم جا نو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ　　　اکبر سے میں گذری مِرِ والی کو لے آؤ

مولوی صاحب (غیر مہذب الفاظ میں) اعتراض کرتے ہیں۔ کہ "تم جانو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ" اس محاورے کے ابتذال سے قطع نظر کر کے یہ امر کس قدر خلاف مقتضائے حال ہے۔ کہ کوئی شریف عورت یہ کہے۔ کہ میں اپنے بیٹے سے درگذری۔ میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو۔ پیدا کرو" اب میں مولوی صاحب سے کہتا ہوں۔ کہ تم جانو

جواب

جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ" یہ ہرگز مبتذل روزمرہ نہیں ہے۔ مگر آپ نے جو اُس کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ کہ "میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو" یہ الفاظ غیر مہذب ہیں اور جب کہ ان کی نسبت ایک امامؑ کی زوجہ کی طرف ہے (جو ایک امام کی والدہ ماجدہ بھی ہیں جن کو ہم گروہ شیعہ اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں)۔ تو آپ کا ان کریہ الفاظ میں مطلب ادا کرنا بیشک ہمارے گروہ کی دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر میں قانونی شکنجہ کا خیال اپنے ہم خیالوں کو نہیں دلانا چاہتا۔ الحمد للہ علی السراء والضراء* کہکر صبر کرتا ہوں

* خدا کا شکر ہے ہر سختی و نرمی پر + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور یہ کہتا ہوں۔ کہ "روٹی کھاؤ" "کھانا کھاؤ" "آئیے کھانا نوش فرمائیے" "زہر مار کیجئے" سب کا مآل گو ایک ہو۔ مگر لفظوں کے اختلاف سے ان کے اثر میں تریاق و زہر کا ایسا فرق ہے۔ میرے بادشاہ (شوہر) کو ڈھونڈھ کر لاؤ۔ دوسرا جملہ ہے۔ "شوہر کو پیدا کرو" دوسرا لغو جملہ ہے۔ اب دوسری بات کا جواب باصواب سنئے۔ میں قبل جواب دینے کے آپ کی توجہ ایک حدیث صحیح بخاری کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ایک مشہور صحابی نے حضور صلعم سے عرض کیا تھا کہ ؎ دوست دارم ترا ازیں و ازاں۔ لیک محبوب ترنئے از جاں*۔ جس کا جواب درگاہ حضور صلعم سے جو ملا۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ نہیں مجھے اپنے نفس سے بھی بڑھ کر دوست رکھیگا جب تو مومن ہو سکتا ہے۔ یہ سُن کر اُن بزرگوار نے بھی یہی کہا۔ کہ ہاں تمام چیزوں سے بڑھ کر دوست رکھتا ہوں۔ اور اپنے نفس سے بڑھ کر دوست رکھتا ہوں۔ اب سمجھئے۔ کہ ہم لوگ امام حسینؑ کو کیسا اور کیا سمجھتے ہیں مختصر یہ کہ بعد رسول اللہ صلعم امام زمانہ بالکل جانشین و قائم مقام رسولؐ ہے۔ بس ایک وحی اُس کے پاس نہیں آتی۔ اور جو خصائص رسول ہیں۔ وہ اُس کو حاصل نہیں ہیں۔ باقی اُس بزرگوار کی وہی عزت وہی عصمت وہی عظمت ہے۔ جو رسولؐ کی ہے۔ یہ تو مذہب شیعہ کی بنا پر گفتگو تھی۔ مذہب سنّت و جماعت کی رُو سے امام حسینؑ نبیؐ کے

*۔ یہ مثنوی مطبوعہ خطاب فاضل (جناب مفتی صاحب طاب ثراہ) کا شعر ہے۔ جو ۳۰ سال پہلے دیکھی تھی۔ اتفاقیہ یاد رہ گیا۔ پوری حدیث صحیح بخاری چھاپہ دہلی جزو ۴ صفحہ ۹۸۱ پر دیکھئے یہ ہے۔ حدثنا یحییٰ بن سلیمان۔ قال حدثنی ابن وهب قال اخبرنی حیوة قال حدثنی ابوعقیل زهرة بن معبد انه سمع جده عبدالله بن هشام قال کنا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو اخذ بید عمر بن خطاب فقال له عمر یا رسول الله لانت احب الی من کل شئ الا نفسی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا والذی نفسی بیده حتی اکون احب الیک من نفسک فقال له عمر فانه الان والله لانت احب الی من نفسی فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الان یا عمر۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں مختلف لفظوں و بہت سے طریقوں سے آئی ہے۔ مآل سب کا یہی ہے۔ کہ مومن وہی ہے جو حضور صلعم کو اپنی دولت۔ اولاد۔ آبرو۔ جان سب سے بڑھ کر دوست رکھے ۱۲ مؤلف حقیر۔

حدیث صحیح بخاری

ایضاً

واجب التعظیم نواسے ہیں۔ جن کی شان میں حضور صلعم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ "دمک دمی لحمک لحمی"۔ اے حسینؑ تیرا خون میرا خون ہے تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔ مذہب حضرات صوفیہ کے مطابق ۶۰ھ ہجری کے غوث امام حسینؑ تھے۔ مختصر یہ کہ قریب قریب ہر عقیدہ کے مسلمان کی بنا پر حضرت امام حسینؑ سے جناب شہر بانوؑ کے دو رشتہ ہوئے۔ (۱) رشتۂ زوجیت۔ (۲) رشتہ و تعلق آقائی۔ پس رشتہ آقائی کی بنا پر ضرور ہے۔ کہ وہ امام حسینؑ کو اپنی اولاد۔ مال۔ آبرو۔ جان سب چیزوں سے بڑھ کر دوست رکھیں۔ جب تو مومنہ ہیں۔ ورنہ معاذ اللہ مومنہ نہیں۔ مرزا صاحب جناب شہر بانوؑ (مادر امام زین العابدینؑ) کو اعلے درجہ کی مومنہ کاملہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے اُن کی زبان سے کہتے ہیں۔ ۵

تم جا لو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ　　　اکبرؑ سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ

واقعہ کا خلاصہ بھی سن لیجئے۔ حضرت علی اکبرؑ شہید ہو چکے ہیں۔ اُن کے ڈھونڈھنے کو لشکر مخالف میں ایک طرف خود جناب امام حسینؑ گئے تھے۔ دوسری جانب ماہ بنی ہاشم جناب عباسؑ گئے تھے۔ امام حسینؑ ابھی واپس نہیں تشریف لائے۔ حضرت عباسؑ لاش کو ڈھونڈ کر جب لاش نہ ملی تو گھر چلے آئے۔ اور اہلبیت کرام سے پوچھا ع کیا لاشۂ اکبرؑ نہیں لائے شہ والا۔ اب نبیؐ زادیوں میں بڑی تشویش پھیلی۔ اور یہ اندیشہ و خیال ہوا۔ کہ دشمنوں نے امام حسینؑ کو شاید قید کر لیا۔ جناب شہر بانوؑ نے اصرار کر کے (تلاش لاشۂ علی اکبرؑ کے واسطے) امام حسینؑ کو بھیجا تھا۔ اس لئے اُن کو زیادہ صدمہ ہوا۔ اس بنا پر وہ شاہزادی حضرت عباسؑ سے فرماتی ہیں۔ کہ "اکبرؑ سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ"۔ اگر لاشۂ علی اکبرؑ

ئلہ حضرات صوفیہ غوث کو ویسا ہی قائم مقام پیغمبرؐ کا سمجھتے ہیں جیسا شیعہ امام عصرؑ کو۔ گویا غوث و امام میں صرف لفظی فرق ہے معنی میں دونوں ایک ہیں۔ ہمارے امام عصرؑ کا ایک لقب غوث بھی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

۵۲ جس مرثیہ کا میں یہ خلاصہ اور یہ مصرع لکھ رہا ہوں۔ وہ دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے۔ اور اس کا مطلع یہ ہے۔ ۵ معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے ۱۲ مؤلف حقیر۔

نہیں ملتا۔ تو خیر۔ امام حسینؑ تو زندہ آجائیں۔ آپ کو معلوم نہیں۔ کہ ان سب مخدرات عصمت نے اپنے اپنے بچوں کو اپنی سعادت اور اپنا فرض ایمانی سمجھ کر امام حسینؑ پر نثار کردیا تھا۔ آپ مرزا دبیر مرحوم سے ہرگز یہ توقع نہ رکھیں۔ کہ وہ مادر امامؑ کی نسبت وہ خیال باندھینگے۔ جو عام عورتوں کے خیال کے موافق ہو ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر

یہی خصوصیات اور حفظ مراتب خاندان رسالت کے خیالات ہیں۔ جن کی بدولت مرزا دبیر تمام مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں۔ آپ انہیں اچھی چیزوں کو بُرا کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ موازنہ میں جو میزان آپنے قائم کی ہے۔ اُسی میں اس قدر جھونک ہے۔ کہ ٹھیک وزن معلوم ہونا دشوار ہے۔ بلکہ نافہم کم علم آدمیوں کو تو دھوکا ہوتا ہے +

اعتراض میر صاحب پر

(۶) صفحہ ۲۲۹ پر موازنہ میں مولوی صاحب میر صاحب پر اعتراض کرتے ہیں۔ اور اس پردہ میں لسّاخ کی پیروی کا دم بھرتے ہیں۔ (یعنی یہ لکھا ہے۔ کہ جو اعتراضات صیحح لسّاخ نے چھوڑ دئے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ اُنہیں میں سے یہ اعتراض بھی ہے)۔

؎ بُت توڑ کے کعبہ کو صفا کردیا کس نے

لفظ صفا پر ایراد ہے۔ کہ "صاف" کردیا چاہئے۔

جواب

مَیں کہتا ہُوں۔ کیوں صاف کردیا چاہئے۔ ضرور "صفا کردیا" چاہئے آپ پُوچھئے کیوں؟ مَیں عرض کرتا ہُوں۔ صفا پاک کے معنی پر ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ بتوں کو توڑ کر کعبہ کو نجاست شرک سے پاک کردیا۔ صفا کی رعایت لفظی کعبہ سے ہے۔ کہ صفا ومروہ دو مقام مشہور[*] کعبہ کے متعلق ہیں۔ "صاف کردیا" کہتے۔ تو یہ بات کب نصیب ہوتی۔

[*] انٹرنس کورس مطبوعہ مطبع صوفی ۱۸۹۶ء مرتبہ مولوی شبلی صاحب میں (سفرنامہ ناصر خسرو میں) صفحہ ۶۷ پر مکہ معظمہ کے بیان میں یہ فقرہ ہے "از مسجد حرام برجانب مشرق بازارے بزرگ کشیدہ است۔ از جنوب سوئے شمال۔ در سر بازار از جانب جنوب کوہ ابو قبیس است و دامن کوہ ابو قبیس صفا است"۔ اس سے مَیں کہہ سکتا ہُوں۔ کہ صفا سے اسکول کے نیچے تک واقف ہیں۔ پھر معلوم نہیں کیونکر اس کو اُس مجموعہ کے مدوّن کرنیوالے مولوی شبلی صاحب ناواقف ہونگے۔ ۱۲ مولف حقیر۔

صفا و مولانا روم

اب رہی یہ بات کہ صفا پاک کے معنی پر صحیح و مستعمل بھی ہے یا نہیں۔ اس کی سند ہم آپ کو آپ ہی کی کتاب سوانح مولانا روم کے صفحہ ۴۷ سے دیتے ہیں۔ ؎

کیا فائدہ غیر پردہ کھولے جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

صفحہ مذکور پر آپ یہ شعر مثنوی شریف کا پڑھئے۔ ؎

روزن دل گر گشا دست و صفا میرسد بے واسطہ نور خدا

یہاں بھی صفا پاک کے معنی پر استعمال فرمایا ہے۔ میر صاحب مرحوم نے بھی اسی معنی پر نظم کیا ہے۔ اسی معنی پہ فارسی و اردو میں بولا جاتا ہے۔ آپ کی ناواقفیت کی تو کوئی حد ہی نہیں +

اعتراض پروانگی پر اور جواب حکایت شیخ علی حزین و سودا

(۷) پھر اسی صفحہ ۲۲۹ میں یہ دوسرا اعتراض میر صاحب پر جڑا ہے ؎ برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی۔ اعتراض یہ ہے۔ کہ پروانگی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں اعتراض غلط ہے۔ پروانگی اردو کا محاورہ ہے۔ اجازت و حکم کے معنی پر دن رات بولتے ہیں۔ اور قریباً تمام ہندوستان میں بولتے ہیں۔ مشہور ہے۔ کہ جب مرزا سودا جناب شیخ علی حزین کی خدمت میں پہنچے۔ تو شیخ نے مصرع پڑھا ؎ دریں بزم رہ نیست بیگانہ را۔ مرزا سمجھے۔ کہ شیخ چاہتے ہیں مصرع لگاؤ۔ یہ (حاضر جواب) بولے ع کہ پروانگی داد پروانہ را۔ شیخ نے پوچھا "پروانگی چہ" مرزا بولے "پروانگی بجائے اجازت و رخصت اہل ہند میگویند" شیخ بولے "بلے۔ خوش گفتی" شیخ حزین بیچارے تو ایرانی تھے۔ اگر اس محاورہ ہندی سے نابلد تھے۔ تو حق بجانب تھا۔ مگر تعجب ہے۔ کہ مولوی صاحب ہندی نژاد ہو کر ایسے ا[illegible] کر اعتراض کرتے ہیں۔ اور پھر ایسی زبان دانی پر دبیر و انیس کے کلام [illegible] (ج) بنتے ہیں۔ ع العجب ثم العجب ثم العجب +

میر صاحب پر اعتراض حصول

(۸) اسی طرح صفحہ ۲۲۹ میں میر صاحب کے اس مصرع پر اعتراض کیا ہے۔ ع جو خوبیاں کہ چاہیں وہ سب حصول ہیں۔ اعتراض یہ ہے۔ کہ "حاصل" کہنا چاہئے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ حاصل اور حصول دونوں اردو کے اور خاص کر لکھنؤ کے محاورے

ہیں۔ جیسے عربی میں زیدٌ عدلٌ میں بجائے عادل کے عدل بولا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں حصول حاصل کی جگہ بولا جاتا ہے۔ اگر آپ ناواقف ہیں۔ تو میرے ساتھ کسی لکھنؤ کی محفل یا مجلس میں چلئے۔ اور اپنے کانوں سے کان کھول کر سن لیجئے۔ غالباً کوئی نہ کوئی یہ کہتا ہؤا مل جائیگا۔ کہ مولوی شبلی صاحب کوئی بیرونی شخص ہیں۔ سُنا ہے۔ کہ اُنھوں نے دبیرو انیس کے محاوروں پر بھی اعتراض کئے ہیں۔ کوئی اُن سے یہ تو کہے۔ کہ فضول اعتراض کرنے سے کیا حصول۔ بقول آتش مرحوم ؎

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

یا بقول کسی ایرانی شاعر کے (جس کا نام و تخلص مجھے معلوم نہیں)۔ ؎

تا چیست فسانہ ات بہ بازار
در خانہ شو از بروں خبر دار

فصل ۵ اتہام کا داغ

تیسرا داغ۔ اتّہام کا

جیسے انگریزی خواں اصحاب سفید جھوٹ بولتے ہیں۔ ناظرین! دیکھئے۔ مولوی شبلی صاحب نے یہاں تک انصاف سے کام لیا ہے۔ کہ جو مرثیہ غلط سلط مطبع نولکشور صاحب آنجہانی میں چھپ چکے ہیں۔ اُنہیں کے غلط الفاظ اور غلط مصرعوں تک اپنے اعتراضوں کو وسیع نہیں رکھا۔ بلکہ سُنے سُنائے مصرعوں کو بھی مرزا مرحوم کے سر منڈھ دیا۔* چنانچہ

اعتراض نمبر صفحہ ۲۸۷ زیر قدم والدہ فردوس الخ

(۱) صفحہ ۲۸۷ پر موازنہ میں فرماتے ہیں "مرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرع ہے۔ زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے۔ اس میں جتنے الفاظ ہیں۔ زیرہ۔ قدم۔ والدہ۔ فردوس۔ بریں۔ سب

* حالانکہ انکو لازم یہ تھا کہ جس کلام مرزا صاحب پر اعتراض کرتے۔ کم سے کم اُسکو دفتر ماتم میں تو دیکھ لیتے کہ ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ مرزا محمد رضا صاحب معجز مرحوم تطہیر الاوساخ میں لکھ چکے ہیں اور زمانہ جانتا ہے کہ نولکشوری مطبوعہ جلدوں میں دبیر کے مرثیوں میں بہت کلام غیر شامل ہے۔ اور مرزا محمد رضا صاحب کی کتاب کا مولوی شبلی صاحب نے موازنہ میں حوالہ دیا ہے اور نقل قول فرمایا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ کتاب مولوی صاحب دیکھ چکے ہیں۔ مگر وہ کلام مرزا مرحوم کی طرف عائد کر کے اعتراض کئے۔ جو نولکشوری جلدوں میں بھی نہیں ملتا۔ دفتر ماتم میں تو قطعی نہیں ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرع پیدا ہُوا ہے۔ وہ اس قدر بھدّا اور گراں ہے۔ کہ زبان اُس کا تحمل نہیں کر سکتی*۔ شاید تم کو خیال ہو۔ کہ مصرع کی ترکیب چونکہ فارسی ہوگئی ہے۔ اس لئے ثقل پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں۔ لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں۔ ؎

میں ہُوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں ۔۔۔ میں ہُوں سردارِ شباب چمنِ خلد بریں

پہلے مصرع میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافات بھی موجود ہے۔ لیکن یہ بھدّا پن اور ثقل نہیں ہے"+ میں عرض کرتا ہُوں۔ کہ اس کا جواب تو وقت پر ہی مولوی شبلی صاحب کو مل گیا۔ اور منصف مزاج سخن شناسوں نے لکھ دیا۔ کہ "ع زیرِ قدم والدہ فردوس بریں" میں کسی قسم کا ثقل یا بھدّا پن بالکل نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو صلاحِ سخن لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۰۷ء جس میں منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت (قابل اڈیٹر) نے مولوی صاحب کو معقول و دنداں شکن جواب دیا۔ اور صاف لکھا۔ کہ "مصرع مذکورہ میں کوئی ثقل کوئی سبب تنافر نہیں ہے۔ اور میر صاحب کے مصرع پیش کردہ (ع میں ہُوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں) میں علاوہ چار اضافتوں کے یہ غرابت بھی ہے۔ کہ شباب کے مشہور معنی جوانی کے ہیں۔ سنتے ہی سامع کا ذہن اُس طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور جوانی کے معنی لینے سے مصرع کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اس مصرع میں شباب کے معنی جوانوں کے ہیں۔ یہ شاب کی جمع ہے۔ مگر اس معنی پر شباب اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ اس لئے غریب ہے"۔ اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ "کوئی وجہ نہیں ہے۔ جو مصرع اوّل الذکر (دبیر) پر اس مصرع (انیس) کو ترجیح

*۔ ناظرین آپ کو ایمان کی جان اور انصاف کے سر کی قسم ہے۔ دو چار مرتبہ اس مصرع کو پڑھئے۔ بالکل ثقالت اور بھدّا پن نہیں ہے۔ مولوی صاحب ایسا بھدّا بتاتے ہیں۔ کہ اُن کی زبان تحمل نہیں کر سکتی۔ خدا جانے اُن کی زبان کیسی ثقیل ہے۔ مصرع ہرگز ثقیل نہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

جواب

صلاح سخن لاہور

دی جائے۔ بلکہ عام فہم ہونے کے لحاظ سے دبیر کا مصرع قابل ترجیح ہے"۔ خیر میری غرض میر صاحب کے مصرع پر اعتراض کرنے سے نہیں ہے [یہ خلاصہ منشی صاحب موصوف کی رائے کا ہے۔ جو ایک منصف مزاج بے تعلق آدمی ہیں۔ اور میں میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کو قابل تعظیم و تقلید سمجھتا ہوں۔ بلکہ میر صاحب کی تائید میں یہاں تک کہتا ہوں۔ کہ گو شباب جوانوں کے معنی پر اردو میں مستعمل نہ ہو۔ مگر جب کہ شباب اصل اصل حدیث کی بجنسہ لفظ ہے (الحسن والحسین سیدا شباب اھل الجنۃ الحدیث) تو میر صاحب کا خاص اس موقع پر نظم فرمانا قابل گرفت نہیں ہے] میری غرض اس موقع پر اس ذکر سے یہ ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب نے یہ مصرع مرزا صاحب کی طرف منسوب کر کے اُن مرحوم پر اتہام کیا ہے۔ بیسیوں جلدیں دفتر ماتم کی اور دونوں جلدیں مطبع نولکشوری کی (جو باوصفیکہ سر سے پاؤں تک غلط چھپی ہیں۔ کلام غیر بہت سا شامل ہے) دیکھ جائیے۔ آپ کو ہرگز یہ مصرع نہ ملیگا۔ اور ملے کیونکر۔ مرزا صاحب کا مصرع ہی نہیں ہے حکیم قدیر الدولہ قدیر شاگرد رشید مرزا صاحب کا یہ مصرع ہے۔ جس مرثیہ میں یہ مصرع ہے اُس کا مطلع یہ ہے ؎

ارشاد مجھے آج یہ ہے لوح و قلم سے۔ یہ پورا مرثیہ میرے پاس موجود ہے۔ اس کا پورا بند یہ ہے (جس میں یہ مصرع بتغیر قافیہ ہے):۔

مادر کی اطاعت نہ کروں میں تو خطا ہے
زیر قدم والدہ فردوس علا ہے
زینبؑ کا ادب والدہ صاحب سے سوا ہے
بیٹا مجھے اپنا پھوپھی اماں نے کیا ہے
تو جانتا ہے مجھ پہ جو احسان کئے ہیں
پالا بھی ہے اور بیٹے بھی قربان کئے ہیں*

* میں دیکھ رہا ہوں کہ مرزا صاحب کے بعض تلامذہ کے مرثئے لوگ اپنی طرف منسوب کر کے پڑھتے ہیں۔ کوئی صاحب کسی ڈوسرے خاندان کے کسی صاحب کا نام لے دیتے ہیں۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ حیات دبیر کی تالیف سے فارغ ہو کر دو تین جلدیں تلامذہ مرزا صاحب کے مرثیوں کی چھپواؤنگا۔ بشرطیکہ حیات مستعار نے وفا کی۔ ورنہ خیر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ممکن ہے کہ پھر اور کوئی صاحب یہ کام کریں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

یہ مصرع انیسیوں اور دبیریوں کی باہمی چوٹوں میں اکثر انیسیئے میر صاحب کے اس مصرع کے مقابلہ میں ع کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے" پڑھا کرتے ہیں۔ اور واقفِ راز دبیریوں کے یہ جتانے پر کہ یہ مصرع ہی دبیر کا نہیں۔ شاگرد دبیر (قدیر) کا ہے۔ کیا آپ قدیر کے مقابلہ پر میر صاحب کو قائم کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے۔ تو مقابلہ کیجئے چشم ما روشن الخ} انیسئے چپ ہو جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے بلا تحقیق اوّل تو اس مصرع کو مرزا صاحب کا بتایا۔ نہ دفتر ماتم میں نہ ہر دو جلد مطبع نولکشوری میں ڈھونڈھا۔ دوسرے ثقیل بتایا۔ جو ثقیل نہیں۔ تیسرے فردوس علا کی جگہ فردوس بریں لکھ دیا۔ یک نہ شد دو شد سُنتے تھے۔ یہ سہ شد ہوئی۔ خدا جانے۔ مولوی صاحب کے دل میں مرزا صاحب کی طرف سے کیا بھرا ہوا ہے۔ جو فصیح و سلیس کلام بھی اُن کو ثقیل نظر آتا ہے۔ اپنی سلیم المذاقی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور اتہام کرنے پر بھی کامیاب نہیں ہوتے +

(۲) صفحہ ۵۵ و ۵۶ پر (موازنہ میں) میر صاحب کی یہ مشہور و منتخب بیت

نکلا نہ مُنہ سے یہ کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جُھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

یُوں بتغیر الفاظ لکھی ہے۔

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جُھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

خیر اس میں تو ایک باریک فرق ہے۔ جس کو باریک بین اردو کے اہلِ زبان سمجھ سکتے ہیں*۔ اور ممکن ہے۔ کہ مولوی صاحب کو چھاپہ میں یہ ٹیپ یُونہی ملی ہو۔ مگر اس کے بعد جو مولوی صاحب کے مُنہ سے مرزا مرحوم کے حق میں پھول جھڑے ہیں۔ وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں "اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔ کہ اسی واقعہ کو مرزا دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے ع فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

اعتراض اتہام نمبر ۲ فرمایا میں حسینؑ الخ

* وہ باریک فرق یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں کہا۔ کہا ایک معنی پر مولوی شبلی صاحب نے لکھ دیا ہے۔ یہ ذرا مخل فصاحت ہے۔ ایسی پاس پاس ایک ہی لفظ ایک ہی معنی پر لانا بعض فصحا مخل فصاحت سمجھتے ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کی جو بحث ہے۔ اُس کے فیصلے کے لئے دونوں کے صرف یہ دو مصرع کافی ہیں"+

جواب باصواب

انصاف پسند اور انصاف پرست ناظرین! اس موقع پر تو میں مجبور ہو کر اتنا کہتا ہوں۔ اور میرے نزدیک یہ کہے بغیر رہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کی بیجا طرفداری اور تحکم جتا دینے کے واسطے (آپ صاحبوں کو بھی ایک موقع دکھا دینا کافی ہے۔ ذرا دیکھئے تو مولوی صاحب مرزا صاحب کی تنقیص کے واسطے کیسے کیسے رنگ بدلتے ہیں۔ شطرنج کی سی چالیں چلتے ہیں۔ اتہام سے بھی نہیں چوکتے۔ پھر فرمائیے۔ ایسے بزرگوار کیا انصافانہ فیصلہ فرما سکتے ہیں؟ خدا جانے کس شاعر لامعلوم الاسم کا مصرع مرزا صاحب کے سر تھوپتے ہیں۔ اگر مقابلہ منظور ہے۔ تو اس بیت سے کریں (جو دفتر ماتم کی پانچویں جلد کے سب سے اول مرثیہ میں ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا)۔ وہ بیت یہ ہے ؎

مجروح تیر و خنجر و تیغ و سنین ہیں ‎ ‎ اے عاشق حسین ہمیں تو حسین ہیں*

کہ اس بیت میں علاوہ سلاست بندش کے مظلومیت و مجروحیت کی دلکش تصویر لفظوں میں کھچی ہوئی ہے۔ مجلس میں یہ ایک ٹیپ ایک مرثیہ کا کام کر جاتی ہے۔ سامعین سُن کر تڑپ جاتے ہیں۔ افسوس کہ مولوی صاحب نے (وہ مصرع فرضی تو لکھ دیا جس کا دفتر ماتم میں کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ مگر) یہ بیت مقابلہ پر نہ لکھی۔ جو یقیناً مرزا صاحب کی ہے۔ مگر بقول بعض دبیریوں کے مولوی صاحب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ منظور تو اُن کو یہ تھا۔ کہ ہر پہلو سے مرزا صاحب

* مرزا صاحب نے اس مضمون کو بہت سے مرثیوں میں متعدد اسلوبوں سے نظم فرمایا ہے۔ چند اشعار ذیل میں لکھتا ہوں۔ (۱) ایک۔ پہلوان یزید ابطحی نے میدان جنگ میں پوچھا ہے ؎ تم کون ہو؟ فرمایا غریب الوطن ہوں۔ بطحی کا نبی زادہ حسینؑ بن علیؑ ہوں۔ (۲) واللہ ابن فاتح بدر و حنین ہوں۔ میں بیکس و غریب مسافر حسینؑ ہوں۔ (۳) مظلوم ہوں ناچار ہوں اور تشنہ جگر ہوں۔ تو زائر حیدرؑ ہے میں حیدرؑ کا پسر ہوں۔ (۴) ارشاد کیا شاہ نے باد یدۂ پُرخوں عباسؑ نہیں میں تو حسینؑ ابن علیؑ ہوں۔ (۵) حضرتؑ نے کہا میں ہوں وہی بیکس و تنہا مظلوم حسینؑ بن علیؑ دلبر زہراؑ + ۱۲ مؤلف حقیر۔

کے کمالات کو مٹائیں - اور اُن کو مرجوح و مفضول بنائیں - پھر وہ واقعی اور اچھا کلام دبیر مقابلہ پر لکھ کر گیا اپنے تمام دعویوں پر پانی پھیر دیتے - اس جرأت اور اس تحکم پر ہزار آفرین +

اعتراض تلوار کی معشوقانہ وضع پر ۳۳

(۳۳) صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۱ پر میر صاحب کے تین شعر تلوار کی معشوقانہ وضع کی تعریف میں لکھے ہیں - جن میں سے اخیر کا اور سب سے بہتر شعر یہ ہے - ~

سج اس کی ہے پسند جہاں گو سجی نہ ہو   معشوق پھر نہیں کہ جو اتنی کجی نہ ہو

اور پھر لکھا ہے - کہ بقول علامہ ثعلبی تلوار کی معشوقانہ (ایسی) مدح محاسن شاعری میں داخل ہے - پھر مرزا صاحب پر مولوی صاحب نے عنایت و توجہ مبذول فرمائی ہے - اور فرماتے ہیں کہ "لیکن یہ بہت نازک موقع ہے - رزم میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا استعمال وہیں تک جائز ہے - جہاں تک کلام کا اثر نہ جانے پائے - اور کلام میں ابتذال نہ آ جائے - مرزا دبیر صاحب نے بھی میر انیس کی تقلید کرنی چاہی - لیکن کلام کا یہ رنگ ہو گیا - (تلوار کی تعریف) - ~

جب خون میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی   غُل یہ تھا - کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

جواب دینے سے پہلے میں کہتا ہوں - کہ ع آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو - واہ مولوی صاحب - نہ جانے کس مبتدی مبتذل شاعر کی ٹیپ ہے - یا آپ نے خود ہی فکر فرمائی - اور مرزا صاحب کے سر تھوپ دی ہے - نہ یہ دفتر ماتم میں کہیں ہے - نہ کسی کی زبانی آج تک سُنی - نہ مرزا صاحب کی متانت نظم کی شان کے شایاں ہے - مرزا صاحب کے نام پر یہ ٹیپ منسوب کر کے آپ نے طرفداران و تلامذہ مرزا صاحب کے خون میں ایسا جوش پیدا کر دیا - کہ صاحب ردّ الموازنہ کو جواب میں یہ لکھنا پڑا - کہ استغفر اللہ یہ ٹیپ نہ جانے کس مسخرے کی ہے - ہرگز مرزا صاحب کی نہیں - نہ مطبوعہ ہے - نہ ملحقات سے ہے - جب کلام مطبوعہ مرزا صاحب میں بھی یہ ٹیپ نہیں ہے - تو آپکو ہرگز نہ لکھنا چاہئے تھی - میں نے

بعض اصحاب کو یہ کہتے ہوئے سُنا تھا۔ کہ مولوی صاحب نے کتاب موازنہ دبیر و انیس اُس زمانے میں لکھی۔ کہ جب شیعہ اور سُنی گروہوں میں جا بجا لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے یہ خیال فرمایا تھا۔ کہ شیعوں میں دبیریوں اور انیسیوں کا مباحثہ پہلے جوش پیدا کیا کرتا تھا۔ مناسب ہوگا۔ کہ ایک ایسی کتاب لکھ دو۔ کہ شیعوں میں پھر وہ جوش تازہ ہو جائے۔ اور سُنیوں و شیعوں کی لڑائی اس طرح مٹ جائے۔ مگر اب اس تیس چالیس برس میں شیعوں کے خیالات ہی بدل گئے تھے۔ انیسیوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اوّل نمبر پر میر صاحب ہیں دُوسرے نمبر پر مرزا صاحب۔ اسی طرح دبیریوں نے مرزا صاحب کو اوّل نمبر پر اور دُوسرے نمبر پر میر صاحب کو مان لیا تھا۔ اور یہ دونوں گروہوں نے تسلیم کر لیا۔ کہ کاملی دونوں بزرگوار ہیں۔ کوئی رنگ اُن کے کلام میں کھلتا ہوا ہے۔ کوئی ان کے کلام میں زیادہ دل کو لُبھاتا اور بہاتا ہے۔ اور بغیر دونوں کے کلام پڑھے ہوئے کام نہیں چل سکتا۔ یہ ممکن نہیں۔ کہ شیعوں کی کوئی ایسی بستی ہندوستان میں ہو۔ جہاں مجلس ہوتی ہو اور ان دونوں صاحبوں کا کلام (تحت لفظ یا سوز میں) نہ پڑھا جاتا ہو۔ اگر واقعی مولوی صاحب نے اُسی نیّت سے یہ کتاب لکھی تھی (گو اب تک اصل نیّت کا قابل اطمینان پتہ نہیں چلا ہے) تو میں اس باب میں مولوی صاحب کو قابل مدح سمجھتا ہوں۔ کہ واقعی اُن کی نیّت بخیر تھی۔ وہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں (سُنّی و شیعہ) کی لڑائیوں کو مٹانا چاہتے تھے۔ اور ایک صاحب کو دُوسرے صاحب سے بہتر سمجھنا بھی کوئی ایسا امر نہیں۔ جو قابل الزام ہو۔ کیونکہ ایسی طبیعتیں بہت کم ہیں۔ جو ہر کامل کے اجزائے کمال کا اندازہ کرکے جس جس رنگ میں جو بڑھا ہوا ہے۔ اُس کو صاف بتائے۔ دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی فیصلہ کر دے۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے۔ کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھا ہوا بتایا جاتا ہے۔ اگر مولوی صاحب نے بھی ایسا کیا۔ تو کیا بُرائی ہے۔ البتہ یہ افسوس ہے۔ کہ مولوی صاحب نے مرزا مرحوم پر اتہام بھی لگائے۔ اور مرزا صاحب کی طرف اُس کلام کو

منسوب کیا ہے۔ جو کسی صورت سے اُن کا نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب کو اگر ایسا کلام مرزا صاحب کا دکھانا تھا جس میں تلوار کی معشوقانہ مدح ہو۔ مقابلۃً دکھانا تھا۔ تو یہ بند لکھتے۔ جو دفتر ماتم کی جلد دوم مرثیہ (آدم کا دادرس بنی آدم میں کون ہے) میں ہے۔

جس مورچے میں لیلیٰ تیغ دو سر گئی　　چنگے بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی
ہر سُو نے خاک اُڑائی اِدھر سے اُدھر گئی　　پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی
عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا　　جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

مگر افسوس مولوی صاحب نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ اور بجائے ایسے کسی بند کے پیش کرنے کے مرزا صاحب کی طرف اُس مبتذل شعر کو منسوب کر دیا۔ جو اُن کا نہیں ہے۔ نہ اُن کی متانت کلام کے شایاں ہے۔ ناظرین! آپ فرمائینگے۔ کہ مرزا صاحب کا کلام بہت ہے۔ مطبوعہ بیس[20] جلدوں میں کہاں تک مولوی صاحب ڈھونڈتے۔ اس لئے اُنہوں نے یہ بند مقابلۃً نہ لکھا۔ مگر نہیں۔ یہ عذر نہیں چل سکتا۔ کیونکہ ایک دُوسرے موقع پر مولوی صاحب نے (رَدّ میں اور کلام کے ساتھ) صفحہ ۲۵۸ پر یہ بند مرزا صاحب کا لکھا ہے۔ پھر کیونکر مانا جا سکتا ہے۔ کہ یہ بند اُن کے خیال و یاد میں نہیں تھا۔ یہ جو بار بار مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب میر صاحب کی تقلید کرتے ہیں۔ اس کا کہاں تک میں جواب دوں۔ اور کیونکر مولوی صاحب کے ذہن نشین کروں۔ کہ جناب میر صاحب سے مرزا صاحب کی تصنیف و شہرت مقدم ہے۔ اور نہ وہ میر صاحب کے نہ میر صاحب اُن کے مقلد ثابت ہوتے ہیں۔ دونو صاحب مجتہد نظم ہیں۔ اور مرزا صاحب کے ذکر میں مولوی صاحب کا لفظِ ابتذال لانا مولوی

* اس موقع پر ضیافت ناظرین کتاب میں ایک بند مرزا مرحوم کا لکھ کر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو تلوار کی معشوقانہ وضع کی مدح میں اُس مرثیہ میں ہے جو اب تک چھپ نہیں۔ اور خقیر کے پاس ہے۔ مطلع اُس مرثیہ کا یہ ہے۔ ع اے آسمان زمینِ عدم میں نہاں ہو آج۔ ع مجنوں کی برق آہ تھی برہا میں چمک گئی۔ فرہاد کا وہ تیشہ بنی کوہ تک گئی۔ شیریں کی تھی کلائی لچکی اور مڑک گئی۔ لیلیٰ کی تھی کمر کہ چلی اور لچک گئی۔ گاہے دلور کے پردہ سے منہ ڈھانکنے لگی۔ زخموں کے روزنوں سے کبھی جھانکنے لگی ۱۲ مؤلف حقیر۔

صاحب کی سخن فہمی کی دلیل ہے۔ مرزا صاحب ایسے عالم جید شاعر کو ابتذال سے کیا کام۔ ابتذال کا کہیں نام اُن کے کلام میں نہیں ہے۔

اعتراض ۴ دا اہتمام

(۴) صفحہ ۲۶۶ و ۲۶۷ پر مولوی شبلی صاحب نے میر صاحب کے دو بند اور مرزا صاحب کے دو بند پردہ کے اہتمام کے باب میں لکھے ہیں۔ مَیں اس موقع پر صرف میر صاحب کے بند لکھتا ہوں۔ مرزا صاحب کے بند آئندہ قلمبند کرونگا۔ (میر صاحب):-

بیت الشرف خاص سے نکلے شہِ ابرار — رونق ہوئی ڈیوڑھی پہ گئی عترت اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار — پردہ کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دوسرا کے — شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں سے ہوا کے
لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے — آتا ہو ادھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے — دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریمؑ سے سوا حق نے شرف ان کو دئے ہیں — افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

یہ خیال رہے۔ کہ میر صاحب نے مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت کا یہ حال لکھا ہے۔ دونوں بزرگواروں کے بند لکھنے کے بعد مولوی صاحب گوہر افشانی فرماتے ہیں۔ کہ "دونوں بزرگوں نے عورتوں کے پردے کے اہتمام کا سماں باندھا ہے۔ لیکن میر صاحب نے اس مضمون کو اس فصاحت و بلاغت سے ادا کیا ہے۔ کہ اس کے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی میر صاحب کی ناقدردانی ہے۔ روانی۔ شستگی۔ خوبی محاورہ چستی بندش کے علاوہ بلاغت کے نکتوں پر لحاظ کرو۔ میر صاحب نے پردے کے اہتمام اور لوگوں کے ہٹانے اور روکنے کو حضرت عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہے۔ جس سے حضرت زینبؑ کی عظمت و شان کے اظہار کے علاوہ اصلی واقعہ کی مطابقت ہوتی ہے۔ کیونکہ تمام معزز خاندانوں میں پردہ کا اہتمام خاندان کے ممبر کیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب نے یہ کام بالکل فروباتوں۔

نقیبوں اور لونڈیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ جس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے۔ کہ یا تو گھر میں کوئی مرد تھا ہی نہیں۔ یا تھا تو اُس کو عورتوں کی چنداں پروا نہ تھی۔ پردہ کے اہتمام میں نقیبوں کا کیا کام ہے۔ لونڈیوں کے غل مچانے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ادب و شائستگی نہیں پائی جاتی"۔

جواب

اب مجھ کو یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ کہ مولوی صاحب نے مرزا صاحب پر اتہام لگایا۔ مرزا صاحب مرحوم نے یہ کام بالکل نقیبوں اور دربانوں اور لونڈیوں کے سپرد ہرگز نہیں فرمایا۔ مولوی صاحب کی ہوشیاری داد دینے کے قابل ہے۔ بلکہ یوں کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ اس عالم پیری میں ماشاء اللہ چشم بد دور حافظہ ایسا قوی ہے۔ کہ مرزا صاحب کا اوپر کا ایک بند کا بند اُڑا گئے۔ اس لئے کہ اگر تینوں بند لکھ دیتے۔ تو اُن کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملتا۔ پہلے تو مجھ کو خیال ہوا۔ کہ شاید اوپر کا ایک بند چھاپہ میں اُڑ گیا ہو۔ اور نہ چھپا ہو۔ مگر جب میں نے دفتر ماتم کی چھٹی جلد میں یہ مرثیہ دیکھا "دستِ خدا کا قوتِ بازو حسینؑ ہے" اور صفحہ ۲۰۵ پر اوپر کا بند بھی موجود پایا۔ تو مجھے سخت رنج ہوا۔ کہ افسوس ہمارے ملک کے ایک مشہور مصنف ایسی غلط بیانی سے کام لیں۔ اب تینوں بند مجھ سے سُنئے۔ اور ناظرین انصاف و ایمان سے فرمائیے۔ کہ مرزا صاحب نے بالکل اہتمام پردہ کا کس کے سپرد کیا ہے۔ اور اوپر آپ میر صاحب کی نظم کی زیارت فرما چکے ہیں۔ یہ بھی غور فرمائیے۔ کہ ان بندوں میں آمد صفائی بندش۔ روانی۔ آداب شاہی کی رعایت کس قدر ہے۔ یہ واضح رہے۔ کہ مرزا صاحب نے کربلا میں پہنچ کا اہل حرم کا سواریوں سے اُترنا نظم فرمایا ہے:۔

ہوشیاری

ایک بند اُڑ گیا

آوازِ دور باش کا ناگاہ غل اُٹھا ۔۔۔ اور خیموں میں اُترنے لگی آلِ مصطفےٰ

ڈیوڑھی سے پر [illegible] زینبؑ کو یہاں ملا ۔۔۔ خود اہتمام کرنے لگے شاہِ کربلا

روکی قنات، اکبرؑ و قاسمؑ نے آن کر
عباسؑ گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر

دربان عصا اٹھا کے بڑھے جانب یسار
وہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلّائیں بار بار
آئے اُدھر سے اب نہ کوئی جائے ہوشیار
آواز غیر سُن کے وہ اندیشہ کرتی ہیں
آہستہ بولو دخترِ زہراؑ اُترتی ہیں

عظمت جناب زینبؑ میں تاکید:-

عفّت کے جتنے مرتبے خیر النساؑ نے پائے
وہ ماں کے بعد دخترِ مشکل کشاؑ نے پائے
ہاں ہاں مسافروانہ کوئی غُل مچانے پائے
ناقہ پہ بیٹھ کر نہ اِدھر کوئی آنے پائے
حسن ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جس کا کہ قامت بلند ہو

آداب شاہانہ

اب غور فرمائیے۔ اوّل تو اہتمام پردہ جناب زینبؑ کو مرزا صاحب نے خود بنفس نفیس جناب امام حسینؑ سے متعلق فرمایا۔ کہ جو جناب ابوالفضل العباسؑ سے بدرجہا افضل ہیں۔ اور پھر مزید اہتمام یہ کہ قنات شاہزادہ علی اکبرؑ و شاہزادہ قاسمؑ نے روکی۔ اور حضرت عباسؑ نیزہ تان کر بہادرانہ شان سے پھرنے لگے۔ اُس کے بعد فرماتے ہیں۔ دربان و نقیب عصا اٹھا کر شاہی قاعدہ سے دہنی اور بائیں طرف ہٹ گئے۔ اب جب غیر مرد دُور چلے گئے۔ تو اہلبیت اطہار کی لونڈیوں نے خیمہ کے دروازے پر آکر آواز دی۔ کہ ~~س~~ آئے اِدھر سے اب نہ کوئی جائے ہوشیار۔ ہوشیار کی لفظ کو دیکھئے۔ کہ خاص ایسے موقع پر شاہی کنیزیں یہی لفظ بولتی ہیں۔ اور آواز تو لونڈیاں ہی دیتی ہیں حضرت عباسؑ یا اور کسی بزرگ خاندان کا یہ کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میر صاحب نے بھی آواز دینے کو جناب عباسؑ سے منسوب نہیں فرمایا۔ بلکہ وہاں حضرت عباسؑ خادموں کو حکم فرمارہے ہیں۔ کہ ع دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے* اور ظاہر ہے۔ کہ آواز مرد کی بہت

* میر صاحب نے آواز دینے کو فراشوں سے متعلق فرمایا ہے۔ اور مرزا صاحب نے کنیزوں سے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اہلبیت اطہارؑ کی لونڈیاں مرتبہ میں فراشوں سے کہ جو غیر ہیں بدرجہا بہتر ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

دُور جاتی ہے۔ مولوی صاحب! غالباً یہاں بھی آپ اپنی خوش فہمی سے یہی فرمائینگے۔ کہ غُل مچانے اور چلانے سے ادب اور شایستگی نہیں پائی جاتی۔ آپ کو کیونکر سمجھاؤں۔ کہ جناب یہ عین شایستگی اور ادب ہے۔ جب شاہزادیاں اُترتی ہیں۔ تو لونڈیاں اسی طرح چلاتی ہیں۔ آپنے زمانہ شاہی میں نہ دہلی کے قلعہ مبارک کو دیکھا۔ نہ لکھنؤ کے محلات شاہی کے قریب تک رسائی نصیب ہُوئی۔ میر صاحب نے مدینہ منوّرہ سے روانگی کا سماں باندھا ہے۔ وہاں قریب قریب اور بھی مکانات ہونگے۔ اس لئے اُنھوں نے یہ خیال نظم فرمایا۔ کہ ع لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے۔ مرزا صاحب کربلا میں اُترنے کا سماں دکھاتے ہیں۔ وہاں آس پاس کوئی مکان کہاں تھا۔ سنسان جنگل دریا کے کنارے تھا۔ اس لئے اُن کو ایسے خیال نظم کرنے کی حاجت نہ تھی۔ مرزا صاحب کے بزرگ شاہان دہلی کے اتالیق اور میر منشی رہے تھے۔ خود اُنھوں نے زمانہ شاہی میں ہوش سنبھالا۔ بچپن ہی میں مرثیہ پڑھنے کی وجہ سے محلات شاہی لکھنؤ میں وہ بعزت و آبرو گئے۔ اور کئی شاہزادیاں اور شاہزادے اُن کے شاگرد و معتقد ہو گئے۔ کہ بعض اُن میں سے مرزا صاحب کو ابّا جان کہتی تھیں۔ اس شاہی پردہ کے سماں کو جس طرح مرزا صاحب نے دیکھا اور باندھا۔ کیا دُوسرا شاعر (جس کو ایسے موقع نصیب نہ ہُوئے ہوں) باندھ سکتا ہے؟ یہ سچ ہے۔ کہ میری پیدائش بھی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے۔ مگر بعض باقیات الصالحات محلات شاہی اور شاہزادیاں جو لکھنؤ میں رہ گئی تھیں۔ میں نے اُن کی سواریوں کے اہتمام دیکھے ہیں۔ مرزا صاحب نے کمال کیا ہے کہ وہ سب سماں کھینچ کر دکھا دیا ہے۔ اور پھر اُس کے ساتھ اہل بیتؑ رسالت کی شان پردہ داری کو اُس اعلےٰ درجہ پر قائم فرمایا ہے۔ جس سے زیادہ ترقی خیال میں نہیں آسکتی۔ کہ جناب زینبؑ کے پردہ کا اہتمام خود امام حسینؑ سے بھی منسوب کیا۔ جس سے اُن معظّمہ کی عظمت و وقعت اُس اہتمام پردہ سے بدرجہا زیادہ ہے۔

جس کا اہتمام صرف حضرت عباسؑ سے متعلق ہے۔ اب آپ اپنے اُس فقرہ کو ذرا غور سے پڑھئے۔ کہ "مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں اور لفنگیوں اور لونڈیوں کے سپرد کردیا ہے"۔ اور مرزا صاحب کی چستی بندش۔ حسن بیان۔ لطف زبان۔ روانی۔ بے ساختہ پن کو اور اُس کے ساتھ مضامین کی بلاغت کو (بے جا طرفداری کی دوربین آنکھوں پر سے ہٹا کر) دیکھئے۔ اور اپنے اس فقرہ کو (جو قدردانان مرزا صاحب کے دلوں پر نشتر کا کام کر گیا ہے) پڑھئے۔ کہ "کلام میر صاحب کے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی میر صاحب کی ناقدردانی ہے"۔ ہر چند سخت کلامی کا جواب سخت کلامی مشہور ہے۔ مگر میں مرزا دبیر جیسے فرشتہ خصال خوش اخلاق کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں۔ جن کا یہ قول ہے

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو ۔۔۔ مانند غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

اس لئے جواب میں بھی سخت کلامی نہیں کرتا۔ اور صرف اتنا کہتا ہوں۔ کہ جناب مولوی صاحب! جناب مومن دہلوی کے ایک مشہور مصرع پر میں نے مصرع لگایا ہے۔ آپ اس کو باواز بلند نہیں تو زیر لب ہی پڑھ دیجئے۔

یہ پہلا بند اس مجموعہ میں کیسا نکل آیا ۔۔۔ ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

(۵) صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۷ پر ایک بند میر صاحب کا "ادنے واعلے کا مقابلہ" سرخی (ہیڈنگ) لکھ کر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ یہ بند میر انیس کا مشہور ہے۔ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں بہت کوشش کی مختلف بحریں اختیار کیں بہت سی نئی تشبیہیں ڈھونڈیں۔ لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ ناظرین میں نے وہ بند مشہور میر صاحب کا بھی اور مرزا صاحب کا ایک بند بھی اُس موقع پر لکھ دیا ہے۔ جو باب مقابلہ کلام انیس و دبیر کا ہے۔ دونوں صاحبوں کے بندوں کے ابتدائی مصرعے یہاں لکھے دیتا ہوں۔ (انیسؔ) کچھ خار مغیلاں گل تر ہو نہیں جاتا

(دبیرؔ) ساماں سے کوئی صاحب بیاں نہیں ہوتا۔ دونوں بندوں کو مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے۔ اس کی تو بحث مجھ کو نہیں ہے۔ کہ کس کا بند بہتر ہے۔ میں مرزا کا بند بہتر بتاؤنگا۔ ممکن ہے کوئی صاحب میر صاحب کے بند کو افضل کہیں۔ مگر یہ کہنا مولوی صاحب کا کہ جواب میں مرزا صاحب نے کوشش کی اور کہا محض اتہام ہے۔ میں ثابت کرتا ہوں کہ مرزا صاحب کا بند پہلے زمانے کا ہے۔ اور اگر میر صاحب نے بھی اُس زمانے میں فرمایا ہوگا۔ تو وہ مرزا صاحب تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ یہ بند مرزا صاحب نے اُس مرثیہ مشہور میں کہا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎ سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل۔ اور یہ مرثیہ میر ضمیر مرحوم کے اس مرثیہ کے بعد ہی (عہد محمد علی شاہ یعنی ۱۲۵۰ھ کے قریب قریب) کہا تھا ؎ کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میر ضمیر صاحب کے مطلع سے مرزا مرحوم کا مطلع بھی ملتا جلتا ہوا ہے۔ اور میر ضمیر صاحب نے اس مرثیہ آخر الذکر میں سنہ تصنیف مقطع میں کہدیا ہے۔ ؎

جس سال لکھے وصف یہ ہمشکل نبیؐ کے سنہ بارہ سو اُنچاس تھے ہجر نبویؐ کے

پس مرزا مرحوم کا مرثیہ بھی ۱۲۴۹ھ یا سنہ ۱۲۵۰ھ کا ہے۔ اور میر انیس صاحب (سنہ ۱۲۵۸ ہجری سے عہد امجد علی شاہ شروع ہوتا ہے) سنہ ۱۲۵۸ ہجری میں یا اُس کے بعد لکھنؤ میں آئے۔ بعد اُس کے اُن کے جا بجا لکھنؤ میں پڑھنے پر اُن کی شہرت ہوئی۔ پس یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ مرزا صاحب اُس نظم کا جواب لکھیں۔ جو یا تصنیف نہیں ہوئی۔ یا اُن تک نہیں پہنچی۔ افسوس۔ مولوی صاحب کس یقین کے ساتھ لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں بہت کوشش کی۔ میں نہ کہونگا۔ کہ مولوی صاحب نے غلط بیانی میں بہت جرأت کی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوئے +

فصل ۶ چوتھا داغ ہوشیاری

چوتھا داغ ہوشیاری کا

ناظرین! دیکھئے ۔ مرزا صاحب کے کلام میں جو اصول مقررہ شاعری کے موافق حسن ہے ۔ اُس کو کس کس اینچ بینچ سے مولوی صاحب قبیح و عیب ثابت کرنے کی کوشش فرماتے ہیں ؛

(۱) مبالغہ جو ایشیائی ادب و شاعری کا ایک خداداد مسلّمہ حسن ہے ۔ اُس کی نسبت صفحہ ۷۷ و ۸۷ میں ابو نواس شاعر کا یہ مصرع لکھ کر ۵ یا امین اللہ عش ابدا (اے خدا کے امین تو ہمیشہ زندہ رہ) ابن قدامہ کا قول نقد الشعرا سے نقل کیا ہے ۔ کہ کسی شخص کا ہمیشہ زندہ رہنا ناممکن ہے ۔ اس لئے یہ مبالغہ معیوب ہے ۔ آگے بڑھ کر فرماتے ہیں ۔ کہ میر صاحب نے بھی یہی روش اختیار کی ۔ لیکن چونکہ ان کی اصل فطرت میں سلامت روی و اعتدال تھا ۔ اس لئے اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے بہت پیچھے رہ گئے ۔ اور یہی بات ہے ۔ جس کی بنا پر اُن کے حریف کہتے ہیں ۔ کہ وہ خیال بندی اور مضمون آفرینی میں مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ مَیں عرض کرتا ہُوں ۔ کہ ایک ابن قدامہ کے قول کو لے کر ہم کیا چاٹیں ۔ تمام عرب و عجم کی شاعری مبالغہ سے پٹی پڑی ہے ۔ کم سے کم لاکھوں شاعروں میں سے کوئی دو چار ہی شاعر ہم کو ایسے بتا دیں ۔ جو مبالغہ کو استعمال نہ کرتے ہوں ۔ بعض صاحب

بھاشا و سنسکرت

بھاشا کی شاعری کو اس بنا پر سراہتے ہیں ۔ کہ اُس میں تشبیہات و استعارات و مبالغہ نہیں ہوتا ۔ بیشک بھاشا کی شاعری کو مَیں بھی ایک حد تک پسند کرتا ہُوں ۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہُوں ۔ کہ جس طرح واقعہ کو سادہ سادہ صاف صاف بیان کر دینا ایک ہنر ہے ۔ اُسی طرح بلکہ اُس سے بڑھ کر تشبیہات و استعارات و مبالغہ معقول و مقبول کے ساتھ بیان کرنا مستحسن ہے ۔ جو لوگ بھاشا کی شاعری پر

مٹے ہوئے ہیں۔ اُن کی یہ مثال سمجھئے۔ کہ ایک خوبصورت لونڈی پرجان دیتے ہیں۔ اور ایک حسین نازک اندام خوش لباس بی بی کو گویا چھوڑتے ہیں۔ وہ حسین بی بی کون ہے؟

سنسکرت

بھاشا کے مقابلہ پر سنسکرت علمی زبان کی شاعری ہے۔ جس میں تشبیہ و استعارہ کے ساتھ ساتھ مبالغہ کی اسی طرح بہتات ہے۔ جس طرح عربی و فارسی میں افراط ہے۔

مبالغہ کی ضرورت و خوشنمائی

اور مبالغہ اس لئے خوش نما ہوتا ہے۔ کہ کلام میں زور آجاتا ہے۔ اور سامع کا ذہن اُس طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو زیادہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے بعض نئے تعلیم یافتہ مبالغہ وغیرہ کی جس قدر چاہیں مذمت کریں۔ کہ ہر شخص کی زبان اُس کے اختیار میں ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ ایشیائی شاعری کا دار و مدار تخئیل و مبالغہ و استعارہ و تشبیہ پر ہے۔ نظم پر کچھ منحصر نہیں۔ نثر کا بھی یہی حال ہے۔ اور اس سے وہ کتابیں بھی خالی نہیں ہیں۔ جن کو کروڑوں آدمی خدا کی مقدس کتابیں سمجھ رہے ہیں۔ میں اس موقع پر انجیل کی ایک

مبالغہ متعلق انجیل شریف

مشہور آیت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ خود مولوی شبلی صاحب کی زبان سے کہواؤں (جو مبالغہ کو سلامت روی و اعتدال کے خلاف سمجھ رہے ہیں) تاکہ اس مصرع مشہور کا مصداق ہو جائے ؏ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ وہ آیت مولوی صاحب نے سوانح مولا روم کے صفحہ ۹۰ پر ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے "یہ مضمون کہ انسان کو اپنے عیب نظر نہیں آتے۔ اور دوسروں کے عیب اچھی طرح نظر آتے ہیں۔ اخلاق کا متداول مسئلہ ہے۔ انجیل میں اس کو یوں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ "اے بنی آدم تو اوروں کی آنکھ کی پھلّی دیکھتا ہے۔ لیکن اپنی آنکھوں کا شہتیر نہیں دیکھتا"۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ آدمی کی آنکھ میں شہتیر ہرگز نہیں سما سکتا۔ مگر غرض اس مبالغہ سے یہ ہے۔ کہ سامع یہ یا ناظر کے دل پر اثر ہو۔ اور وہ سمجھے۔ کہ ہمارا بڑا عیب جو بمنزلہ شہتیر ہے۔ ہم کو نہیں دکھائی دیتا۔ دوسروں کا ذرا سا عیب بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔

قرآن شریف

اب لیجئے۔ قرآن شریف کو جو ہم مسلمانوں کا دین و ایمان ہے۔ اُس میں ایک

آیت ہے۔ مُوتُوا بِغَیظِکُم۔ جس کے ظاہری معنی یہ ہوئے۔ کہ تم اپنے غیظ و غصہ میں مر جاؤ۔ ظاہر ہے۔ کہ غصہ سے کوئی مر نہیں جاتا۔ مقصود صرف اثر پیدا کرنا ہے۔ کہ کیسا ہی سخت غصہ کرو۔ جو تم کو ہلاکت کے قریب پہنچا دے۔ پس مبالغہ کو خلاف واقع و کذب سمجھنا یا کہنا خود خلاف واقع و کذب کہنا ہے۔ اور جو لوگ کسی ایسی کتاب آسمانی کے قائل ہو کر ہر مبالغہ کو خلاف واقع و کذب وغیرہ کہتے ہیں۔ اُن کو یاد رہے۔ کہ اُن کا اعتراض بہت دُور تک پہنچتا ہے۔ البتہ شاعر کا سلیقہ اس میں ہے۔ کہ وہ مبالغہ کو عمدہ طریقہ سے استعمال کرے۔ ازبسکہ ہمارے مرزا مرحوم کے کلام میں یہ صنعت مبالغہ اور قوت تخئیل بہت بڑھی ہُوئی ہے۔ اس لئے مولوی صاحب نے مبالغہ و خیال بندی کو اس مکروہ پیرایہ میں اس کتاب موازنہ میں بیان فرمایا ہے۔ تخئیل سے بھی خدا کی کتاب خالی نہیں ہے۔ اس آیت کو لیجئے۔ طلعہا کانہ رؤس الشیاطین۔ جس کے ظاہری معنی یہ ہیں۔ کہ پھل اُس (زقوم) کے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔ یہ تخئیل نہیں تو اور کیا ہے۔ ورنہ شجر زقوم میں شیطانوں کے سر لٹکتے ہوئے کس نے دیکھے ہیں۔ اس کی مفصّل و مدلّل بحث جناب مفتی میر عباس صاحب طاب ثراہ نے کتاب مستطاب بناء الاسلام میں لکھی ہے۔ مَیں نے اس موقع پر اُس کا خلاصہ لکھ دیا۔ کہ یہ کتاب طولانی ہوتی جاتی ہے۔ ورنہ بہت کچھ لکھ سکتا تھا۔ تخئیل کی تعریف خود ہمارے شفیق مولوی شبلی صاحب نے بھی فرمائی ہے۔ مگر موازنہ میں وہ ایسی تعریف کرتے۔ تو غضب ہو جاتا۔ کہ مرزا دبیر اس صفت خاص میں جو شاعری کی جان ہے میر صاحب سے بہتر ثابت ہوتے۔ تخئیل کی تعریف مولوی صاحب نے سوانح مولانا روم کے صفحہ ۱۴۲ پر ان الفاظ میں فرمائی ہے "عام طبائع کے افہام اور تفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ (قیاس تمثیلی) ہے۔ استدلال تمثیلی کے لئے تخئیل کی بڑی ضرورت ہے۔ جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے۔ مولانا روم کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے۔ وہ یہی قوت تخئیل ہے"۔ مَیں کہتا

کلام دبیر و مبالغہ و تخئیل

تخئیل

ہوں۔ کہ کم سے کم (آنچہ برخود بپسندی بر دیگرے بپسند کی بنا پر) اگر اسی قوت تخیل کو کلام مرزا مرحوم سے موازنہ میں مولوی صاحب دکھا دیتے۔ تو بھی اُن کا موازنہ (شاید) میزان انصاف (عام لوگوں میں) سمجھا جاتا۔ آخر کیا وجہ کہ جو بات مولانا روم کے لئے طرۂ تاج ہو۔ وہ مرزا مرحوم کے واسطے باعث فخر و دلیل کمال نہ ہو۔ اور سلامت روی و اعتدال کے برعکس قرار دی جائے۔ ع اے عدالت اسے کیا کہتے ہیں؟

اعتراض ۲ پہلوان۔ کوہ گھوڑا۔ کبک دری

(۲) صفحہ ۳۸۳ پر میر صاحب کے دو مصرع (۱) گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا (۲) گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا۔ لکھ کر یہ لکھا ہے۔ کہ دیکھئے ہر موقع پر گھوڑے اور سوار کی تشبیہ کیسی اچھی نظم کی ہے۔ پھر عنان عنایت مرزا صاحب کی جانب (مولوی صاحب نے) معطوف فرمائی ہے۔ یہ بیت لکھ کر ع

وہ رخش یہ یا دیو تھا اسوار پری پر — غل رن میں اُٹھا کوہ چڑھا کبک دری پر

فرماتے ہیں۔ کہ کس قدر بیہودہ تشبیہ ہے۔ دشمن کو کوہ اور گھوڑے کو کبک دری کہنا مضائقہ نہیں۔ لیکن کوہ کا کبک دری پر چڑھنا کس قدر مہمل ہے +

جواب

میں کہتا ہوں۔ مولوی صاحب! آپ نے بھی ملک عرب کی سیر کی ہے۔ کچھ حصہ عراق عرب کا میں نے بھی دیکھا ہے (جہاں کے عراقی گھوڑے مشہور ہیں)۔ فرمائیے کیسے ڈبلے۔ پتلے۔ خوبصورت گھوڑے ہوتے ہیں۔ اُن کو کبک دری اور پری سے اور قوی ہیکل پہلوان سوار کو دیو اور پہاڑ سے تشبیہ دینا کیسی معقول تشبیہ (مع مبالغہ) ہے۔ اور جب گھوڑا کبک دری اور سوار کوہ ہوا۔ تو ضرور یہ کہا جائیگا کہ کبک دری پر کوہ چڑھا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ کوہ پر کبک دری ہوا کرتا ہے۔ مگر اس موقع پر اُلٹی بات نظر آتی تھی۔ آپ کے سر کی قسم تشبیہ نہ بیہودہ ہے نہ مہمل۔ بلکہ صنعت تضاد ہے۔ جہاں تک جناب کا ذہن نہیں پہنچا۔ یہ ایشیائی ادب و شاعری کی جان ہے۔ آپ بیہودہ فرماتے ہیں۔ خدا سمجھے۔ میں نہ آپ کو بیہودہ نہ آپ کے ارشاد کو مہمل کہونگا۔

عرب و عجم و ہندی و اردو کے شاعروں کے کلام ایسی تشبیہات اور ایسے الفاظ سے بھرے پڑے ہیں۔ کسی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اگر یہی جرم ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم نے بھی ایسی تشبیہ مع مبالغہ نظم فرمائی۔ تو اس کا جواب نہیں*

عکس و تبدیل

(۳) لفظوں کے اُلٹ پھیر سے ایک مضمون نکال لینا ایشیائی ادب میں (ایک) کمال کی دلیل اور صنعت مقبول ہے۔ عکس اس صنعت کا نام ہے۔ جیسا کہ صنائع و بدائع کے بیان میں میں بیان کر چکا ہوں۔ اس صنعت میں (۱) یہ آیت قرآن شریف کی پائی جاتی ہے۔ یُخرِج الحیَّ من المیّت و یُخرِج المیّت من الحیّ* اس میں حیّ و میّت کے اُلٹ پلٹ سے دوسرا جملہ پیدا فرمایا ہے۔ (۲) ایک فقرہ امام حسنؑ کا مشہور اور کتب احادیث و تواریخ میں مسطور ہے۔ کہ جب اُن جناب کی سخاوت و بخشش کا شہرہ سُن کر معاویہ ابن ابوسفیان نے اُن کو ایک خط میں لکھا تھا۔ کہ لا خیر فی الاسراف (فضول خرچی میں بہتری نہیں ہے)۔ تو آپ نے بلاغت و فصاحت کا کمال دکھایا۔ کہ انہیں الفاظ کو معکوس فرما کر اس جملہ کے برعکس مضمون جواب میں ادا فرمایا۔ وہ جملہ معکوسہ یہ ہے۔ لا اسراف فی الخیر (خیرات میں فضول خرچی نہیں ہے)۔ ایران و ہندوستان کی شاعری بھی محمدؐ و آلِ محمدؐ کے تصدّق سے اس پیاری صنعت سے خالی نہیں ہے۔ میں اس موقع پر صرف ہندوستان کے تین مشہور شاعروں کے تین تین شعر پیش کرتا ہوں۔ جو اپنے رنگ و بندش و مضمون میں لاجواب ہیں۔ اور جن میں الفاظ کو اُلٹ پلٹ کے مضمون نکالا ہے۔ (۱) دبیر الملک حضرت غالب (۲) خاقانی ہند ذوق (۳) شاعر آلِ محمدؐ دبیر۔ مرزا غالب مرحوم کا (فارسی میں) اس صنعت میں مشہور شعر ہے۔ جو مجھے بہت

اشعار غالب ذوق دبیر

* زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے خدا پیدا کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے پیدا کرتا ہے ۱۲ مؤلف عقیل۔

جناب غالب

پسند ہے۔ وہ یہ ہے۔ ؎

یار دستنبو بدستم داد و دستم بو گرفت وہ چہ دستنبو کہ دستم بوز دستنبو گرفت*

ازبسکہ ن ب کے پاس پاس آنے سے میم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ انبیا۔ عنبر۔ منبر۔ انبار کو امبیا۔ عمبر۔ ممبر۔ امبار لوگ پڑھتے ہیں۔ اس بنا پر ۵ جگہ پر دستنبو پڑھنے سے الفاظ کے (عکس و تبدیل سے) لطف پیدا ہو گیا جس کی خوبی صحیح المذاق سامع سمجھ سکتا ہے۔ دُوسرا شعر جناب ذوق کا (اُردو کا) سُنئے۔ ؎

جناب ذوق

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

یہ شعر بھی اس صنعت میں اعلےٰ درجہ کا ہے۔ لفظوں کے اُلٹ پھیر نے لفظوں کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور حقیقت میں شکایت دوست کی کی جاتی ہے۔ دشمن سے کیا شکایت۔ جیسے کہ میں جناب شمس العلماء مولوی شبلی صاحب سے دوستانہ شکایت کر رہا ہوں۔ کہ اُنہوں نے جناب مرزا مرحوم کے شعر تحت کو جو اسی صنعت میں ان دو شعروں کی طرح لاجواب ہے۔ گورکھ دھندہ بتا دیا۔ وہ شعر یہ ہے۔ ؎

حضرت دبیر رحمۃ اللہ علیہ

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے + دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

دیکھئے کتنا پاکیزہ اور سچا مضمون انصاف و دل صاف کے الفاظ کو الٹ پلٹ کر کے نکالا ہے جس کا مزہ زبان و دل لے رہے ہیں۔ وہ زبان و دل جو تعصب (بیجا طرفداری) سے پاک و صاف ہیں۔ مولوی صاحب اُس ہنر کو جو تمام شعرا کے لئے قابل تحسین ہے۔ مرزا مرحوم کے واسطے عیب و قابل نفرین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صفحہ ۲۸۴ پہ فرماتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب نے میر صاحب کے اس شعر کے (؎

اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے)

لفظوں کو اُلٹ پلٹ کیا ہے۔ لیکن کس بُری طرح سے کہ محض گورکھ دھندہ رہ گیا ہے"! میں کہتا ہوں۔ واہ مولوی صاحب اِس جرأت اور اِس دعوے پر آفرین

* مگر مجھے ابتک یہ شعر کلیات غالب مرحوم میں نہیں ملا۔ شاید اُن کا نہ ہو۔ اور کسی کا ہو۔ ۱۲ ثابت۔

ہزار آفرین ہے۔ آپ ایسی صنعت کو ایک تو گورکھ دھندہ بتاتے ہیں۔ دوسرے میر صاحب کے اُلٹے ہوئے لفظ۔ کیا آپ کو وحی ہوئی ہے۔ کہ میر صاحب نے یہ شعر پہلے کہا تھا۔ اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی الہام ہوگیا۔ کہ وہ مرزا صاحب نے سُنا بھی تھا۔ اگر واقعات کی بنا پر قیاس کو قائم فرمائیے۔ تو بالکل آپکے دعوے کے خلاف ثابت ہوتا ہے یعنی مرزا مرحوم کی شاعری و شہرت میر صاحب پر مقدّم ہے۔ غالباً یہ شعر بھی اُنھوں نے پہلے کہا ہوگا۔ اگر یہ قیاس صحیح نہ مانا جائے۔ تو یہ ماناجائیگا۔ کہ میر صاحب نے مرزا صاحب کا شعر شانہ برعکس۔ آپ کس کس تدبیر و ترکیب سے مرزا صاحب کے حسن کلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ وہ کمال ہے۔ جو کسی کے مٹائے سے نہیں مٹ سکتا۔ اور اُس شاعر آلِ محمدؐ (دبیر) کی زبان فال (اور سچی پیشینگوئی) آج زمانے پر ثابت ہو رہی ہے (وہ فال زبان یہ شعر اُن کا ہے)۔ ؎

الصاف ملکِ نظم میں کلمہ پڑھے مرا
میں ہوں نہ ہوں جہاں میں رُتبہ بڑھے مرا

واقعی آج ملک نظم میں خود الصاف کلمہ پڑھ رہا ہے۔ (دبیر) ؎

الصاف تو کہتا ہے خداوند تو ہیں یہ
منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے

(۳۴) مولوی صاحب موازنہ کے صفحہ ۲۳ پر یہ دعوے کرتے ہوئے (کہ میر انیس مرحوم مرزا دبیر مغفور سے زیادہ فصیح الفاظ لاتے ہیں۔ اور مرزا صاحب غریب و ثقیل لفظ استعمال کرتے ہیں) لکھتے ہیں۔ کہ ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں۔ وعدہ تو یہ کیا تھا۔ کہ بالمقابل دونوں کاملوں کے شعر لکھینگے۔ مگر اس ہوشیاری اور وعدہ خلافی کی شان کو دیکھئے۔ کہ ایک ایک مصرع لکھ کر رہ گئے۔ ناظرین! آپ کو معلوم ہے۔ کہ مصرع کو کوئی شخص شعر نہیں کہتا۔ ہوشیاری یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایسا نہ ہو۔ دُوسرا مصرع مرزا صاحب کا زیادہ فصیح ہو۔ تو دعوے خاک میں مل جائے۔ مگر خدا کی شان دیکھئے۔ کہ جو مصرع پیش کئے ہیں۔ اُن میں بھی اتفاق سے کوئی مصرع ایسا نہیں ہے۔ کہ جو ایک

اعتراض فصیح و ثقیل و وعدہ خلافی

بزرگوار (کے مصرع) کو دوسرے (کے مصرع) پر ترجیح دی جائے۔ نہ مرزا مرحوم کے مصرعوں میں کوئی لفظ غریب ثقیل ہے۔ میں وہ مصرع ذیل میں مع رائے لکھتا ہوں:-

نمبر	مصرع	مختصر رائے
۱	میر صاحب سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں مرزا صاحب کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	میر صاحب کا مصرع غلط لکھا ہے۔ اصلی مصرع یہ ہے ع سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں مطلب جُدا جُدا ہے۔ اس لئے نہ موازنہ صحیح ہو سکتا ہے۔ نہ کسی کے یہاں کوئی لفظ ثقیل و غیر فصیح ہے۔ مفصل بحث دوسرے موقع پر میں لکھ چکا ہوں +
۲	میر صاحب آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو مرزا صاحب آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو	الفاظ ہمیشہ وزن بحر کے تابع ہوتے ہیں۔ دونوں مصرعوں کی بحریں مختلف ہیں۔ جو الفاظ جس بحر کے لئے مناسب تھے۔ وہ ہر ایک کامل لایا ہے۔ الفاظ دونوں کے فصیح ہیں۔ مرزا کے مصرع میں مردم کے دو معنی ہیں۔ (۱) گروہ انسان۔ (۲) پتلی کے۔ یہ مزید خوبی ہے +
۳	میر صاحب حسرت ہے کہ خواب میں بھی رو دیا کیجے مرزا صاحب رویا میں بھی حسینؑ کو رویا ہی کرتے ہیں	اس میں بھی اختلاف بحر ہے۔ میر صاحب کے یہاں خواب و رویا کے الفاظ میں رعایت ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں ایک ہی لفظ رویا دو معنی پر آیا ہے۔ یہ صنعت ہے۔ ایک رویا بمعنی خواب دوسرے گریہ کرنے کے معنی پر۔ الفاظ دونوں کے فصیح و سلیس ہیں +
۴	میر صاحب جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے مرزا صاحب جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں	دونوں مختلف البحر ہیں۔ اور ایک حرف بھی ثقیل نہیں۔ اس کی بحث مفصل میں نے دوسرے موقع پر کی ہے۔ اور تمام بند لکھ کر کلام مرزا کی خوبیاں سمجھائی ہیں۔ میر صاحب کے مصرع کو بھی مولوی شبلی صاحب بُرا بتاتے۔ تو میں اس کی خوبیاں بھی یوں ہی سمجھا دیتا +

استعارہ وصنائع وغیرہ

(۵) مولوی شبلی صاحب نے صفحہ ۴۸ و ۵۷ و ۵۸ پر اور اس کے علاوہ موازنہ میں جابجا بلاغت وصنائع وبدائع اور واقعات کو تصویر کھینچ کر تقریر میں دکھانے کا بیان کیا ہے۔ جس کی تمام عبارت کے نقل کرنے میں طول ہوگا۔ اس لئے سب کا خلاصہ لکھتا ہوں (۱) استعارہ وتشبیہ اصل شاعری سے خارج ہیں۔ اگر بے تکلفی سے نیچرل (قدرتی) حالت میں آجائیں۔ تو زیور کا کام دیتے ہیں۔ (۲) صنائع وبدائع بھی اگر بے تکلفی سے آجائیں۔ تو حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ ورنہ شاعری ونثّاری کا دیباچہ زوال ہیں۔ (۳) تشبیہات واستعارات وصنائع وبدائع بلاغت سے تو متعلق ہیں۔ مگر شاعری سے نہیں۔ (۴) شاعری انسانی جذبات یا احساسات کا نام ہے * میں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کی یہ رائے کہ "تشبیہات واستعارات وصنائع وبدائع بے تکلفی سے آئیں۔ ورنہ دیباچہ زوال نظم ونثر ہیں" میرے نزدیک درست اور قابل قدر ہے۔ بیشک اگر بے تکلفی و متانت سے یہ چیزیں نہ آئینگی۔ تو دیباچہ زوال شعر وسخن ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ استعارے اور تشبیہوں وغیرہ کے لئے نیچرل رہنا ضرور ہے (فوق عادت بشری نہ ہوں)۔ اس کو مَیں نہیں مانتا۔ ورنہ تمام ایشیائی شاعری ونثّاری بلکہ بات چیت کرنے سے بھی دست بردار ہونا پڑیگا۔ اور ایسی باتوں سے وہ کلام بھی بھرے پڑے ہیں۔ جن کو کروڑوں آدمی کلام خدا کہ رہے ہیں۔ جیسا کہ مَیں اسی کتاب میں ایک جگہ بحث کر چکا ہوں۔ اور بائبل کی مشہور آیت خود مولوی شبلی صاحب کی کتاب سوانح مولانا رُوم سے لکھ چکا ہوں۔ "اے بنی آدم تُو اوروں کی آنکھ کی پھُلّی دیکھتا ہے۔ لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتا"۔ اگر فوق عادت بشری نہ ہونے کا نام ہی شاعری ہے۔ تو بائبل کے تمام کلام کو خلاف بلاغت ماننا پڑیگا۔ یا کوئی صاحب (جو اس کے مدعی ہوں) کسی بڑی آنکھ والے کی آنکھ میں شہتیر داخل کر کے مجھے آنکھوں سے دکھا دیں۔ تو مَیں گویا ایمان لے آؤنگا۔ ایسے استعارات وتشبیہات زیور سخن نہیں۔ بلکہ حسن خداداد عروس سخن

تشبیہات وغیرہ نیچرل

ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جو چیزیں (صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات) بلاغت
سے متعلق ہیں۔ وہ شعر سے کیوں متعلق نہیں ہیں۔ اگر غور و انصاف سے دیکھا جائے
تو شعر خود ہی ایک صنعت ہے۔ اگر شعر بے بلاغت ہے۔ تو وہ محض تک بندی
ہے۔ بلاغت اصل شے ہے۔ اُسی کا ایک جزو اعظم تخییل و وجدان
ہے۔ جس کو مولوی صاحب نے انسانی جذبات یا احساسات کے لفظ سے یاد
کیا ہے۔ خیر اب یہ سمجھئے۔ کہ صنائع و بدائع وغیرہ عروس سخن کے لئے حسن خداداد
ہے۔ اگر اس سے تنزل کیا جائے۔ تو اس کو عروس سخن کا نفیس لباس کہنا
چاہئے۔ یہ تو ممکن ہے۔ کہ کوئی غریب اپنی دختر حسین کو اپنی مفلسی کی بدولت جہیز
میں زیور نہ دے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ بغیر لباس کے وہ لڑکی کو نکاح پڑھا کر
داماد کے حوالے کر دے۔ یہی مثال صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات کی سمجھئے۔
اگر کسی شاعر نے واقعات کی تصویر سادے الفاظ میں کھینچ دی ہے۔ تو اس کی یہی مثال
ہے۔ کہ ایک حسین عورت ہے مگر برہنہ۔ جس سے اُس کا رنگ و حسن سب خاک
میں مل گیا ہے۔ اور وہ آٹھ آٹھ آنسو رو کر زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے ع بے زری
کرد بمن آنچہ بقارون زر کرد۔ اس موقع پر ایک نکتہ باریک عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے
کہ [illegible] مرحوم (اکبر آبادی) کو نئی روشنی کے بعض اہل علم بے مثل شاعر
مانتے ہیں۔ مگر ایشیائی شعرا اُن کو شعرائے کاملین کے زمرے سے خارج
جانتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ اُن کے کلام میں صنائع و بدائع و حسن
تشبیہات و استعارات نہیں ہے۔ صرف نیچرل (قدرتی) رنگ کی تک بندی
ہے۔ اور کہیں کہیں ابتذال بھی بتایا جاتا ہے۔ از بسکہ انگریز غیر ملک کے
رہنے والے ہیں۔ اس لئے ابتذال (زبان اردو) کو وہ نہیں سمجھ سکتے۔
اُنہیں کی تقلید سے ہمارے ملک کے بعض اہل علم ہاں میں ہاں ملاتے

ہیں*۔ دیکھئے سید انشا بھی نظیر مرحوم کی طرح جابجا ایسے گُل کھلاتے ہیں۔ اُن کی نسبت یہ
تو بعض شعرا نے کہدیا۔ کہ طریقہ راسخہ شعرا کے موافق اُن کا کلام نہیں ہوتا۔ مگر شعرائے کاملین
کے زُمرے سے اُن کو کسی نے خارج نہیں کیا۔ وجہ یہی ہے۔ کہ اُن کے یہاں یہ سب یا اکثر
صنائع و بدائع و تشبیہات وغیرہ موجود ہیں۔ اور ابتذال سے پرہیز کرتے ہیں۔ بہرحال
مولوی شبلی صاحب نے یہ تمام کوششیں اس غرض سے کی تھیں۔ کہ مرزا صاحب کے کلام میں جو
صنائع و بدائع و تشبیہات و استعارات اعلےٰ درجہ پر ہیں۔ وہ اصل شاعری ہی سے
خارج ہو جائیں۔ مگر الحمد للہ کہ اُن کی سعی مشکور نہیں ہوئی۔ اور سخن شناسوں کے
نزدیک یہ چیزیں شاعری سے خارج نہ ہوئیں۔ اور نہ انشاءاللہ اُس وقت تک
خارج ہونگے۔ کہ جب تک یہ تمام کتابیں معانی و بیان کی دریابرد کردی جائیں۔
اور اگر یہ (معانی و بیان کی) کتابیں بھی بفرض محال نیست و نابود ہو جائیں۔ جب بھی
وہ کتابیں نہ مٹینگی۔ جو الہامی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ اور اُن میں یہ صنائع و بدائع و تشبیہات
و استعارات موجود ہیں۔ پس کلام دبیر مرحوم گویا زبان حال سے یہ مصرع (دبیر مرحوم کا) پڑھ رہا
ہے۔ ع **قرآں مٹے کسی کے مٹائے تو ہم مٹیں** +

* یہ تقریر عام شعرائے اردو کے مذاق کے موافق ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے۔ کہ ابتذال میں بھی نظیر مرحوم ایک حد تک قابل معافی بلکہ
لائق مدح ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ جب وہ ایک بازاری واقعہ یا بات لکھتے ہیں تو پھر بازاری محاورے لانا مقتضائے حال کے موافق ہے اور اس
رو سے یہ ایک جزو بلاغت ہے۔ مثلاً ع پھر ہم بھی چلے اور چلا ریچھ کا بچہ۔ اسمیں ریچھ کے بچے کے رکھنیولوں اور بازاری آدمیوں کے محاورے جوں کے توں لانا ایک
خوشنما ادا ہے۔ بعض شعرا یہ اعتراض فرماتے ہیں کہ نظیر نے باغ کو چھوڑ کر گویا گھورے کی (جہاں کوڑا پڑا رہتا ہے) تصویر اُتاری ہے۔ یہ بےسلیقہ بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ
جس طرح مصور کبوتر اور طاؤس کے ساتھ اُلّو اور چیل کی بھی تصویر اُتارتا ہے اور قابل مدح سمجھا جاتا ہے۔ اُسی طرح اگر ایک شاعر نے نفیس و مقدس مقامات و اشخاص
کے واقعات کو چھوڑ کر خرابات اور خراب آدمیوں کے حالات بھی آئینہ کرکے دکھا دئے۔ تو کیا برائی ہے۔ بلبل کے بچے کا تو تمام شعرا نام لیتے ہیں کوئی بیچارے
ریچھ کے بچہ کا بھی ذکر کرے۔ اور بازاری غریب آدمیوں کا مذاق بھی نظم کرے یا نہیں۔ گھورے کی تصویر اُتارنیوالا شاعر بھی شاعر ہی رہتا ہے۔ جس طرح مصور
باغ بھی مصور ہے۔ اور مصور مزبلہ (گھورے) کا بھی مصور ہی کہلائیگا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

فصل ۱۳ سخت کلامی اور چندرانے اور بنانے کا داغ

پانچواں داغ

یہ کیچڑ کا دھبہ نہیں ہے۔ بلکہ سخت کلامی اور بنانے اور چندرانے کا داغ ہے۔

بقول حضرت آتش مرحوم ؎

نہ چھوٹیگا چھڑا کر اس کو اے قاتل نہ بن لڑکا — وفاداروں کے خوں کا داغ کیا دھبہ ہے کیچڑ کا

اعتراض مولوی شبلی صاحب نمبر ۱

(۱) صفحہ ۲۴۴ پر بند ذیل مرزا صاحب کا (موازنہ میں) مولوی شبلی صاحب تحریر فرماکر

قابل ہیں سخن کے ہُوں سخن ہے مرے قابل — لیکن سخن شہرہ فگن ہے مرے قابل
رضواں کو جنت۔ یہ چمن ہے مرے قابل — موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل
شہرہ ہے یہ تائیدِ شہ جن و ملک سے — مضمون مرا گھر پوچھتا آتا ہے فلک سے"

فرماتے ہیں۔ (۱) سخن شہرہ فگن نئی ترکیب ہے۔ (۲) رضواں کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل۔ ناموزوں ترکیب ہے۔ یا یوں ہونا چاہئے تھا۔ کہ رضواں کو جنت چاہئے اور مجھ کو یہ چمن۔ یا یوں کہ رضواں کے قابل جنت میرے قابل یہ چمن ہے۔ (۳) چوتھے مصرع کی ترکیب کا بھی یہی حال ہے۔ (۴) ٹیپ کے دونوں مصرع قریباً باہم متناقض ہیں۔ شہرہ بھی انتہا کا ہے۔ اور مضمون کو گھر پہنچنے کی بھی ضرورت ہے۔ (۵) شاید یہ مراد ہو۔ کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہے۔ لیکن چونکہ مضامین کو مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہُوئی۔ اور آستانہ مبارک تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا۔

جواب

مولوی صاحب کی عبارت پر میں نے ۵ نمبر لگا دئے ہیں۔ کہ میں جواب نمبروار عرض کردوں۔ اور ناظرین کو جواب دیکھنے کے وقت آسانی ہو۔

سخن شہرہ فگن

(۱) "سخن شہرہ فگن"۔ اوّل تو یہ مرکب الفاظ ممکن ہے کہ مرزا مرحوم سے پہلے کسی کے کلام میں ڈھونڈھنے سے مل جائیں (جس کی مجھے فرصت نہیں)۔ بالفرض مرزا صاحب ہی نے پہلے پہل ان کو مرکب فرمایا۔ تو کون سا جرم کیا ہے۔ جتنے مرکب الفاظ آج کتابوں میں نظر آتے

ہیں۔ پہلے پہل کسی نہ کسی نے ترکیب دئے ہونگے۔ اگر جدت ہے تو یہ قابل مدح ہے۔ علم
معانی و بیان یا صرف و نحو کے اُصول کی رُو سے کوئی اعتراض ہوتا ہو۔ تو فرمائیے*+

حذف

(۲) رضواں کو جنت الخ۔ اس میں "چاہئے" کی لفظ محذوف ہے۔ ہر شاعر (ذیعلم)
کبھی کبھی بعض الفاظ شعر میں محذوف کر دیتا ہے۔ جس کو صحیح المذاق سامع قرینہ و عقل سے
سمجھ لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو۔ تو پھر نظم و نثر میں فرق ہی کیا ہے۔ مَیں اس موقع پر زیادہ

حضرت غالب

نہیں دو شعر مثالاً جناب غالب مرحوم کے لکھتا ہوں۔ (۱) ہزاروں خواہشیں ایسی
کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے "ہزاروں خواہشیں
ایسی" کے بعد یہ الفاظ "دل میں تھیں" محذوف ماننا پڑینگے۔ ورنہ دُوسرا مصرع سمجھ میں
نہ آئیگا+

جناب حالی

دُوسری مثال حذف الفاظ کی مَیں مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ مولوی خواجہ الطاف حسین
صاحب حالی کی کتاب یادگار غالب صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳ سے لکھ دُوں۔ کہ اس زمانے
میں من قال کے قدر شناس بہت کچھ ہیں۔ ما قال کے بہت کم۔ اور حق یہ ہے۔ کہ
خواجہ حالی صاحب مولوی شبلی صاحب کی نسبت شعر کا مطلب اچھا سمجھتے ہیں+
عبارت خواجہ حالی صاحب "مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دور جام۔ ساقی نے
کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ اِس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج
جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی" اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے
ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو۔ اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں۔ وہ بغیر ذکر کئے
دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے"+
ناظرین انصاف پسند! انصاف سے فرمائیگا۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے مصرع میں

*علماء و شعرائے یورپ کے مذاق کے موافق خوش سلیقگی سے پہلے پہل کوئی لفظ مفرد یا مرکب کا استعمال کرنا بھی شاعر کے کمال کی دلیل
سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہاں اُلٹا اعتراض کیا جاتا ہے۔ ع اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے+ ۱۲ مؤلف ہیچمدان۔

جو لفظ "چاہئے" محذوف ہے۔ وہ سخن فہم سامع کی سمجھ میں آتا ہے؟ یا نہیں؟ ضرور سمجھ میں آتا ہے۔ لہذا یہ حذف بھی حسن شعر سمجھا جاتا ہے۔ افسوس مولوی شبلی صاحب شعر کی خوبی کو زشتی سمجھ رہے ہیں +

(۳) چوتھے مصرع کی ترکیب پر بھی مولوی شبلی صاحب کا یہی اعتراض ہے۔ اور اس کا بھی یہی جواب باصواب ہے حقیقت حال یہ ہے۔ کہ اوّل تو مرزا مرحوم نے یہی چاروں مصرع کہے تھے۔ مگر ازبسکہ وہ بڑے انجام بیں شاعر تھے۔ ہر پہلو سے اپنے کلام کو دیکھا کرتے تھے۔ اُن کو بھی یہ خیال پیدا ہُوا تھا۔ کہ صحیح المذاق سخن فہم تو اس حذف کو محسّنات شعر سے سمجھیں گے۔ مگر بلید الذہن یا کم فہم شاید نہ سمجھیں۔ اس لئے پھر اُنھوں نے اوّل کے چاروں مصرعوں کو یُوں بدلا:۔

حقیقت حال کیا ہے

مدّاحی سلطان زمن ہم کو مبارک	جبریل کو وحی اور یہ سخن ہم کو مبارک
رضواں کو بہشت اور یہ چمن ہم کو مبارک	موتی کو صدف اور یہ عدن ہم کو مبارک
شہرہ ہے یہ تائید شہ جن و ملک سے	مضموں مرا گھر پوچھتا آتا ہے فلک سے

چنانچہ یہ مرثیہ شاید ۱۸۸۰ء کے قریب قریب جب میر عابد علی صاحب کے مطبع (حسینی اثنا عشری لکھنؤ) میں چھپا تھا۔ تو اُس میں یہ بند آخر الذکر لیہیں طبع ہُوا تھا۔ مجھے یہ واقعہ یُوں یاد ہے۔ کہ وہ مرثیہ میر صاحب ممدوح کو چھاپنے کو مَیں نے ہی دیا تھا۔ اور میرے قلمی مرثیہ میں بھی آخر الذکر چاروں مصرع موجود ہیں۔ بعد کو دفتر ماتم میں جب چھپا۔ تو وہ پہلے کے مصرع چھپ گئے (جن میں دو جگہ ایک لفظ "چاہئے" محذوف ہے) + یہ واقعی حال تھا جو مَیں نے لکھ دیا +

شہرہ اور گھر پوچھنا

(۴) ٹیپ کے دونوں مصرع باہم ہرگز متناقض نہیں ہیں۔ بیشک شہرہ انتہا درجہ کا ہے۔ جو کسی حاسد یا منکر کمال کے ٹالنے سے نہیں مٹ سکتا۔ اور پھر مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ جس کا شہرہ ہو۔ اُس کا گھر بھی

ہر شخص جانتا ہو مشہور شخص کا گھر پوچھتے ہوئے ہی نئے لوگ (شہروں اور ملکوں سے آتے ہیں۔ یہ بات تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور روزمرہ میں بولتے ہیں۔ کہ اُس شخص کا ایسا شہرہ ہے۔ کہ دُور دُور سے لوگ گھر پوچھتے ہوئے آتے ہیں۔ مثالاً مولوی شبلی صاحب ہی کو لیجئے۔ کہ اُن کا شہرہ ہے۔ اب جو کوئی اُن سے ملنے آئیگا۔ وہ اوّل یہ لوگوں سے پُوچھیگا۔ کہ مولوی صاحب لکھنؤ میں ہیں یا حیدرآباد یا بھوپال میں یا اور کسی مقام مناسب گاؤں وغیرہ میں۔ پھر لکھنؤ وغیرہ میں پہنچ کر محلہ کا پتہ پُوچھیگا۔ پھر محلہ میں جاکر گھر پُوچھیگا۔ ایمان سے فرمایئے باوصف شہرت کے گھر پُوچھنے کی اُس کو ضرورت ہُوئی یا نہیں۔ اور شہرت اور گھر پُوچھنے میں کونسا تناقض ہوگیا۔ پھر مولوی صاحب ہمارے مرزا مرحوم کی گویا رُوح سے مزاح کرتے ہیں۔ جو فرماتے ہیں۔ کہ "شاید مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے رُوشناسی نہیں ہُوئی۔ اور آستانہ مبارک پر پہنچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے گھر پُوچھنا پڑا۔" ناظرین! اب تو مجھے بھی اجازت دیجئے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کی خدمت میں ایک شعر آتشی پڑھ دُوں ؎

حضرت آتش رہ

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا
لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب!

مولوی صاحب یہ تو فرمایئے۔ کہ اگر آستانہ مبارک تک مضمون کی رسائی پہلے ہو چکی ہوتی۔ تو پھر اُس کو نیا مضمون کون کہتا۔ ہائے متنبی ہزار برس پہلے کیا سچی بات کہ گیا ہے ؎

وَكَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلاً صَحِيْحاً ۞ وَآفَتُهُ مِنَ الْفَهْمِ السَّقِيْمِ [۲]

اور دلگیر مرحوم نے قریباً سو برس پہلے فرمایا ہے۔ ؎

---

[۱] مرزا صاحب کے معاصرین میں اُن سے بڑھ کر کوئی شاعر مضمون آفرین نظر نہیں آتا۔ ایسے خلاق معانی کی نسبت مولوی شبلی صاحب کا مزاح سے بھی یہ کہنا کہ "مضامین کو مرزا صاحب سے رُوشناسی نہیں ہُوئی" میرے نزدیک بڑی ناانصافی وگستاخی ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر میں نے آتشی شعر لکھا ہے۔ ۱۲ ثابت ہیچمدان۔

[۲] اپنی کلام صحیح کے کس قدر عیب گیر ہیں کہ اُن کی ساری آفت اور خرابی اُن کے ناقص فہم کی بدولت ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

قبح کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر پر یہاں حسن شناسانِ سخن تھوڑے ہیں

ہمارے مولوی شبلی صاحب خاص کر مرزا مرحوم کے حسنِ سخن کو اکثر عیبِ کلام سمجھتے ہیں۔ افسوس ہے خدا معلوم سمجھ ہی ایسی ہے یا کوئی خاص سبب ہے ✽

(۳) صفحہ ۲۳۷ تا ۲۴۰ موازنہ میں مولوی شبلی صاحب نے مرزا مرحوم کے کلام میں ثقیل و غریب الفاظ ہونے کا دعوےٰ کر کے ثبوتِ دعوے میں حسبِ ذیل مصرع پیش کئے ہیں ✽۔

ناظرین! میں پہلے اس سے کہ جواب دوں تین باتیں کہدوں۔ جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ (۱) مرزا دبیر مرحوم آج کل کے شاعر نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری کی ابتدا کو آج ۱۳۳۲ھ میں پُورے سو برس گذر گئے ہیں۔ اُن کے زمانہ میں تمام شعراء دہلی و لکھنؤ بالاتفاق بھاشا

تین باتیں

✽ مولوی صاحب ان مصرعوں کو جو آئندہ متن میں ہیں لکھ کر لکھتے ہیں یہ سب الفاظ صحیح و عربی و فارسی میں مستعمل بھی ہیں۔ لیکن اردو نظم کی سلاست و روانی انکی متحمل نہیں ہو سکتی (اب مجھ سے سُنئے) پروفیسر آزاد مرحوم اور بعض تذکرہ نویسوں نے بعض شعرا کی غزلوں پر لوگوں کا یہ اعتراض بیان کیا ہے کہ اکثر شوکت و ارزنی الفاظ لاتے ہیں جنکا تحمل غزل نہیں کر سکتی۔ غزل میں وہ شان رہنا چاہئے جو معشوقوں سے باتوں کی ہوتی ہے۔ ہمارے مولوی شبلی صاحب چونکہ اردو ادب سے نا واقف ہیں جیسا کہ میں نے اس کتاب میں ثابت کر دیا ہے اُنہوں نے یہی اعتراض مرزا مرحوم کے مرثیوں پر کر دیا۔ یہ نہ سمجھے کہ ایسا اعتراض صرف غزل پر ہو سکتا ہے قصیدہ پر نہیں ہو سکتا۔ اور جب قصیدہ پر نہیں ہو سکتا تو مرثیہ پر کیونکر ہو سکیگا کیونکہ فی زمانہ مرثیہ تمام اصنافِ سخن غزل قصیدہ مثنوی ترجیع بند وغیرہ وغیرہ کا جامع ہے۔ مجھے اس موقع پر ایک نقل یاد آ گئی۔ ایک صاحب معمولی پڑھے لکھے تھے۔ مگر بڑے بڑے لفظ بولنے کا شوق تھا۔ ہر مجلس و محفل میں دو چار لفظیں اُڑا لاتے تھے ایک شخص کے (جس کا بیٹا مرچکا تھا) گھر پرسا دینے کو پہنچے۔ وہاں ایک اہلِ علم اس طرح پرسا دیتے دیکھا۔ کہ خدا آپ کو جوان بیٹے کے ماتم میں صبر دے۔ اور "نعم البدل عنایت فرمائے" نعم البدل و الاجلہ وہاں سے اُڑا لائے۔ چند روز کے بعد ایک ایسے شخص کے پاس تعزیت کو گئے جس کا باپ مر گیا تھا۔ انہوں نے یہی جملہ وہاں جھونک دیا۔ کہ "خدا آپ کو صبر دے اور نعم البدل عنایت فرمائے"۔ وہ شخص بُرا بھلا کہنے لگا۔ اور اِن کے علم کی قلعی کھُل گئی۔ ہمارے مولوی صاحب معاذ اللہ کم علم نہیں ہیں۔ عالم بلکہ شمس العلما ہیں۔ ان کے کمالات پر علم کلام وغیرہ کی بعض اُن کی کتابیں شاہد عدل ہیں۔ مگر اردو کے علم ادب سے عموماً اور فن مرثیہ گوئی سے خصوصاً وہ ایسے نابلد ہیں جیسے مُلّائے مکتبی کہ جن کی شان میں خاقانی یا کسی ایرانی شاعر کا یہ فقرہ مشہور ہے کہ "یاران شعر مرا بمدرسہ کہ برد؟" ۱۲ مؤلف حقیر۔

حکایت لطیفہ

ہندی کے الفاظ نکال رہے تھے۔ فارسی و عربی کے الفاظ لارہے تھے۔ کہ اس کو علمی زبان
بنانا چاہتے تھے۔ پس مرزا صاحب کے یہاں بھی اُن کے تمام معاصرین ذوق۔ غالب مومن۔
ناسخ۔ آتش وغیرہ وغیرہ کی طرح فارسی و عربی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ اور یہ
الفاظ اُس زمانے میں زبان زد ہونے کے سبب سے غریب و ثقیل نہیں ہیں۔ (۲)
ہر واقعہ نویس شاعر اور ہر مترجم کو فکر ہوتی ہے۔ اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈھ کر ایسے الفاظ
لاتا ہے۔ جو قلیل ہوں۔ اور معنی کثیر پر دلالت کریں۔ (۳) زیادہ تر مرزا مرحوم ایسے
الفاظ اُن مرثیوں میں لاتے ہیں۔ کہ جن میں اُنہوں نے روایتیں نظم کی ہیں۔ نظم روایات
میں اُن کے مرثیوں کی شان تورخانہ ہے۔ دیکھئے تاریخوں میں ایسے پھڑکتے ہوئے
الفاظ لانا معیوب ہے۔ جیسے قصہ اور ناول میں آتے ہیں۔ البتہ جو مرثئے مرزا مرحوم کے
قصہ و ناول کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ کہ یا واقعہ خیالی ہے۔ یا بہت تھوڑی سی بات
اصل میں ہے۔ اور اُس کو خیالات کے زور سے بڑھایا ہے۔ اُن میں وہ بھی پھڑکتے
ہوئے لفظ لاتے ہیں۔ مثلاً یہ مرثیہ دیکھئے **یہ پرچم ہے کس علم کا شعاع
آفتاب کی**۔ اُس تمام مقام میں جہاں علم کی بابت حضرات عون و محمدؑ سے شمر کی گفتگو
نظم کی ہے۔ پھڑکتے ہوئے سلیس عام فہم لفظ لائے ہیں۔ اسی طرح ہند و زندان شام کے
حال میں اُن کے جتنے مرثئے ہیں (جو پچاس مرثئے سے زیادہ ہونگے)۔ اور جناب
فاطمہ صغریٰ و شیریں کنیز جناب شہربانوؑ کے احوال کے مرثیوں میں اور تمام مرثیوں میں
رخصت و شہادت کے مقامات پر وہ زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ نہیں لاتے
ہیں۔ واقعات تاریخی یا علمی باتیں جو شخص لاتا ہے۔ وہ اس نکتہ کو سمجھتا ہے۔ کہ
آج بھی عربی و فارسی کے الفاظ لائے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ دیکھئے جناب سر سید
اور اُن کے رفیق جناب محسن الملک وغیرہ وغیرہ تہذیب الاخلاق کے پرچوں میں کس
کثرت سے فارسی و عربی الفاظ لاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب مضامین حضرت مرزا مرحوم کے مدتوں بعد

لکھے گئے ہیں۔ کہ جس زمانے میں عربی و فارسی کے الفاظ اردو میں کم لانے کا خیال عام طور پر ملک میں پھیل چکا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ کہ بغیر عربی و فارسی کے لفظوں کے مطلب ہی ادا نہیں ہو سکتا تھا +

اِس تمہید کے بعد مرزا مرحوم کے وہ الفاظ جن کو مولوی شبلی صاحب ثقیل و غریب بتاتے ہیں سُنئے :-

الفاظ عربی و فارسی

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۱	مستدعیٔ شق القمر اگر ہوئی گمراہ	مستدعی، شقّ القمر۔ دونوں لفظ معمولی ہیں۔ ایک بھی ثقیل و غریب نہیں +
۲	ہر کوہ کی آواز انا الطوّر انا الطوّر	نہ انا غریب ہے نہ الطور ثقیل ہے۔ یہ تو سب پہاڑوں سے چھوٹا پہاڑ ہے۔ پھر ثقیل کیوں سمجھا جاتا ہے +
۳	النشر کا ہنگامہ ہے ہر وقت حشر میں	حشر و نشر دونوں معمولی غیر ثقیل لفظ ہیں۔ حشر بفتحتین عام طور پر بولتے ہیں۔ لغۃً بھی مجمع کے معنی پر صحیح ہے۔ وہی مصنّف نے باندھا ہے +
۴	لبیک و سعدیک تھا ورد ملک و حور	لبیک و سعدیک عربی الفاظ زبان ملک و حور سے ادا کئے ہیں۔ یہ کمال بلاغت ہے۔ کہ اہل جنّت کی زبان عربی ہے۔ وہی عربی الفاظ ملک و حور کی زبانی لائے ہیں۔ فردوسیؒ کے اس مصرع پر اعتراض ہوا تھا۔ کہ ع فلک گفت احسن ملک گفت زہ۔ کہ یہ عربی ہے۔ فردوسی نے جواب دیا تھا۔ کہ احسن مَیں نے نہیں کہا آسمان نے کہا۔ اُس کی زبان عربی ہے مَیں عربی لفظ لایا۔ فردوسیؒ نے عربی الفاظ نہ لانے کی شرط کی تھی پھر بھی وہ لائے۔ پھر فردوسیٔ ہند (دبیرؒ) عربی الفاظ کیوں نہ لائیں +
۵	المنتہےٰ یہ ربط و ضبط اس وغا میں تھے	الحاصل، المختصر، المنتہےٰ۔ القصّہ یہ سب لفظ اس زمانے میں عام تھے۔ اس لئے المنتہےٰ نہ ثقیل ہے نہ غریب ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۶	خاص الخلاصۂ بنی آدم کمال ہیں	"منتخب آدمیوں میں سے منتخب" کے معنی پر یہ لفظ (خاص الخلاصہ) ہے کوئی سبب ثقالت وغرابت نہیں۔ ثقہ لوگ بولتے ہیں۔ بازاری نہیں ہے۔ اگر شرفا کے الفاظ بولنا جرم ہے۔ تو بیچارے مرزا بھی مجرم ہیں۔ یہ لفظ مرزا مرحوم کے علم وفضل کو ظاہر کر رہا ہے +
۷	یارو سنا مدائح نوشاہ کا بیان	مدائح۔ مناقب۔ اوصاف۔ فضائل یہ سب فصیح لفظ ہیں۔ نہ ثقل ہے نہ غرابت ہے۔ پھر فصیح کیوں نہیں ہیں +
۸	رُخ بیّنۂ صدق کرامات پیمبرؐ	لفظ تو لفظ کوئی حرف بھی ثقیل نہیں ہے +
۹	مستجمع جمیع فضائل ملک سیر	دیکھئے کتنا بڑا مضمون ان الفاظ کی بدولت ایک مصرع میں آگیا ہے۔ معمولی الفاظ اہل علم کی زبان کے ہیں۔ کوئی حرف بھی ثقیل نہیں ہے +
۱۰	مستغرقِ رُوح اُس نے کیا تب علی و شبیر	اُس زمانے میں ایسے الفاظ عام تھے۔ کوئی ثقیل نہیں ہے +
۱۱	لیکر رطب و لو دوم کہنے لگے شاہ	״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״
۱۲	میدانی و نقیب و عصادار و چوبدار	شاہی چوبداروں کے جتنے اقسام تھے۔ وہ سب ایک مصرع میں جمع کردئے ہیں۔ اس کمال کی داد دینا تو درکنار اور اعتراض کیا جاتا ہے۔ نہ کوئی لفظ ثقیل ہے۔ نہ غریب ہے +
۱۳	عرش فلکی بڑھ کے نقیبانہ پکارے	نہایت سلاست ہے حضرت سلامت +
۱۴	اک شخص کمرشہ کی لگا باندھنے خورسند	یہ ناموزونی کی تحت میں مولوی صاحب نے لکھا ہے۔ میں حیران ہوں۔ کہ اس میں کیا ناموزونی ہے۔ خوش۔ خورم۔ خورسند۔ خوشنود۔ شاد۔ شادماں۔ شاداں۔ یہ سب الفاظ اردو میں مستند و فصیح ہیں۔ بازاری نہیں ہیں +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۱۵	اک دلو بھر و پانی سے اور ایک رطب لو	"دلو" ڈول کے معنی پر ہے۔ اُس زمانے میں ہندی الفاظ لانا غیر فصیح سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ اسی وزن پر ڈول بھی ہے۔ وہ عمداً مصنف نہیں لائے۔ رطب لیبا لفظ ہے جس کا بدل دُوسرا لفظ فصیح نہیں ہے۔ اگر دلو پانی سے بھرا ہُوا ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ تو ضعف کا علاج کرنا چاہیئے +
۱۶	نوبت زنِ شہ بامِ عروجِ فلکِ پیر	سب الفاظ سلیس و فصیح ہیں۔ چار اضافتیں ایک مصرع میں لانا اُس زمانہ میں بالاتفاق جائز تھا۔ اب بعض شعرا نہیں لاتے بعض اب بھی اسکو جائز سمجھتے ہیں بہر حال مرزا مرحوم پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا +
۱۷	ملبوس قلمکار نہ دوں ہے نہ پُرانا	یہ مصرع فہم عالی میں نہ آیا غلط لکھ دیا صحیح یہ ہے ع ملبوس قلم کار نہ دوں۔ ہے یہ پُرانا۔ قلمکار لباس جس قدر پُرانا ہوتا جاتا ہے اُس کا حُسن بڑھتا جاتا ہے۔ کوئی لفظ غیر مانوس نہیں ہے۔ سمجھ میں مصرع نہ آیا۔ اعتراض جڑ دیا +
۱۸	سر کو عوض پا رہِ مدحت میں دھرونگا شرعِ کہنِ ناطقہ منسوخ کرونگا	یہ مصرع بھی مولوی صاحب نہیں سمجھے۔ غلط لکھ دیا اور اعتراض جڑ دیا۔ صحیح یُوں ہے۔ تل کے اُوٹ پہاڑ دیکھئے ع سر کو عوضِ پا رہِ مدحت میں دھرونگا۔ پے الف زبر پا (پاؤں کے معنے پر)۔ رے زبر رَ۔ ہ زیر ہِ۔ رَہِ۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس راہ مدحت کو میں ادباً بجائے پاؤں کے سر سے طے کرونگا۔ واہ مولوی صاحب آپ بے سر و پا اعتراض فرماتے ہیں۔ خود ٹھوکر کھاتے ہیں۔ دُوسرے پر غصّہ کرتے ہیں ع آپ ہی ظلم کریں۔ آپ ہی شکوہ اُلٹا کوئی لفظ نامانوس نہیں ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۱۹	یہ صورت، پیغمبر قوسین مکاں ہے	صورت - پیغمبر - قوسین - مکان - کوئی لفظ یا ترکیب غیر مانوس نہیں ہے +
۲۰	ہے طلعت جلد و نفس سینہ یہ محسوس وہ برق شفق میں تو یہ پروانہ بفانوس	اس شعر میں لف و نشر مرتب ہے - طلعت جلد کو برق شفق سے اور نفس سینہ کو پروانہ بفانوس سے تشبیہ دی ہے - مرزا غالب مرحوم زندہ ہوتے - تو داد دیتے - دقیق کلام کو جس میں اعلیٰ درجہ کی صنعت بھی ہے - مولوی صاحب ناموزوں بتلاتے ہیں - جو اُن کی موزونی طبع کی دلیل ہے - یہ ترکیبیں اُس زمانہ میں عام تھیں - غالب - مومن کے دیوان ان ترکیبوں سے بھرے پڑے ہیں +
۲۱	ناگاہ گھلا دشت میں بازار زد و کُشت تیغیں کھچیں یکدست - تُلے گُرز بھی یکمشت	زد و کُشت - یک دست - یک مُشت - یہ سب الفاظ اردو کے خراد پر اُترے ہوئے ہیں - تیغ ہاتھ میں ہوتی ہے - گرز مُٹھی میں پکڑا جاتا ہے - یہ الفاظ عین موقع پر لائے ہیں - بلاغت کی جان ہیں - مگر ع میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے - ایسے الفاظ و ترکیبیں تمام معاصرین دبیر کے یہاں بکثرت ہیں - میر انیس مرحوم بھی فرماتے ہیں ~ داغِ گُلِ ریاضِ تمنا بدل قبول مگر مولوی صاحب سب غصہ مرزا صاحب پر اُتارتے ہیں - نہ جانے کیوں اس قدر بھرے ہوئے ہیں +
۲۲	یہ چشم جراحت نہ رہ فوت کو دیکھا	چشم - جراحت - فوت - سب الفاظ بولتے ہیں - ترکیب بھی مانوس ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۲۳	کہتے ہیں جسے عاشقِ شیدا ملک و ناس	یہ مصرع غلط لکھا ہے۔ عاشق و شیدا صحیح ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب واؤ حرف علت آپ کھا گئے۔ کہیں پھر ثقل معدہ کی شکایت نہ فرمائیےگا۔ پورا بند پڑھئے۔ تو حسن کلام معلوم ہو۔ کہتے ہیں جسے عاشق و شیدا ملک و ناس + اللہ کے شبیرؑ ہیں، شبیرؑ کے عباسؑ اُس حسن ارادت سے حضرتؑ کے رہے پاس + جیسا تھا پیمبرؐ کا علیؑ کو ادب و پاس ایمان کو یہ جانتے تھے جان سے پیارا + اور حضرت شبیرؑ کو ایمان سے پیارا دو عاشقوں اور دو معشوقوں کا بیان ہے۔ ایک محمدؐ و علیؑ۔ دوسرے حسینؑ و عباسؑ۔ اس رعایت سے عاشق و شیدا۔ ملک و ناس۔ جان و ایمان کے دوہرے دوہرے الفاظ لائے۔ اس کا نام شان بلاغت ہے۔ آپ کو یہ ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ تو مجبوری ہے +
۲۴	خیاطِ عہدِ طفلیِ شاہِ انام تھے	چار اضافتیں ہیں۔ جو اُس زمانے میں عام طور پر جائز تھیں کوئی لفظ ثقیل یا ترکیب نامانوس نہیں ہے +
۲۵	اس کی ثنا مشقت مالایطاق ہے	مشقت مالایطاق اہل علم کی زبان کے لفظ ہیں۔ علم خود آج کل غریب ہے۔ اس راہ سے غریب اس لفظ کو [illegible] گئے۔ تو بجا ہے۔ بازاری لفظ نہیں ہے۔ یہ مجبوری ہے +
۲۶	نانا نے تو قلم کئے جبریلؑ کے سہ پر	اُوپر کے مصرع سے ملا کر پڑھئے۔ جناب عونؑ اپنے بھائی جناب محمدؑ سے جنگ میں کہ رہے ہیں۔ ع بھائی یہ ضرب کیا ہے کہ جس سے کٹی سپر + نانا نے تو قلم کئے جبریلؑ کے سہ پر سپر اور سہ پر میں تجنیس لفظی ہے۔ آپ صنعت کو عیب سمجھتے ہیں۔ خدا کی شان ہے +

نمبر	مصرع	مختصر رائے مؤلف حقیر
۲۷	کفار بڑھے طیش میں ہونٹوں کو دبا کے دانتوں کے تلے بال محاسن کے دبا کے	دیکھئے۔ آپ نے غلط شعر لکھ دیا۔ قافیہ کھا گئے۔ صحیح یہ ہے۔ کفار بڑھے طیش میں ہونٹوں کو چبا کے۔ ہونٹوں کو غصہ میں چبانے کا محاورہ ہے۔ پھر کہئیگا کہ غلطی طبع کا عذر نہیں چل سکتا۔ کفار۔ بڑھے۔ طیش۔ ہونٹوں۔ چبا۔ دانتوں۔ تلے۔ بال۔ محاسن۔ دبا۔ کوئی لفظ یا ترکیب غیر مانوس یا ثقیل و غریب نہیں ہے۔ رہ جانے مولوی صاحب کو کیوں طیش آگیا۔ جو ایسے عمدہ شعر کو بھی عیب کے نظائر میں پیش کر دیا ہے محاسن کو معائب جانتے ہیں + پھر اپنی رائے صائب جانتے ہیں
۲۸	آمد ہے امام سوم ہر دوسرا کی	یا اللہ اس مصرع میں کونسا حرف یا لفظ یا ترکیب ثقیل یا نامانوس ہے +
۲۹	اس سر پہ دھرے ہات بقسمیہ اجل ہے بس ہدیہ اللہ کے قابل یہی پھل ہے	بقسمیہ بائے موحدہ سے غلط لکھا ہے۔ یہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے چاہئے۔ اس میں کوئی سبب ثقالت و غرابت نہیں ہے +

مولوی صاحب عجب ظرافت فرماتے ہیں۔ عربی و فارسی اہل علم کی زبان کے الفاظ دیکھتے ہیں۔ تو اُن کو غریب و ثقیل بتاتے ہیں۔ اگر عوام کی زبانی اردو و ہندی کے الفاظ میر صاحب یا مرزا صاحب کے کلام میں پاتے ہیں۔ تو اُن کو بازاری زبان مبتذل محاورے کہتے ہیں۔ حالانکہ اُن مقامات خاص کی مناسبت سے وہی الفاظ مناسب ہیں۔ اس بار یکی کو نہیں سمجھتے۔ بعض جگہ غور کرنے اور مضمون سمجھنے کی تکلیف نہیں گوارا فرماتے۔ اور جھوٹ سے غلط مصرع لکھ کر اعتراض جما دیتے ہیں۔ مگر وہ خود اردو کے شاعر نہیں ہیں۔ ورنہ میں اُن کے کلام میں سے کچھ الفاظ دکھاتا۔ خیر اب اُن کی نثر سے پانچ سات الفاظ غیر مانوس ناظرین میں پیش کرتا ہوں۔ نظم میں تو وزن و قافیہ و ردیف وغیرہ کی مجبوری سے بعض وقت شاعر خاص لفظ لانے پر مجبور ہوتا ہے۔ نثر میں یہ مجبوری کبھی

لطیفہ

نہیں ہے۔ پھر بھی مولوی صاحب کے الفاظ کی ثقالت و غرابت دیکھنے کے قابل ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں یہ مختصر فہرست پیش کروں۔ ایک لطیفہ ناظرین کو سُناؤں۔ جو مناسب مقام ہے۔ ملک الشعراء مرزا رفیع سودا اکثر لوگوں کی ہجو فرمایا کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک ایرانی (سپاہی مزاج) ان سے ملنے کو ہتیاروں سے ایلچی بنا ہُوا آیا۔ انہوں نے اُسکی ہجو فے البدیہہ فارسی میں نظم کر کے اُس کو سُنائی۔ اور طالب داد ہُوئے۔ ایرانی تحمل و وقار سے سُنتا اور داد دیتا رہا۔ جب مرزا سودا ہجو پڑھ چکے۔ ایرانی بولا۔ حالا کہ نظم خویش خواندی نثر ما ہم بشنو۔ مرزا بولے۔ بسم اللہ آغا بفرمائید۔ بس اُس نے جھپٹ کر ان کا ٹینٹوہ دبالیا۔ زمین پر پچھاڑ کر کمر سے خنجر نکال کر بولا۔ بگو ایں نثر بہتر ست یا نظم تو۔ ملک الشعراء نے ہاتھ باندھ کے عرض کی۔ نثر آغا از نظم بندہ بہتر ست بندہ را بگذارید و معاف کنید۔ غلط کردم۔ حالا توبہ میکنم۔ جب خدا خدا کر کے اُس ایرانی کے پنجے سے رہائی بلکہ عمر دوبارہ پائی[1]

آمدم بر سر مطلب :۔

مولوی شبلی صاحب کے بعض الفاظ پر اعتراض

نمبر صفحہ و نام کتاب	جملہ	اعتراض
صہ ۳۱ موازنہ	لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے۔	"چونکہ" غیر مانوس لفظ ہے۔ گو عام لوگ نثر میں لکھتے اور بولتے ہیں۔ مگر اس میں ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ شعراء فصحا اس کو مطلق استعمال نہیں کرتے۔ مولوی صاحب الفاظ میں سُر بتلاتے ہیں سلیس وہ سوچیں۔ اس میں کیسا مبتذل سُر نکلتا ہے۔ ایک مجمع میں ایک صاحب کو بدہضمی کی شکایت تھی۔ چُوں کی آواز نکلی۔ تو ایک ظریف بولے۔ جناب اُردو میں باتیں کرتے کرتے آپ تو سُریانی بولنے لگے[2]۔ دیکھئے دبیر و انیس اور اُن کے معاصرین اس کی جگہ پر بسکہ لاتے ہیں۔ دبیر سے تھی بسکہ صبح قتل شہنشاہ نامدار۔

[1] جس طرح ایک معمر بزرگ سے لکھنؤ میں مَیں نے سُنا تھا۔ (یہ لطیفہ) لکھ دیا حضرت پروفیسر آزاد مرحوم نے بھی آب حیات میں اس کو لکھا ہے۔ مگر کچھ الفاظ کا فرق ہے ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] یہ اعتراض مولوی شبلی صاحب تک ہی محدود ہے۔ کہ وہ الفاظ میں سُر ہونے کے قائل ہیں۔ اور اس میں مذموم سُر ہے۔ اور نثار جو عام طور پہ چونکہ لکھتے ہیں۔ اُن پر یہ اعتراض ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی لفظوں میں سُر نہیں بتاتا ۱۲ ثابت۔

نمبر صفحہ و نام کتاب	جملہ	اعتراض
		انیس سہ تھا بسکہ روز قتل شہ آسماں جناب۔ ان فصیح شعرا کے کلام میں دیکھ جائیے۔ یہ کہیں بھولے چوکے سے بھی "چونکہ" نہیں لاتے ہیں۔ لمؤلفہ سہ فصحا بسکہ ہر اک لفظ متیں کہتے ہیں + بھولے چوکے سے بھی چونکہ وہ نہیں کہتے ہیں۔
صہ ۱۵۱ موازنہ	واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے +	اس موقع پر مولوی صاحب نے اصول کو واحد لکھا ہے۔ دراصل یہ اصل کی جمع ہے۔ یوں لکھنا تھا۔ کہ اصل اصول بلاغت یہ ہے[۱]۔ میں مانتا ہوں۔ کہ عام لوگ اصول (بجائے اصل) بولتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب نے انیسؒ و دبیرؒ پر اس قسم کا اعتراض کیا ہے۔ اس لئے مجھے بھی اس اعتراض کا حق پیدا ہوا۔ ملاحظہ ہو موازنہ کے صفحہ ۲۲۹ پر دبیر صاحب کا یہ مصرع سہ گرتے تھے طیوراں ہوا کھولے ہوئے پر۔ اسکو لکھکر مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ طیور خود جمع ہے۔ اس کی جمع الجمع نہ صحیح ہے نہ مستعمل۔ اسی طرح صفحہ ۳۴۲ پر مرزا صاحب کا یہ مصرع لکھ کر "القاب سخن سنج سخنور ہے ہمارا" لکھا ہے۔ کہ "لقب کی بجائے القاب باندھا ہے"۔ حالانکہ دہلی و لکھنؤ بلکہ ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ کہ القاب کو روزمرہ میں بجائے واحد بولتے ہیں۔ اور مرزا مرحوم نے تو ایک اور کمال کیا ہے۔ کہ دو لقب سخن سنج۔ سخنور لکھ کر جمع کا حق بھی پیدا کر دیا ہے۔ اور حور خود جمع حوراکی ہے۔ مگر بجائے واحد مستعمل ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف۔ مولوی صاحب جس دن اصول کے واحد ہونیکی کلام شعرائے فصحا سے سند دینگے۔ اُسی دن ہم سے

[۱] جناب سرسید تہذیب الاخلاق کے اپنے اُس مضمون میں جس کی سُرخی (ہیڈنگ) یہ ہے۔ کہ "کن کن چیزوں میں تہذیب چاہئے"۔ تحریر فرماتے ہیں "تمام قوم کو یکسان اوقات منضبط کرنا چاہئے۔ کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے"۔ ملاحظہ ہو تہذیب الاخلاق مطبوعہ لاہور سنہ ۱۳۱۳ھ جلد دوم کا صفحہ ۵۳ + ۱۲ مؤلف حقیر۔

نمبر صفحہ و نام کتاب	جملہ	اعتراض
		طیوران کی (القاب کی طرح) سند لیں۔ القاب کی سند حاشیہ پر ملاحظہ ہو[1]+
صفحہ ۵۴ موازنہ	اس کے بعد حرکی معذرت خواہی	معذرت کافی ہے۔ عذر خواہی تو بولتے ہیں۔ معذرت خواہی کون بولتا ہے۔ اگر دہلی و لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ تو سند دیجئے +
صفحہ ۷ موازنہ	سریع الانتقال الی الذہن	ثقیل و غریب الفاظ کی تعریف میں یہ جملہ آتا ہے۔ کیونکہ اردو کا ٹکسالی جملہ نہیں ہے۔ ایسے ہی لفظ عربی کی نسبت کسی پرانے شاعر کا شعر ہے۔ ؎ حبذا میں نے کہا اُن سے تو ہنس کر بولے + عربی بولو کسی اہل عرب کے آگے
صفحہ ۶ موازنہ	ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے +	مولوی صاحب! لفظ پر بلیغ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ تمام علمائے معانی و بیان کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ بلیغ کا اطلاق ہمیشہ جملہ پر ہوتا ہے۔ لفظ کو بلیغ نہیں کہہ سکتے جیسا کہ میں اُوپر مختصر المعانی وغیرہ سے ثابت کر چکا ہوں۔ خطا معاف!! دراصل مولوی صاحب علم بلاغت کی ابتدائی باتوں سے بھی ناواقف ہیں۔ جبھی تو فرماتے ہیں۔ کہ بلاغت کلام دبیر میں نام کو نہیں۔ اگر واقف ہوتے۔ تو برخلاف تمام کاملین کی رائے کے وہ کلام دبیر کو بلاغت سے خالی اور لفظ کو بلیغ نہ فرماتے۔ اور ملک کی بدمذاقی کی لے بڑھنے کا گیت شروع موازنہ ہی میں نہ گاتے +

(حاشیہ: معذرت خواہی — لفظ اور بلیغ)

مولوی شبلی صاحب کی نثر میں ایسی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ میں نے مشتے نمونہ از خروارے چند الفاظ یہاں لکھ دئے۔ ناظرین حق بیں اس سے نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ کہ

[1] ملاحظہ ہو امیر اللغات جلد اوّل (الف ممدودہ) کا صفحہ ۲۷۔ جناب رشک مرحوم ؎ لکھ کے اُس بت کو خدا لکھتا ہوں اپنی بندگی۔ اور کیا مکتوب میں القاب ہو آداب ہو۔ دوسری سند صفحہ ۲۳ پر رشک مرحوم۔ اوّل تحریر وصف یار نے آخر کیا۔ لکھ چکے مکتوب اس القاب کو آداب ہے۔ میں مانتا ہوں۔ کہ اصول بجائے اصل (واحد) کثرت سے بولا جاتا ہے۔ مگر سند شعرائے فصحا کی دینا چاہئے۔ اس کے قطع نظر جیسا مولوی شبلی صاحب نے دبیر و انیس پر اعتراض کیا تھا۔ ویسا ہی میں نے بھی کیا۔ کما تدین تدان۔ مثل مشہور ہے جیسی لینی ویسی دینی + ۱۲ مؤلف ہیچمدان۔

جن کو ایسی معلومات فن شعر و ادب میں ہو۔ وہ بزرگوار کیا (دبیر و انیس کے) کلام کی خوبیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ یا اُن میں (جج) حکم بن سکتے ہیں۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر مرحوم مشہور شاعر کامل اکبرآباد اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ دبیر و انیس میں وہ شخص حکم ہو سکتا ہے۔ جو ان دونوں سے بڑھ کر علم ادب و شعر کا عالم اور شاعر ہو۔ اور ایسا شخص رُوئے زمین پر کوئی نظر نہیں آتا۔ لہذا اس کا انصاف نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک اُن مرحوم کا یہ عقیدہ و قول سچ ہے +

فصل ۸ چھٹا داغ سرقہ

چھٹا داغ

سرقہ اور مولوی شبلی صاحب کا انیسؒ دبیرؒ کی طرف نسبت دینا +

مولوی صاحب نے موازنہ کے صفحہ ۲۳۳ پر سرقات کی سرخی (ہیڈنگ) لکھ کر میر انیس صاحب کے اور اُس کے ساتھ اساتذہ سلف کے چند اشعار لکھے ہیں۔ اگرچہ ابتدا میں یہ فرمایا ہے۔ کہ اکثر سرقے اس قسم کے ہیں۔ کہ شاعر سابق سے میر صاحب کا شعر حسن بندش وغیرہ کے اعتبار سے بڑھا ہُوا ہے۔ مگر پھر تحت میں چند اشعار لکھ کر یہ بھی زیب رقم فرمایا ہے۔ کہ اِن اشعار میں اشعار سابق سے میر صاحب نے کسی قسم کی ترقی نہیں کی۔ اور یہ کہ حسن ظن ہو۔ تو اس کو توارد ورنہ سرقہ کہنا چاہئے۔ اس مقام پر مولوی صاحب نے چند سکندریاں (ٹھوکریں) کھائی ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) مرزا دبیر کا اشارہ

(۱) پہلا فقرہ یہ لکھا ہے۔ کہ "اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ میر انیس (اور مرزا دبیر) کے بہت سے اشعار پر سرقہ کا گمان ہو سکتا ہے" اس فقرہ میں مولوی صاحب نے مرزا دبیر مرحوم کو بھی ملزم سرقہ بنا دیا۔ مگر پھر مرزا مرحوم کا ایک مصرع بھی ایسا نہ پیش کر سکے۔ جس پر گمان سرقہ کا ہو۔ اگر یہ کہئے۔ کہ میر انیس مرحوم کے سرقات کا دکھانا مقصود تھا۔ تو پھر مرزا مرحوم کا نام ہی کیوں لکھا۔ مگر ہمارے

مولوی صاحب اپنی مقتضائے طبیعت سے مجبور تھے۔ مرزا مرحوم سے جو اُن کو خاص لاگ ہے۔ غالباً اُس نے اُن کو خطوط و صدائی میں (اور مرزا دبیر) کے الفاظ لکھنے پر مجبور کر دیا[1]+

ضمیر و انیس

(۲) میر ضمیر مرحوم اور میر انیس مغفور کے یہ دو بند بھی اسی بحث سرقہ کی ذیل میں لکھے ہیں:۔

میر ضمیرؒ

پہچانتے ہو! کس کی مرے سر پہ ہے دستار
دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار
یہ کس کی زرہ کس کی سپر کس کی ہے تلوار
مَیں جس پہ سوار آیا ہُوں کس کا ہے یہ رہوار
باندھا ہے کمر میں جسے یہ کس کی ردا ہے
کیا فاطمہ زہرا نے نہیں اس کو سیا ہے

میر انیسؒ

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ؟ یہ کس کی دستار
یہ زرہ کس کی ہے؟ پہنے ہُوں جو مَیں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے؟ یہ چار آئینہ جوہر دار
کس کا رہوار یہ ہے؟ آج مَیں جس پہ ہُوں سوار
کس کا یہ خود ہے؟ یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

حالانکہ علم معانی و بیان کی جتنی کتابیں ہیں۔ قریباً سب میں یہ لکھا ہے۔ کہ اغراض و مطالب متحدہ کا بیان کرنا داخل سرقہ نہیں ہے[2]۔ جیسے ایک شاعر نے مدح سخاوت و شجاعت وغیرہ نظم کی۔ پھر دُوسرے نے کی۔ تو دُوسرے کو سارق نہیں کہینگے۔ یا ایک حکایت ایک شخص نے اور پھر ہی دُوسرے نے لکھی۔ جیسے یوسف زلیخا فردوسی نے اور پھر اُس کے کئی سو برس بعد جامی نے لکھی۔ تو کوئی عقلمند جامی کو سارق یا اُن کی یوسف زلیخا کو مسروقہ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں بھی یہی بات ہے۔ اکثر کتب سیر و مقاتل

فردوسی و جامی یوسف زلیخا

---

[1] جبکہ مرزا مرحوم کو مولوی صاحب نے ملزم سرقہ کا لکھ دیا۔ اور ثبوت کچھ بھی نہ دیا۔ تو مولوی صاحب کے خلاف مرزا صاحب کی طرف سے دفعہ ۵۰۰ کا استغاثہ عدالت عالیہ سخن و ادب میں (باجازت عدالت) ہو سکتا ہے۔ مگر مرزا صاحب کا کمال ایسے استغاثہ کی ضرورت نہیں سمجھتا ۱۲ مولف

[2] ملاحظہ ہو حدائق البلاغہ میر شمس الدین فقیر مرحوم صفحہ ۲۰۸۔ اور اور کتابیں اس علم کی ۱۲ مولف حقیر۔

میں یہ روایت مرقوم ہے۔ کہ امام حسینؑ نے اپنے لباس و سلاح کو دکھا کر فوج یزید پر یہ حجت تمام کی تھی۔ کہ تم جن کا کلمہ پڑھتے ہو۔ اور جن کو اپنا پیشوا جانتے ہو۔ اُن محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ علیہم السلام کے یہ تبرکات ہیں۔ اور میں اُن کا یادگار و قائم مقام ہوں۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اس کو اگر لاکھ آدمی بیان کریں۔ تو ۹۹۹۹۹ سارق نہ ہونگے۔ اسی روایت کو میر ضمیرؔ و میر انیسؔ نے نظم کیا ہے۔ یہ نہ سرقہ ہے نہ داخل توارد شعریہ ہے۔ اس موقع پر پہنچ کر یہ کہے بغیر رہنا حق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ کہ مرزا دبیرؒ نے اس بیان میں بھی ایک جدت پیدا کی ہے۔ یعنی اسی مضمون تاریخی کو نئے طریقہ سے بیان فرمایا ہے۔ جو اُن کی قوت ایجاد پر دلالت کرتا ہے۔ اوّل یہ عرض کردوں۔ کہ اُنہوں نے ایک مشہور مسئلہ قانون شہادت کی اصل اصول پر نظر رکھی ہے۔ وہ یہ کہ شہادت تین قسم کی ہوتی ہے۔ (۱) زبانی۔ جو زبان سے ادا کی جائے + (۲) تحریری۔ جو کسی دست آویز وغیرہ کو اپنے قول کی سند میں دکھایا جائے + (۳) مادّی۔ جو کسی مادّی چیز کو دکھا کر دعوےٰ پر دلیل گردانا جائے۔ مثلاً قتل یا ضرب کے مقدمہ میں کسی ایسے پتّھر یا لکڑی وغیرہ کو دکھایا جائے۔ جس پر خون مقتول یا مضروب کا جما ہوا ہو۔ یا مضروب کا زخمی ہاتھ دکھایا جائے۔ پس یہ پتّھر یا لکڑی یا ہاتھ گویا زبان حال سے شہادت واقعہ ضرب یا قتل کی دینگے۔ اسی کو زبان حال بھی کہتے ہیں + پس مرزا مرحوم اس واقعہ کو اس طرز پر بیان فرماتے ہیں۔ کہ امام حسینؑ ایک ایک چیز بزرگوں کے تبرکات میں سے دکھا کر فرماتے جاتے ہیں۔ کہ دیکھو یہ چیز کن بزرگوار کی ہے۔ اور وہ چیز خود زبان حال سے شہادت دے رہی ہے۔ اب وہ بند سُنئے۔ (امام حسینؑ لشکریان یزید سے فرماتے ہیں):-

جدت طرز بیان مرزا دبیرؒ
مسئلہ قانون شہادت

مصباح ہدایت مرے نانا کا لقب ہے	تم میری امامت کے ہو منکر۔ یہ عجب ہے
صد چاک یہ ملبوس مرے تن میں جواب ہے	موجود گواہی کو۔ بفرمودۂ رب ہے
گویا ہوا ملبوس بھی خیر لبشرؐ کا	حقّا تو ہے پیوند پیمبرؐ کے جگر کا

پھر شہ نے کہا باپ علیؑ ہے مرا کرّار | دختر دی نبیؐ نے اُسے اللہ نے تلوار
دو تیغوں سے دو نیزوں سے جو کرتا تھا پیکار | باور نہ ہو تو تیغ و سناں خود کرے اظہار
واں نیزۂ حیدرؑ نے زباں کھولی کہ حق ہے | یاں میاں سے تیغ دو زباں بولی کہ حق ہے

گو وضع جہاں سے تھی زرہ پیچ کے اندر | پر صاف گواہی کے دکھانے لگی جوہر
تھی پاس جو تیغ کمر حیدرؑ صفدر | انگشت قبول اُس نے دھری آنکھوں کے اُوپر
کھا کر سرِ اقدس کی قسم خود پکارا | یہ سر ہے نبیؐ کا اسے کاٹو نہ۔ خدارا

توارد و سرقہ

(۳) جن کتب معانی و بیان میں شعرا کے ہم مضمون اشعار لکھے ہیں ہر ایک مصنّف نے صاف لکھ دیا ہے۔ کہ اگر شاعر مابعد کی نسبت یہ ثابت ہو جائے۔ کہ اُس شعر کی تصنیف کے وقت اُس کو شاعر سابق کے شعر کا علم تھا۔ تو اُس پر حکم سرقہ کا جائز ہے۔ ورنہ ہرگز نہیں۔ بلکہ اُس کو توارد کہینگے۔ کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی (ایک ایرانی مستند شاعر) فرماتے ہیں۔ ؎

نگر توارد خاطر کہ در مجارے آں | نہ ممکن ست کہ کس معترض شود بروے
دو راہرو کہ براہے روند دریک سمت | عجب نباشد اگر او فتند پے در پے

مطلب ان بزرگوار کا یہ ہے۔ کہ جب ایک ہی سمت میں دو مسافر آگے پیچھے جا رہے ہیں۔ اور پچھلے راہگیر کو خبر نہیں۔ کہ میرے آگے بھی کوئی جا رہا ہے۔ تو کیا عجب ہے کہ جہاں اگلے کا قدم پڑا ہے۔ وہیں پچھلے کا بھی پاؤں پڑ جائے۔ اس بات پر اعتراض کرنے کا کیا کام ہے۔ پس مضمون کا لڑ جانا ممکن ہے۔ اگر کوئی نافہم کہے۔ کہ شاعر مابعد کو تمام سابقین شعرا کے کلام سے خبردار ہونا چاہیے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ ناممکن ہے۔ کہ کوئی شخص تمام شاعروں کا کلام دیکھ جائے اور پھر یاد بھی رکھے (کہ جن کی تعداد لاکھوں سے زیادہ ہے)۔ غالب مرحوم نے بھی اس بات کو ایک شوخی کے ساتھ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ؎

سابق کے شعرا کے کلام سے واقفی

مبر گمانِ توارد یقیں شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بُرد ست

مطلب یہ ہے۔ کہ جس نے مجھ سے پہلے اس مضمون کو کہا۔ وُہی چور ہے۔ مَیں نہیں ہُوں۔ ازل کے نہاں خانہ مضامین سے میری پونجی چُرالی ہے؟ ادائے مطلب کی خوبی دیکھئے[1]

توارد

اب جبکہ توارد کی بحث آگئی ہے۔ تو شاید اس میں کچھ اور بھی لکھنا طالبانِ فن کے واسطے مفید ہوگا۔ واضح ہو۔ کہ ایک مضمون کو شاعرِ اوّل باندھتا ہے۔ شاعرِ ثانی بھی اُسی کو نظم کرجاتا ہے۔ اور اُس غریب کو خبر نہیں ہوتی۔ کہ مجھ سے پہلے بھی کوئی یہی مضمون کہ گیا ہے۔ مَیں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہُوں۔ مَیں اپنے ایک مرثیہ میں دریائے **فرات** کی کیفیت ایک بند میں یُوں نظم کی تھی۔

نہ تھا فرات کی موجوں کو ایک سمت قرار
سُوئے یمیں کبھی جاتی تھیں گاہ سُوئے یسار

کہ جیسے کروٹیں بستر پہ لے کوئی بیمار
حباب کا تھا دم آنکھوں میں نزع کے آثار

بھنور کو ہو گیا دوران سر سسکتا تھا
فرات[2] خود لبِ ساحل پہ سر پٹکتا تھا

پھر کئی برس کے بعد مجھے معلوم ہُوا۔ کہ جو مضمون مَیں نے اس بند کے چھٹے مصرع میں باندھا ہے۔ اُس کو جناب میر انیس مرحوم (کچھ فرق کے ساتھ) پہلے ہی نظم فرما چکے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ ؎

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

پس منصف مزاج اس کو توارد کہینگے۔ سرقہ وُہی ناتجربہ کار کہ سکتا ہے جس کو شعر

---

[1] لطیفہ۔ مَیں اگر حضرت غالب مرحوم کی حضوری میں باریاب ہوتا۔ تو اس شعر کو پڑھ کر عرض کرتا۔ کہ جناب اگر یہی سرقۂ مضمون ہے، تو پھر یہ مثل صادق آتی ہے۔ کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

[2] واضح ہو۔ کہ فرات کو بعض آدمی مذکر بولتے بعض مؤنث بولتے ہیں۔ مگر کربلائے معلّے میں جو ہندی آباد ہیں۔ وہ بالاتفاق مذکر بولتے ہیں اور جناب مرزا مرحوم نے بھی مذکر نظم فرمایا ہے۔ مَیں نے بھی اُنہیں جناب کی تقلید کی ہے۔ ۱۲ مؤلف حقیر۔

ترجمہ

کہنے سے سروکار نہیں ہے۔ **علاوہ** توارد کے ایک قسم اور بھی ہے۔ جس کو ترجمہ کہتے ہیں۔ وہ یہ صورت ہے۔ کہ شاعر کو کوئی شعر عربی فارسی۔ سنسکرت۔ بھاشا۔ انگریزی وغیرہ کا پسند آیا۔ اُس نے اردو میں ترجمہ کر دیا۔ اس ذریعہ سے اردو کی شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ وسعت زبان اردو کے واسطے اس کی آج کل سخت ضرورت ہے۔ پس جب کہ کسی مترجم کو کوئی چور نہیں کہتا۔ تو ایسے شاعر مترجم کو سارق اور اُس کے شعر کو سرقہ (بھی) کتنا ظلم ہے۔ چنانچہ خود مجھے ایسا بھی اتفاق ہُوا ہے۔ حسان الہند مولوی سیّد غلام علی صاحب آزاد بلگرامی کی کسی کتاب (شاید خزانہ عامرہ) میں ایک شعر کسی ایرانی شاعر کا میری نظر سے گذرا۔ مجھے اُس کا مضمون بہت پسند آیا۔ وہ یہ ہے ؎

ترجمہ مطلع کا مطلع میں

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش | تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش

یہ مطلع تھا۔ میں نے اس کا ترجمہ بھی مطلع ہی میں کیا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

نقاب ڈال کے رُخ پر وہ باغ میں آئے | کہ چھن کے نکہت گل بھی دماغ میں آئے

پس اگر ہم مولوی **شبلی** صاحب کی **خاطر** سے مان بھی لیں۔ کہ میر صاحب کو اُن تمام فارسی کے اشعار کا علم تھا۔ تو بھی ہم اُن کو ترجمہ اور اچھا ترجمہ کہینگے۔ اور مولوی صاحب موصوف سے عرض ہے۔ کہ میر صاحب یا مرزا صاحب کی طرف سرقہ کی نسبت کرنا۔ گو وہ لاکھ اینچ پینچ کے ساتھ ہو۔ **چھوٹا منہ اور بڑی بات** اور گستاخی معاف" گستاخی ہے ؎

استنباط

علاوہ ترجمہ کے ایک اور قسم بھی ہے۔ جس کو کتابوں میں سرقہ مستحسن لکھا ہے۔ مگر اس کا (مستحسن) نام جو بعض شعرائے حال کی زبان پر جاری ہے **استنباط** ہے۔ کہ دوسرے شاعر کے شعر سے تھوڑا سا مضمون لے کر زیادتی کرے۔ جیسے میر تقی میر رح کا یہ شعر ہے ؎

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا گیا تھا | آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا

اس مضمون میں شیخ ذوق نے یہ اضافہ و تغیر کیا۔ ؎

تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے
لیتے ہی دل جو عاشق جاں سوز کا چلے

جناب میر صاحب نے تو اتنا ہی کہا تھا۔ کہ گرم (غصہ میں) میرے پاس سے تم چلے گئے۔ گویا آگ لینے آئے تھے۔ جناب ذوق نے اس میں یہ اضافہ کیا۔ کہ تم عاشق کا دل لیتے ہی چل دئے۔ گویا آگ لینے آئے تھے۔ جب کوئی جلدی جانا چاہتا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ کہ کیا آگ لینے آئے تھے۔ ایک تو قلب عاشق آگ تھا۔ دوسرے جاں سوز کے لفظ نے جان ڈال دی ہے۔ آگ لینے کو آنے کا پورا اطلاق ہو گیا۔ ناظرین! اچھا تو آپ نے جہاں یہ دو شعر سُنے ہیں۔ پھڑکتا ہوا (قریب المضمون) ایک شعر سیدانشاؒ کی ریختی کا بھی اب سُن لیجئے۔ ؎

بی بی ہمسائی نے دی دل میں مرے آگ لگا
آگ لینے کو جو آئیں تو گئیں لاگ لگا

ایسے استنباط مضامین کو بھی بعض نافہم سرقہ کہکر شاعر مابعد کے دامن کمال پر دھبہ لگانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ نہ سرقہ ہے نہ نقص۔ اگر اس کو نقص سمجھا جائے۔ تو زمانہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس باب میں مرزا دبیر مرحوم کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

حاسد کا دل جلے نہ توارد کے داغ سے
روشن چراغ ہوتے ہیں اکثر اک چراغ سے

مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح اپنے گھر سے تیل بتّی لے جاکر ہر کوئی دوسرے کے چراغ سے چراغ جلا لیتا ہے۔ اسی طرح شاعر مابعد اپنی قوت طبع (تیل) اور زور تخئیل (بتّی) اور دماغ (چراغ) کے ذریعہ سے دوسرے کے مضمون سے اپنا مضمون استنباط کرتا ہے۔ اس میں حاسد کیوں اپنا دل جلاتا اور اس کو سرقہ بتاتا ہے*

خیر اب ایک بات اور بھی سُن لیجئے۔ بعض موقع پر شاعر مابعد شاعر ماقبل کے مضمون پر کچھ اضافہ و ترقی کرنا چاہتا ہے۔ اور اپنے نزدیک وہ اضافہ کرتا ہے۔ اور ازبسکہ اپنا لڑکا اور اپنا کلام سب کو اچھا اور پیارا معلوم ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے

کہ میرا مضمون شاعر سابق سے بڑھ گیا۔ مگر درحقیقت نہیں بڑھتا۔ وہ ایک انسان ہے اس لئے اپنے خیال میں غلطی کرتا ہے۔ دوسری طبیعتیں اُس کو ترقی نہیں قبول کرتیں۔ تو اس صورت میں بھی وہ قابل معافی و آفرین ہے۔ کہ اُس نے اپنے ملک کی شاعری میں ایک قسم کی ترقی کرنا چاہی تھی۔ مگر ناکام رہا۔ اس کی کیفیت آپ کو ذیل کے دو نامور شاعروں کے دو مطلعوں سے روشن ہو جائیگی۔ جو میر شمس الدین فقیر مرحوم نے اپنی کتاب لاجواب حدائق البلاغہ میں لکھے ہیں۔ (۱) ظہوریؒ فرماتے ہیں ؎

ظہوری و حزیں

برآں ناتواں صید بیداد رفت که در دام از یادِ صیّاد رفت

شیخ علی حزینؒ جن کا ظہور ظہوریؒ کے بہت عرصہ کے بعد ہوا ہے ارشاد فرماتے ہیں ؎

اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

اگر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ شیخ حزین رحمہ کو ملا ظہوریؒ کے مطلع کا علم تھا۔ تو یہ کہنا چاہیے کہ اُنہوں نے ترقی کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ ظہوریؒ کے مطلع میں ناتواں کے لفظ نے جان ڈال دی ہے۔ اور مطلع حزینؒ سے وہ بہتر ہے۔ کہ مختصر لفظوں میں ہے۔ خیر الکلام ما قلّ و دلّ اصول بلاغت میں سے ایک مشہور اصل ہے۔ مگر یہ یاد رہے۔ کہ خدا کسی کی محنت کو برباد نہیں کرتا۔ (با ایں ہمہ) حقیر کے نزدیک شیخ حزینؒ کے مطلع میں حزن کا اثر ظہوریؒ سے بڑھا ہوا ہے۔ شیخ حزین بھی قابل تحسین و آفرین ہیں +

اگر کتاب کے طولانی ہونے کا خیال مانع نہ ہوتا۔ تو میں اس بحث کو زیادہ طول دیکر عربی۔ فارسی۔ اردو وغیرہ کے بہت سے اشعار ہر زمانے کے قریب المضمون اس موقع پر لکھتا۔ مگر مجبور ہوں۔ اور خیال کرتا ہوں۔ کہ اب بھی بعض ناظرین فرمائینگے۔ کہ حیات دبیر میں اِدھر اُدھر کی باتیں درج کر کے فضول کتاب کا حجم بڑھایا ہے۔ حالانکہ اہل عقل جانتے ہیں۔ کہ ایسی باتوں کے لکھنے سے ملک کے نو مشق شاعروں کو کس قدر

ادھر ادھر کی باتیں نہیں

فیض پہنچتا ہے۔ اور اہل کمال کی سوانح عمری لکھنے سے محض یہ غرض نہیں ہوتی۔ کہ
بس اُن کے حالات تاریخی سے دُنیا واقف ہو جائے۔ بلکہ اُن کے بیان میں بہت سی
علمی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ دبیر مرحوم کے نام قائم
رہنے ہی کی غرض سے یہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اُن کا نام تو غم حسینؑ کے ساتھ
انشاءاللہ قیامت تک قائم رہیگا۔ اور اُن کے کلام سے جو ہر رنگ میں ہے۔ ہر
طبیعت کا شاعر جدا جدا فائدہ اُٹھاتا رہیگا +

فصل ۹ ساتواں داغ چھوٹے چھوٹے دھبے اعتراض بر دختر شاہ حلب

ساتواں داغ

چھوٹے چھوٹے بہت سے دھبوں سے مل کر یہ ایک داغ بنا ہے۔
وہ دھبے یہ ہیں :-

(۱) بادشاہ حلب کی بیٹی سے جو شاہزادہ علی اکبرؑ کی نسبت ٹھیری ہے۔
اور اس واقعہ کو مرزا صاحب نے نظم فرمایا ہے۔ اس کی نسبت مولوی شبلی صاحب
صفحہ ۳۰۹ پر لکھتے ہیں۔ کہ "یہ قصہ بالکل بلاغت و مقتضائے حال کے خلاف
ہے۔ تمام باتوں سے قطع نظر ایک کنواری لڑکی کا بین اور نوحہ جو ابھی عقد میں بھی
نہیں آئی ہے۔ اور پھر دُولھا دُولھا پکارتی جاتی ہے۔ کس قدر لغو و بے معنی
ہے" +

اس کا جواب مفصل میں نے جلد دویم میں (جہاں اس مرثیہ کے تھوڑے سے
بند لئے ہیں) لکھا ہے۔ یہاں اتنا ہی لکھنا کافی ہے۔ کہ (اوّل تو) یہ واقعہ ملک
عرب کا ہے۔ عرب کی عورتوں کے رواج پر خیال کرنے سے کچھ بھی خلاف مقتضائے
حال نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے۔ کہ "قضیہ زمین بر سر زمین"۔ عرب کی ناکتخدا لڑکیاں
ہندوستان کی کنواری لڑکیوں کی طرح شرم نہیں کرتیں۔ اور اس کو وہ مصنوعی شرم کہتی

رواج عرب

ہیں۔ پس خیال کیجئے۔ کہ جب ایک عرب کی ایماندار لڑکی کو یہ امید و خوشی ہو۔ کہ میں خاندان رسالت میں بیاہی جاؤنگی۔ اور اُس کی یہ برسوں کی امید بیکایک اس طرح یاس سے بدل جائے۔ کہ اُس کو اُس ہمشکل رسول خدا امام زادہ کی لاش ریتی پر نظر آئے۔ تو وہ اسی طرح جگر خراش بین کریگی۔ جس طرح جناب مرزا صاحب نے (اُس کے بین) لکھے ہیں۔ اس موقع پر "بے معنی ولغو" الفاظ کلام مولوی صاحب میں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ ایسے عالم اور ایسے کریہ الفاظ بولیں۔ جو بد اخلاقی کی جڑ ہیں۔ مگر میں مرزا مرحوم کی خوش اخلاقی کو پیش نظر رکھ کر جواب میں بھی کوئی سخت لفظ نہیں لکھتا۔ اور مرزا صاحب مرحوم کا ایک مصرع مولوی صاحب کو مخاطب کرکے پڑھے دیتا ہوں ع

دیکھو ہمارے صبر کو اور اپنے جبر کو

(دوسرے) اب ہندوستان کے شریف خاندان کو لیجئے۔ یہاں جو شریف زادی کسی شریف سے منسوب ہوتی ہے۔ (اور بعد نسبت کے) شوہر مرجاتا ہے۔ اور اُس کو منظور یہ ہوتا ہے۔ کہ اب میں اُسی کے نام پر بیٹھی رہوں۔ تو وہ اُس کو شوہر تسلیم کرکے بیوؤں کی طرح بین کرتی ہے۔ اس کی ایک دو نہیں ہزاروں نظیریں سیدوں اور پٹھانوں اور شریف مسلمانوں کی بستیوں میں ملتی ہیں۔ اور یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ البتہ وہ فعل معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کہ جس میں کسی کنواری عورت کی رغبت کسی شخص سے اُس کے عالم حیات میں ظاہر ہو۔ سو اس حکایت میں یہ صورت نہیں ہے*

(۲) مولوی صاحب کو موازنہ میں جابجا (صفحہ ۴۰ و ۱۶۵ و ۲۰۳ پر) مرزا صاحب کی یہ شکایت ہے۔ کہ پہلوان کی لڑائی میں وہ زمین و آسمان کے قلابے

یاس

ہندوستان

اعتراض ۲ زمین و آسمان کے قلابے

* جن لوگوں نے نکاح ثانی بیوہ کے باب میں کوشش کی ہے اور شریف مسلمانوں کی بستیوں میں اس مقصد کے واسطے تشریف لیگئے۔ اور وعظ کئے ہیں۔ اُن سے پوچھئے۔ اس کی تصدیق فرمائینگے۔ اور ایسے واقعات بیان کردینگے + ۱۲ ثابت بے بضاعت۔

ملا دیتے ہیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا۔ کہ دونوں حریفوں میں سے کسی ایک نے دُوسرے پر وار بھی کیا یا نہیں۔ اگر کیا۔ تو کیا ہنر دکھائے +

جواب

مَیں کہتا ہُوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب خود زمین و آسمان کے گویا قلابے ملا رہے ہیں۔ زبان سے تو اس قدر (جا بجا) شکایتوں کے ڈھیر لگا دئے ہیں۔ مگر کسی ایک پہلوان کی لڑائی بھی اُن کے مرثیوں میں سے موازنہ میں اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ دکھائی۔ ع دعوے بے دلیل قبول خرد نہیں۔ مَیں نے اِس جلد اوّل میں کم اور جلد ثانی میں بہت سے پہلوانوں کی لڑائیاں کلام مرزا صاحب سے لکھ دی ہیں جن کو دیکھ کر ہر منصف مزاج یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے لڑائی کی تصویریں کھینچ کر دکھا دی ہیں۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ مولوی صاحب کو وہ کیوں نہیں نظر آتیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو۔ کہ اُن کی چشم دُوربین پر انصاف کی عینک نہیں لگی ہے۔ اس سبب سے وہ مرزا صاحب کے کمالات سے انکار کرتے ہیں۔ اور اپنے قول و دعوے کے ثبوت میں کچھ بھی نہیں پیش کر سکتے +

[illegible]

یہ بھی لکھ دُوں۔ کہ میرا یہی کام نہیں ہے۔ کہ مولوی صاحب کے اعتراض کا جواب ہی دے دُوں۔ بلکہ یہ بھی میرا فرض ہے۔ کہ جو بات در اصل ہے۔ وہ لکھ کر ناواقفان حال کو واقف کر دُوں۔ یہ ایک بھید کی بات ہے۔ مرزا مرحوم کا خیال یہ تھا۔ کہ مرثیہ میں چہرہ۔ سراپا۔ لڑائی۔ رجز سب کچھ ہو۔ مگر اُس میں اس قدر زیادتی نہ ہو۔ کہ جو اصل مرثیت کو لے ڈوبے۔ اگرچہ اُنھوں نے بعض مرثیوں میں پہلوان کی لڑائی شرح و بسط سے بھی لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو اِس مرثیہ مشہور سے "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" میں مرحب بن عبد القمر کی حضرت عباسؑ سے لڑائی۔ یا اس مرثیہ (دست خدا کا قوت بازو حسینؑ ہے) میں امام حسینؑ سے ابولسب پہلوان کی لڑائی ٭ مگر یہ مشرح لڑائی پہلوان کی دو چار

٭ یا اس مرثیہ میں "گلگشت گلستان اجل کرتے ہیں اکبرؑ"۔ یا اس میں "سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل"۔ یا اس میں "پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی"۔ پہلوانوں کی مشرح لڑائیاں نظم فرمائی ہیں + ۱۲ مؤلف حقیر۔

مرثیوں میں اس خیال سے انہوں نے لکھ دی - کہ کوئی ان کو اس امر میں بھی عاجز نہ سمجھے - باقی عام طور پر ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے - کہ پہلوان کی لڑائی میں زیادہ طول نہ دیا جائے - ورنہ تجربہ اس بات کا شاہد ہے - کہ مجالس عزا میں پھر تحت لفظ خواں کے طولانی لڑائی پڑھنے پر رقت نہیں ہوتی - اور مرثیہ کی جو اصلی غرض مرثیت ہے - وہ فوت ہو جاتی ہے - اس لئے وہ ہر پہلوان کی لڑائی میں تمام حربوں نیزہ - تیر - تلوار - گرز وغیرہ کی مشرح لڑائی نہیں نظم فرماتے - مولوی صاحب ہر جگہ تو کتاب میں نیچر نیچر پکارتے رہے مگر اس موقع پر خدا جانے نیچر سے کیوں بیخبر ہو گئے - کیا واقعی تقاضائے عقل یہی ہے - کہ ہر پہلوان نے تمام فنون جنگ دکھائے ہوں - اور پھر امام حسینؑ یا ان کے جاں نثار عزیز یا رفیق نے ایک ایک حربہ سے ٹھیر ٹھیر کے کام لیا ہو - ہرگز ممکن نہیں - صبح سے چار بجے شام تک کی لڑائی اور پھر اس میں ایک ایک شیر خاندان رسالت نے سیکڑوں یا ہزاروں دشمن مارے (جیسا کہ تاریخیں پکار رہی ہیں*) - ایک ایک دشمن کے مقابلہ پر فنون جنگ دکھاتے - تو صدیوں ہو جاتے - پس کسی پہلوان کی لڑائی میں مفصل تمام حربات کا نقشہ کھینچنا - اور کسی کی جنگ میں یہ مختصر طور پر کہدینا - کہ ع اک ضرب میں وہ منکر توحید دو ہوا " مقتضائے حال کے موافق ہے - اور انہیں باتوں پر خیال کر کے ہمارے ملک کے اکثر اہل عقل فیصلہ کر چکے ہیں - کہ مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت زیادہ ہے - مولوی صاحب کے دماغ میں اب تک ان باریک خیالوں نے جگہ نہیں پائی ہے - جس دن بے جا طرفداری کی دھواں دھار گھٹا ہٹیگی - مولوی صاحب بھی بلاغت دبیر کے قائل ہو جائینگے - جیسا کہ خود مرزا مرحوم پیشینگوئی فرما گئے ہیں ۔

* صرف امام حسینؑ نے دو ہزار کے قریب دشمنوں کو روز عاشور قتل کیا ہے - ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ اور اور تاریخیں - ہاں یہ قرین عقل ہے - کہ کسی ایک دو بڑے طاقتور پہلوان کو تمام حربات کی لڑائی میں عاجز کر کے قتل کیا ہو + ۱۲ مؤلف حقیر -

جو حاشیہ کی طرح طرفدار نہ ہونگے میرے سخن صدق سے بیزار نہ ہونگے
کیونکر دُرِ یکتا کے خریدار نہ ہونگے کونین میں ایسے دُرِ شہوار نہ ہونگے

(۳) صفحہ ۸۲ پر تو مولوی صاحب نے لکھا ہے۔ کہ میر انیس صاحب کے یہاں بھی اس صنعت رعایت لفظی کی بہتات ہے۔ لیکن اتنی احتیاط ہے۔ کہ ابتذال نہیں آنے پاتا۔ جس سے ناظر کتاب یہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ کہ میر صاحب کے یہاں مبتذل رعایت لفظی (ضلع جگت) نہیں ہے۔ مگر آگے بڑھ کر مولوی صاحب رنگ بدلتے ہیں۔ اور صفحہ ۲۳۱ پر لکھتے ہیں۔ (چند اشعار میر صاحب کے لکھ کر) کہ ان اشعار میں نہایت مبتذل طریقہ سے لفظی رعایت کو صرف کیا ہے۔ یہ تناقض کہ رہا ہے۔ کہ میر و مرزا پر بے جا اعتراض کرتے کرتے مولوی صاحب کا حافظہ کچھ جواب دے گیا ہے۔ میرے نزدیک میر صاحب کا کلام بھی بیجا رعایت لفظی (ضلع جگت) سے پاک ہے۔ اور مولوی شبلی صاحب زبان اردو کی باریکیوں سے ناواقف ہیں +

(۴) صفحہ ۲۱۴ پر مولوی شبلی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ مرزا دبیر تو اس عالم (مدح شمشیر) میں لامکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے۔ کہ سب کچھ کہتے ہیں۔ اور غور سے دیکھئے۔ تو (تلوار کے متعلق) کچھ نہیں کہتے۔ اس کا مختصر و معقول الجواب جواب یہ ہے۔ کہ اصول موضوعہ بلاغت (ایشیائی) کے موافق مرزا مرحوم کے مضامین عالیہ ہوتے ہیں۔ جو لامکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ کاملوں کے نزدیک وہ سب کچھ کہتے ہیں۔ ناقصوں کی رائے ناقص میں کچھ نہیں کہتے۔ (بقول میر مونس مرحوم سہ)

ہمارا مول کیا ہے اک نظر لطف و عنایت کی جو اعلےٰ ہو تو مہنگے ہیں جو بیناہو تو سستے ہیں

(۵) اسی صفحہ ۲۱۴ پر چند دقیق اشعار* مرزا مرحوم کے لکھ کر مولوی صاحب لکھتے

*ان اشعار کے لکھنے سے فضول طول ہوگا (بعض اشعار کی میں نے کہیں کہیں اس کتاب میں شرح بھی کر دی ہے)۔ اس خیال سے نقل نہیں کئے گئے جو صاحب دیکھنا چاہیں موازنہ کو ملاحظہ فرمالیں یا اس کا جواب المیزان تالیف لطیف منشی چودھری سید نظیر الحسن صاحب رئیس بہار ملاحظہ فرمائیں جو چھپ چکی ہے ۱۲ مؤلف

ہیں۔ کہ "خود انصاف کرو۔ یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم" میں کہتا ہوں۔ مولوی شبلی صاحب کے سر کی قسم تلوار کی تعریف ہے۔ اور اصول مقررہ بلاغت کے موافق شاعری کی معراج کمال ہے۔ اور جتنے کامل ہیں (جن میں سے ایک میر انیس صاحب بھی ہیں) اُن سب کے یہاں ایسی تعریف موجود ہے۔ اور سب کے نزدیک یہ اعلےٰ درجہ کی مدح ہے۔ اگر ایسے مضامین خیالی و عالی قابل ذم ہیں۔ تو ہندی اور عرب و عجم سب ملزم ہیں۔ ورنہ کوئی بھی نہیں۔ ہوائی طلسم اس کو وہی شخص کہیگا۔ جس کو ہواز وگی ہوگئی ہو +

واقعیت معرکۂ کربلا

(۶) مولوی صاحب صفحہ ۳۰۷ پر لکھتے ہیں۔ کہ کربلا کے واقعات جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے۔ جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ نہایت مختصر ہیں" پھر صفحہ ۲۱۹ پر (اور زیادہ نمک مرچ ملا کر بات کو چٹ پٹا بناتے ہیں) لکھتے ہیں" اس موقع پر تمہیں شاید یہ خیال آئے۔ کہ میر انیس کی رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ و شان کی کچھ انتہا نہیں۔ لیکن اصلیت اور واقعیت سے بمراحل دور ہے۔ . . . . معرکہ آرائی کے لحاظ سے اس (واقعہ کربلا) کی صرف یہ حیثیت ہے۔ کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سر و سامان تھے۔ دوسری طرف تین چار ہزار کا مجمع تھا۔ جو دفعۃً ٹوٹ پڑا۔ اور تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ . . . . لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ شاعری میں اصلیت و واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا۔ فرض کرو۔ کہ شاہنامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہو جائیں۔ تو اس سے فردوسی کے کمال شاعری میں کیا فرق آئیگا" آگے چل کر مولوی صاحب طرفداران دبیر مرحوم کے زخم دل پر یوں نمک چھڑکتے ہیں۔ کہ "وہ واقعات

موہوم خیال بندی و لفاظی

بیان کرنے چاہئیں۔ جن سے طبیعت پر واقعی اثر ہو۔ صرف موہوم خیال بندی اور لفاظی نہ ہو۔ جیسا مرزا دبیر صاحب کا انداز ہے" ناظرین! میں کہتا ہوں۔ کہ موہوم خیال بندی و لفاظی ہو یا نہ ہو۔ مگر مولوی شبلی صاحب کی سی غلط بیانی اور اتہام و تناقص کلام میں نہ ہو *

* (جیسے نقص میں اُوپر ثابت کر چکا ہوں اور آئندہ بھی انشاء اللہ پایۂ ثبوت کو پہنچاؤنگا) اللّٰھم احفظنا منھا ۱۲ ہیچمدان ثابت

ہمارے مولوی صاحب کی کچھ عادت ہی ایسی معلوم ہوتی ہے۔ کہ ہمارے ملک کے اکثر اہل علم وکمال جس راہ راست پر جا رہے ہوں۔ اُس پر وہ چلنا نہیں چاہتے خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کسی نے اپنی لیاقت سے دُوسری سڑک تیار کر لی ہے۔ اور اپنی موٹر کو اُس پر لے جانا چاہتا ہے۔ تو لے جائے۔ مگر غضب یہ ہے۔ کہ اور سب جانیوالوں کو جو صراط مستقیم پر جا رہے ہیں۔ گمراہ بتانا بھی اُن کا شیوہ ہے۔ دبیر وانیس کو بالمقابل سمجھنے والوں میں (مولوی صاحب کو) خوب معلوم تھا۔ کہ کیسے کیسے علما شعرا اور مالک کے تھے۔ مگر مولوی صاحب نے سب کو بد مذاق بنا ہی تو دیا۔ وہ تو ایک نئی اُپیچ تھی۔

دُوسرا مذاق

اب یہ دُوسرا مذاق سُنئے۔ معرکہ کربلا کی حیثیت یہ ارشاد ہوتی ہے۔ کہ "سو سوا سو پیاسے بے سروسامان لوگ تھے۔ اُن پر تین چار ہزار کا مجمع دفعتہً ٹوٹ پڑا تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا" اور اس سادگی وصفائی سے فرماتے ہیں۔ کہ سُننے والے کو بالکل اطمینان ہو جائے۔ کہ بس اتنی سی بات ہے۔ جس کو تمام مرثیہ گویوں نے بڑھا بڑھا کر شاہنامہ کی طرح زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ مگر مرزا دبیر میں یہ لیاقت بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو محض موہوم خیال بندی ولفاظی فرماتے ہیں۔ اس مضمون مولوی شبلی صاحب پر مَیں کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ مگر کتب تواریخ ومقاتل یہاں کوٹہ میں نہ ملتی تھیں۔ اس لئے فکر میں تھا۔ کہ یکایک فروری ۱۹۱۲ء کے پرچہ ماہواری "شیعہ" میں جناب سید ذوالفقار حسین خاں صاحب جون پوری* کا مضمون (اسی مضمون مولوی شبلی صاحب کی تردید میں) نظر سے گذرا۔ اس مضمون کی سُرخی ذیعلم مضمون نویس نے "ایک تیر دو نشانہ" لکھی ہے۔ جو موزوں ومناسب معلوم ہوتی ہے۔ مَیں اب اس مقام پر اسی مضمون سے کچھ اقتباس کر کے (ذی علم مضمون نویس کے شکریہ کے ساتھ) درج کئے دیتا ہوں۔ جس سے ظاہر ہوگا۔ کہ اگر اور مرثیہ گویوں یا میر انیس نے اس معرکہ کو بڑھایا ہے

پرچہ شیعہ سید ذوالفقار حسین خاں صاحب جونپوری

*ان سید صاحب نے بھی موازنہ مولوی شبلی صاحب کا جواب لکھا ہے۔ خدا کرے وہ بھی جلد چھپے + ۱۲ مُولف حقیر۔

تو مولوی صاحب نے اُس سے زیادہ گھٹایا ہے۔ ایک پلّہ اگر زمین پر ہے تو دوسرا آسمان پر۔
چنانچہ سیّد صاحب ممدوح لکھتے ہیں۔ کہ ناسخ التواریخ کا مصنّف (جو حال میں
بہت تحقیق سے لکھی گئی ہے) تعداد فوج یزید کی نسبت لکھتا ہے۔ کہ بڑا اختلاف
ہے۔ ابن طاؤس وفاضل مجلسی بیس[۲۰] ہزار۔ ابو مخنف پرچہ نویس فوج یزید اسّی[۸۰] ہزار۔ ابن
شہر آشوب پینتیس[۳۵] ہزار۔ اعصم کوفی بیس[۲۰] ہزار۔ یافعی بائیس[۲۲] ہزار۔ شارح شافیہ پچاس[۵۰] ہزار
صاحب مطالب السئول بیس[۲۰] ہزار اور دیگر مؤرخین اس سے بھی زیادہ آٹھ لاکھ تک
تعداد فوج کی لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد مؤرخ موصوف نے اپنی رائے میں باون[۵۲]
ہزار فوج لکھ کر اُس کی شرح مع افسروں کے نام کے لکھی ہے۔ تین[۳] چار[۴] ہزار کی تعداد
ایک نے بھی نہ لکھی۔ مؤرخین یورپین بھی بیس[۲۰] ہزار سے کم تعداد نہیں لکھتے۔ پھر نہ معلوم
مولوی صاحب نے یہ تعداد قلیل کہاں سے قائم کی۔ اب ایک بات اور سنئے۔ کہ صاحب
ناسخ التواریخ کی تحقیق کے موافق جو لوگ لشکر یزید کے کربلا میں امام حسینؑ اور اُن
کے بہادر ساتھیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں۔ اُن کی تعداد حسب ذیل
ہے:۔

نام شہید راہ خدا	مقتولین لشکر یزید	کیفیت
علی ابن حر غازی	۷۰	
حر ابن یزید ریاحی	۸۲	تیسرے حملہ میں قتل کے دو حملوں میں جو مارے۔ وہ نہیں معلوم ہوئے +
ایضاً	۵	قبل حملوں کے +
بُریر ہمدانی	۳۱	
وہب ابن عبداللہ کلبی	۱۰۲	حملہ دویم میں۔ حملہ اوّل کی تعداد نہ معلوم ہوئی۔ اس سے زیادہ ہوگی +
مادر وہب	۳	
مسلم بن عوسجہ	۵۰	یہ صحابی رسول خدا ایک ضعیف العمر بزرگ ہیں +
پسر مسلم بن عوسجہ	۳۰	

نام شہید راہ خدا	مقتول	کیفیت
ہلال بن نافع بجلی	۹۳	
زہیر ابن قین	۱۲۰	
حجاج ابن مسروق	۱۵۰	
یحییٰ بن کثیر	۵۰	
غلام ترکی	۷۰	
یزید بن زیاد	۵	فقط تیر سے۔ تلوار و نیزہ سے اور مارے ہو نگے +
سیف ابن ابی الحارث	۵	
زیاد ابن مظاہر	۹	
ابراہیم ابن الحسین	۸۴	
علی ابن مظاہر	۷۰	
المعلّےٰ ابن المعلی	۶۴	
طرماح ابن عدی	۷۰	
محمد بن مطاع	۳۰	
جابر بن عروہ	۸۰	
مالک ابن داؤد	۶۰	
انیس بن معقل	۱۰	
عبد اللہ بن مسلم	۹۰	

نام شہید راہ خدا	مقتول	کیفیت
جعفر بن عقیل	۱۵	
عبد الرحمٰن بن عقیل	۱۷	
موسےٰ بن عقیل	۷۰	
احمد بن محمد بن عقیل	۸۰	
محمد بن عبد اللہ بن جعفر طیار	۱۰	
عون بن عبد اللہ	۱۲	
قاسم بن حسن	۷۰	
عبد اللہ اکبر ابن حسنؑ	۱۴	
احمد بن حسن	۱۹۰	
عبد اللہ اصغر ابن علی	۲۱	
عبّاسؑ بن علیؑ	۸۰	صرف دریا جاتے وقت واپسی کے وقت اس سے زیادہ شدید لڑائی ہوئی ہے۔ اُس میں اس سے بہت زیادہ ناری مارے ہو نگے +
علی اکبر ابن الحسینؑ	۲۰۰	
امام حسینؑ	۱۹۵۰	صرف حملۂ اوّل میں جو حملہ امام حسینؑ نے فرمائے۔ باقی دو حملوں کی تعداد نہیں معلوم ہوئی، اور جو ہمشیرہ کی لاش اٹھانے کے وقت جو حملہ ہوا وہ جناب نے فرمائے تھے۔ وہ سب اس کے علاوہ ہے +
میزان	۴۱۶۲*	

* علامہ ابو اسحاق اسفرائنی جو چوتھی صدی ہجری کے اہل سنت و جماعت کے ایک مستند عالم ہیں۔ اور جن سے جناب شیخ مفید شیعی رح سے مناظرہ بغداد میں ہوا تھا۔ انہوں نے بھی ایک مقتل شہدائے کربلا لکھا ہے۔ اسمیں ایک ایک ہمراہی امام حسینؑ کا سیکڑوں دشمنوں کو قتل کرنا لکھا ہے۔ اور انہی کی کتاب پر حساب خیال کرنے سے یہ چار پانچ ہزار کتاب د مقتولین فوج یزید کی بہت ہی کم پائی جاتی ہے + ۱۲ مؤلف حقیر۔

اور ان شہدا کے سوا باقی شہدا کی جنگ کی کیفیت لکھی ہے۔ لیکن مقتولوں کی تعداد نہیں لکھی۔ اور اُن باقی شہدا میں بڑے بڑے شجاع مثل حبیب ابن مظاہر اسدی و نافع ابن ہلال و پسران جناب امیرؑ و عقیل و جعفر طیّار ہیں۔ پس مولوی صاحب کا یہ تین چار ہزار لکھنا کس قدر خلاف عقل و نقل ہے۔ چار ہزار سے زیادہ تو اسی حساب سے مر چکے۔ اگر تین چار ہزار ہی تھے۔ تو پھر امام حسینؑ کو کس نے قتل کیا +

فردوسی کے شاہنامہ کے واقعات کو کربلا کے واقعات سے کیا تعلق ہے۔ ہر ایک واقعہ کربلا کا حیرت خیز ہے۔ جس کی نظیر ہر حیثیت سے تاریخ عالم میں نظر نہیں آتی۔ نہ ایسے بہادر رُوئے زمین پر گذرے۔ نہ ایسے گھمسان کی لڑائی ہُوئی۔ سویرے سے لڑائی شروع ہُوئی۔ تین چار گھڑی دن رہے تک برابر نو دس گھنٹہ* تک تلوار برستی رہی۔ تلوار کی لڑائی گھنٹہ دو گھنٹہ ہر جگہ ہوتی ہے۔ پھر کسی ایک گروہ کی شکست دُوسرے کی فتح ہو جاتی ہے۔ مگر اُن بہادروں نے نو دس گھنٹہ تک ہزاروں کا مقابلہ کیا۔ یہ شجاعت عام لوگوں کے خیال میں خود فوق طاقت بشری ہے۔ پھر اس میں میر انیس مرحوم یا اور کوئی شاعر کیا مبالغہ کر سکتا ہے +

اس کے بعد ذی علم مضمون نویس نے حضرت مسلم بن عقیلؑ کی مفصل لڑائی لکھی ہے۔ اور دکھلایا ہے۔ کہ اُس شیر بیشۂ ہاشم نے ہزاروں کا مقابلہ کر کے اُن سب کو بھگا دیا۔ اور خُون کے دریا بہا دئے۔ ایسے ہی اور بھی امام حسینؑ کے ساتھی تھے۔ مگر اکثر راوی وہی یزید کے لشکری ہیں۔ اس لئے صحیح تعداد مقتولوں کی ہم تک نہیں پہنچی۔ اور اُحد و خیبر و حُنین و یرموک وغیرہ کی لڑائیوں میں لشکر اسلام کی قلیل فوج اور لشکر مخالف کی کثیر تعداد ہونے پر بھی فتح اسلام ہُوئی۔ یہ دکھا کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ یہ سو سوا سو امام حسینؑ کے ہمراہی شیر کوفیوں کی کثیر فوج سے لڑنے اور فتح حاصل کرنے کے لئے کم نہ تھی۔ لیکن

* ۱۲ گھنٹہ کے قریب دن ہوگا۔ اس لئے ۹ یا ۱۰ دس گھنٹہ تک لڑائی ہُوئی کہ اکتوبر کا مہینہ تھا + ۱۲ مؤلف۔

فتح ظاہری سے اتنا نفع اسلام کو نہیں پہنچتا۔ جتنا ان خاصان خدا کی شہادت سے پہنچا۔ اس لئے فتح نہ ہوئی۔ (المولف) ؎

باغ و بہار کر گئے ریتی کو د. بن کی　　سینچا ہے اپنے خون سے کھیتی کو دین کی*

پس مولوی صاحب کا تین چار ہزار آدمی لکھنا اور لڑائی کی حیثیت خفیف کر کے دکھلانا اس مثل کا مصداق ہے۔ کہ وہ علاوہ اور کمالات کے علم تاریخ میں بھی ید طولےٰ رکھتے ہیں۔ مرزا دبیر صاحب پر جو مولوی صاحب نے عنایت فرمائی ہے اُس کا جواب مختصر یہ ہے۔ کہ مرزا دبیر مرحوم کے مرثیہ پر مجلسوں میں جو اثر ہوتا ہے۔ دُوسروں کے مرثیوں پر نہیں ہوتا۔ پس اس سے اُن کی مقبولیت و اثر ثابت ہوتا ہے۔ موہوم خیال بندی اور لفاظی ہرگز مرزا صاحب کے کلام میں نہیں ہے۔ مولوی شبلی صاحب نے شاہنامہ کے واقعات سے مرثیہ کے مضامین کو تشبیہ دی ہے۔ خدا کی شان دیکھئے۔ مرزا مرحوم اس کی بھی تردید فرما گئے ہیں۔ ؎

شہنامہ نہیں مرثیہ سیف خدا ہے　　گر شاہ و گدا ہوں ہمہ تن گوش بجا ہے

مولوی صاحب کو یہ بھی خبر نہیں۔ کہ تاریخ و حدیث کے مضامین جس کثرت سے مرزا مرحوم کے مرثیوں میں ہیں۔ کسی مرثیہ گو شاعر کے کلام میں نہیں ہیں۔ اس کو مولوی صاحب موہوم خیال بندی و لفاظی سمجھ رہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ مولوی صاحب تاریخ و حدیث میں بھی ایسے ہی ہیں۔ جیسے اردو کی شاعری میں +

(۷) ص ۲۳۰ پر میر انیس مرحوم کی غلطیوں و کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ فردوسی و قاآنی جو قادر الکلام و پُر گو شعرا ہیں۔ اُن کے یہاں بھی اس قسم کی

لفاظی و موہوم خیال بندی

بیان اعتراض قادر الکلام شعرا

* ذی علم مضمون نویس نے یہ مضمون لکھ کر نتیجہ نکالا ہے۔ کہ مرزا حیرت کے الہامی مضمون اور جدت پسند کارروائی (انکار شہادت امام حسینؑ) میں مولوی شبلی صاحب بھی کچھ شریک ہیں ادھر موازنہ انیس و دبیر لکھ کر مولوی صاحب نے ادھر دبیر پر حملہ کیا اُدھر واقعہ شہادت کو خفیف کرنا چاہا۔ اس لئے ایک تیر اور دو نشانہ کا مصداق ہوا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

بے اعتدالیاں کثرت سے ہیں۔ اس لئے قادر الکلام شعرا کو اس جرم سے بری رکھنا چاہئیے ؛

جناب شبلی صاحب کی عدالت عالیہ سے فردوسی۔ قاآنی۔ انیس تو قادر الکلامی کی بدولت بری ہوئے۔ مگر افسوس وہ شاعر اہلبیت بری نہیں ہوا۔ جس کا کلام فردوسی۔ قاآنی۔ انیس ہر ایک سے بہت زیادہ (شاید دس گنا) ہے۔ نہ معلوم اُس کا گناہ کیوں ایسا سنگین ہو گیا ہے۔ اور ایسی تجویز کا نام بے جا طرف داری۔ نا انصافی۔ یا اور کچھ ہے ؟

اعتراض

(۸) صفحہ ۲۰۴ پر جو کچھ زیب رقم ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ مرزا دبیرؔ کے یہاں الفاظ کا تناسب۔ ترکیب کی دلآویزی۔ برجستگی و سلاست بہت کم ہے۔ ایک لفظ بلند دُوسرا پست و مبتذل۔ کہیں صاف و سلیس۔ کہیں تعقید و بے ربطی۔ اکثر الفاظ دُھوم دھام کے ہیں۔ مگر حاصل کچھ نہیں ؛ مَیں کہتا ہُوں۔ کہ مولوی شبلی صاحب تو کیا خاک انصاف فرمائینگے۔ کہ اُن کا دل ہی مرزا مرحوم کی طرف سے مکدر ہے۔ مگر ناظرین با تمکین! آپ میرے معروضہ پر غور و انصاف فرمائیے۔ جن شعرا کے دیوان یا کلیات چار چار چھ چھ جزو کے ہیں۔ اُن کے کلام میں چُست و سُست۔ بلند و پست۔ تعقید و تعقیب۔ بے ربطی و ربط۔ دُھوم دھام اور سادگی سب کچھ موجود ہے۔ پھر ایک ایسے شاعر اہلبیت (دبیر) کے کلام میں (جسکی ۲۰ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اور غالباً اتنا ہی کلام غیر مطبوعہ اور دُوسروں کے نام سے کہا ہُوا چھپنے سے باقی ہے) اگر سُست و چُست کلام ہے۔ اور کچھ کلام میں بالفرض برجستگی و دلآویزی بہت کم ہے۔ تو کیا ستم ہے۔ دیکھنے کے قابل یہ امر ہے۔ کہ باوصفیکہ مرزا مرحوم اپنے تمام معاصرین سے زیادہ پُرگو ہیں۔ مگر پھر بھی اُن کا کلام اچھا زیادہ ہے مبتذل کلام مرزا مرحوم کا مجھے بالکل نہیں ملا۔ مولوی شبلی صاحب نارہ و دیورو غیرہ کو مبتذل

انصاف طلب

بے ربطی

سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ اُن کی ناواقفی ہے۔ اب رہی کلام میں بے ربطی۔ یہ عام طور
پر اُن کے مرثیوں میں ہرگز نہیں۔ نہ اُن کے مرثیوں میں مسلسل قصہ یا مثنوی کی شان ہے۔
نہ آج تک عام شعرائے مرثیہ گو (عرب و عجم و ہندی) کے کلام میں میں نے مرثیوں میں یہ تسلسل
کی شان دیکھی۔ سب سے زیادہ (رُوئے زمین کے مرثیوں میں) ملا محتشم علیہ الرحمہ کے
۱۲ بند مقبول ہیں۔ جن میں سے بعض بند مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ میں لکھ دئے
ہیں۔ اُن میں بھی ایسا تسلسل نہیں ہے۔ جس تسلسل کو مولوی صاحب یا اُن کے ہم خیال
مرثیہ اردو میں ڈھونڈھتے ہیں۔ مرزا صاحب کے مرثیوں میں ایک بیان واقعہ تک
تسلسل قائم رہتا ہے۔ پھر وہ ایک واقعہ سے دُوسرے واقعہ کی طرف گریز فرماتے
ہیں۔ اُس موقع پر تشبیب و تخلّص قصیدہ کا لطف آتا ہے۔ کس عمدگی سے ایک
واقعہ کا وصل دُوسرے واقعہ سے فرماتے ہیں۔ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ
ضرور ہے۔ کہ بعض مرثیوں میں پڑھنے والوں نے کمی بیشی کر کے کچھ بے ربط کر دیا ہے۔
اور اصل مرثئے غدر ۱۸۵۷ء میں مرزا مرحوم کے گھر میں باقی نہیں رہے ہے۔ جو جا بجا سے
دستیاب ہوئے۔ وہی دفتر ماتم میں چھپے۔ سو ایسی بے ربطی جناب میر انیس مرحوم
کے مطبوعہ مرثیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ باوصفیکہ وہ جناب تسلسل کا بہت لحاظ رکھتے
تھے۔ مگر جب اصلی مرثئے نہ رہیں۔ تو کیا کیا جائے۔ ؎

چہ تواں کرد مرد ماں ایں اند
با ہمیں مرد ماں بباید ساخت

اور ایک لفظ یا مضمون شاندار و بلند اور دُوسرا پست اگر کہیں کہیں ہے۔ تو وہ
اس بات کی دلیل ہے۔ کہ مرزا مرحوم ایک بشر تھے معصوم نہ تھے۔ تعقید و تعقیب
بھی ضرور کہیں کہیں ہے۔ کہ ہر شاعر بحر و قافیہ و ردیف کی پابندی سے بھی کبھی مجبور
ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی خود اردو نثر میں بھی الفاظ مقدم مؤخر بولے جاتے ہیں۔*

* جیسے اردو میں بولتے ہیں۔ ہم نے کہا کب تھا ۱۲ مؤلف حقیر۔

گو عام طور پر یہ رواج نہیں ہے۔ بااین ہمہ اتنا کہونگا۔ کہ جس کثرت سے تعقیدات وغیرہ اُن
کے معاصرین مضمون آفرین شعرا کے کلام میں ہیں۔ اُتنی مرزا مرحوم کے مرثیوں میں ہرگز نہیں
ہیں۔ اگر مَیں تمام معاصرین دبیر کے کلام میں سے ایسے عیوب اور کمزوریاں دکھاؤں۔
تو میری کتاب تاریخ طبری سے بڑھ جائے۔ اور ہر خاندان کے شاعر ناراض ہوجائیں اس لئے
اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے۔ اس کے بعد جو مولوی صاحب نے مرثیۂ "اے دبدبۂ نظم دو عالم
کو ہلادے" اور دو ایک اور مرثیوں کے چند بند لکھے ہیں۔ اور اکثر مصرعوں کو فرماتے
گئے ہیں۔ کہ یہ بے ربط ہے۔ اِس لفظ کو اُس لفظ سے کیا تعلق ہے۔ یہ بھدّی ترکیب
ہے۔ وہ سب مولوی صاحب کی خوش فہمی ہے۔ جن میں سے بعض بندوں کو بندہ نے
شرح کر کے سمجھا دیا ہے۔ اِس سے زیادہ اِس کتاب میں لکھنے کی مَیں ضرورت نہیں
سمجھتا۔ کیونکہ سخن فہم ناظر کتاب خود انصاف کرلیگا۔ کہ مولوی صاحب جس لفظ کو غیر مربوط
بتاتے ہیں۔ وہ مربوط ہے۔ علاوہ اس کے اسی زمانہ میں ایک کتاب لفظ بلفظ موازنۂ
مولوی شبلی صاحب کی تردید میں میرے دوست اور اُستاد بھائی جناب چودھری
سید نظیر الحسن صاحب رئیس جھابن نے لکھی ہے* اس لئے بھی میں نے اپنی کتاب میں
بعض جزئی اعتراضات مولوی شبلی صاحب کا جواب نہیں دیا۔ اس کتاب کا نام "المیزان" ہے
اور اس کا ذکر خیر مَیں ایک اور جگہ بھی کرچکا ہوں۔ اور یہاں بھی عمداً دوبارہ کیا۔ تاکہ ناظرین
اُس کتاب کو بھی دیکھیں۔ اور ذیعلم مؤلف کی محنت و کمال کی داد دیں +

اعتراض ۹ خلاف عقل

(۹) صفحہ ۲۶۱ پر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ کہ جناب سکینہ کے کہنے سے
قبل از وقت سکینہ کو بھی یتیم سمجھ کر اپنے فرزند کے ساتھ اُن کا بھی جناب عباسؑ نے
گریبان چاک کردیا۔ خلاف عقل و عادت ہے۔ کیونکہ وہ اُس محبّت کے سبب سے جو اُن کو

* اس کتاب کی مَیں نے لکھنؤ میں شروع ۱۹۱۲ء میں مصنف کے پاس زیارت کی تھی۔ جو بہر وجوہ مکمل تھی۔ شاید میری کتاب سے پہلے
یا اس کے بعد ہی وہ بھی چھپ جائے (انشاءاللہ) + ۱۲ مؤلف حقیر۔

جناب امام حسینؑ سے بھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بند جس پر یہ اعتراض مولوی صاحب کا ہے حسب ذیل ہے:۔

رُوئے نادان کی تقریر پہ عباسؑ کمال
اور کہا دل سے کہ اس کا بھی کرو رفع سوال
بے پدر ہو گی کوئی ان میں یہ نیک خصال
چاک اُس کا بھی گریباں کیا با حزن و ملال
پیار جو آگیا بنت شہ دیں کے اوپر
بوسے دے دے کے ملی خاک جبیں کے اوپر

ناظرین! انصاف سے فرمائیگا۔ کیا ایسا خیال آنا بھی محبت کے خلاف ہے۔ حضرت عباسؑ اپنے والد ماجد جناب امیرؑ سے سن چکے ہیں۔ کہ روز عاشورا ۶۱ھ امام حسینؑ ضرور شہید ہونگے۔ اور قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب میرے بعد اُن جناب کی شہادت ہوگی۔ پھر ایسا خیال کب خلاف محبت ہے۔ مولوی صاحب تو ایسی وہم و وسواس کی باتیں کرتے ہیں۔ جو ہندوستان کے وہمی بھی شاید نہ کریں +

اعتراض ۱۰

(۱۰) ص ۶۱ پر مولوی صاحب مرزا صاحب کی اس بیت پر (جو جناب زینبؑ حضرت بانو مادر علی اکبرؑ سے خفا ہو کر فرما رہی ہیں۔ ؎

سب جانتے ہیں بنتِ جناب امیرؑ ہوں
گھر میں تمہارے رہتی ہوں اس کے حقیر ہوں)

سفیہانہ اور عامیانہ

ان الفاظ سخت میں اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ یہ طریقہ اظہار مقصد کا سفیہانہ اور عامیانہ اور جناب زینبؑ کی متانت و وقار کے خلاف ہے +

مَیں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کو سفیہانہ و عامیانہ الفاظ لکھتے وقت کچھ شرم کرنا چاہئے تھی۔ اعتراض میں ایسی سختی مرزا صاحب تو مرزا صاحب مولوی صاحب کی شان کے بھی خلاف ہے۔ بقول حضرت غالب مرحوم ؎

شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

مرزا صاحب کے کلام کا مفہوم یہ ہے۔ کہ دیکھنے والے شاید یہ سمجھتے ہیں۔ کہ مَیں تمہارے گھر میں رہتی ہوں۔ اس لئے اُن کی نظروں میں حقیر ہوں۔ مگر یہ خیال اُن کا غلط ہے۔

چنانچہ اس کے بعد ہی کے بند میں تردیدًا فرماتی ہیں۔ ع گھر آپ کا نہیں مرے بھائی کا گھر ہے یہ۔ اس عامیانہ وسفیہانہ خیال ہی کو تو مرزا صاحب نے جناب زینبؑ کی زبانی دفع فرمایا ہے۔ افسوس آپ نے یہی بیت لکھ کر اعتراض جڑ دیا۔ آگے کا بند یا کم سے کم ایک مصرع (مذکورہ) نہیں لکھا جس سے یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔ میں آپ کے اس طریقہ کو عامیانہ وسفیہانہ تو کیا بکار خویش ہشیار بھی نہ کہونگا۔

(۱۱) صفحہ ۲۶۲ پر یہ بیت لکھ کر کہ

محبوب ہوں خدائے ذوی الاحترام کا — نانا ہوں میں حسینؑ علیہ السّلام کا

یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ کیا جناب رسول خدا صلعم بھی امام حسینؑ کا نام علیہ السّلام کہکر لیتے تھے؟

میں کہتا ہوں۔ کہ اگرچہ یہ بیت مرزا صاحب کی تصنیف نہیں ہے۔ کیونکہ جس مرثیہ میں یہ بیت ہے۔ وہ تمام مرثیہ اور کسی کا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس موقع پر علیہ السّلام کی لفظ میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جناب رسولؐ خدا بلکہ خود خدا بھی آن پر درود بھیجتا ہے۔ اولٰئک علیھم صلوٰۃ من ربّھم و رحمۃ آیۂ قرآنی شاہد ہے۔ کہ خدا اپنے مصیبت زدہ پیارے بندوں پر صلوات بھیجتا ہے۔ جس کا مرتبہ سلام سے بھی اعلےٰ ہے ٭۔ اور اس آیہ کے مصداق امام حسینؑ کو سمجھنے میں غالبًا مولوی شبلی صاحب کو بھی عذر نہ ہوگا۔ اور جناب رسول خدا صلعم نے اپنی اہلبیت اطہارؑ کی نسبت جن میں امام حسینؑ بھی ہیں فرمایا ہے۔ کہ صغیرنا و کبیرنا سواء ہمارے چھوٹے بڑے برابر ہیں۔ اور عام مؤرخین اسلام وغیر اسلام لکھتے ہیں۔ کہ جناب

٭ خدا صلوٰۃ بھیجتا ہے۔ تو رسولؐ خدا کا سلام بھیجنا کیوں نامناسب ہو سکتا ہے۔ رسولؐ تو خدا کے تابع اور بندۂ مقبول ہیں۔ جن کے اخلاق ہیں خدا کے اخلاق کا پرتو ہے۔ خدا اپنے پیارے بندوں پر سلام بھی بھیجتا ہے۔ جن میں سے امام حسینؑ بھی ہیں۔ پس رسول خدا کا سلام بھیجنا عین بلاغت اور مقتضائے حال کے موافق ہے ۱۲ مؤلف۔

رسول خدا صلعم اپنی بیٹی جناب فاطمہؑ کی تعظیم کو سرو قد کھڑے ہو جاتے سنئے مولوی صاحب! خاص کسی فرقہ کے مذاق سے جب تک آپ آگاہ نہ ہوں۔ ہرگز اعتراض نہ فرمایئے۔ خاصان خدا کی شان کو عوام کی شان سمجھ کر اعتراض کیجئے۔ یہ اخلاق محمدیؐ کے بالکل مطابق ہے کوئی ... کے خلاف ہو۔ اور یہ مقولہ جناب رسول خدا صلعم اُن جناب کی زمانہ حیات کا بھی نہیں ہے۔ بلکہ بعد شہادت امام حسینؑ وقت دفن حضور صلعم امام زین العابدینؑ سے فرما رہے ہیں۔ اور ایسا اعتراض کرنے سے پہلے آپ کو یہ ثابت کرنا لازم تھا۔ کہ مرثیہ اور ڈرامہ ایک چیز ہے۔ حالانکہ ایسا فرض بھی کر لیا جائے۔ جب بھی (بوجوہ مذکورہ) اعتراض نہیں ہو سکتا ہے*

مرثیہ اور ڈرامہ

عمدہ ۱۲ اعتراض

(۱۲) صـ ۲۶۲ پر یہ دو بند مندرجہ ذیل لکھ کر

یہ بات سُن کے بنتِ علی نے گھونگھٹ اُلٹ لیا
عباسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا

صدقے میں تم یہاں سے سرک جاؤ اک ذرا
تم سب کے آگے روتے ہوئے آئیگی حیا

ماتم کا ہے ہجوم دل پاش پاش پر
جی بھر کے رولے بنتے قاسم کی لاش پر[1]

ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بصد بکا
کبرےٰ نے ہاتھ باندھ کے تب شاہ سے کہا

ہم کچھ کہیں جو مانئے اے شاہ کربلاؑ
احسان ہوگا لاش کو رکھ دیجیے ذرا

بالیں پہ بیٹھیں سر پہ ذرا خاک ڈال لیں
ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنا نکال لیں[2]

یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ "مرزا صاحب اور دیگر تمام مرثیہ گویوں نے اہل حرم کی عادات و مراسم ہندوستان کی شرفا کے مستورات کے مطابق فرض کئے ہیں۔ اسی بنا پر حضرت کبرےٰ کا اپنے چچا اور باپ اور بھائی سے یہ کہنا کہ تم لوگ یہاں سے سرک جاؤ میں اپنے

[1] ایک بند اس موقع پر اور بھی لکھا ہے۔ مگر اعتراض اُس بند سے متعلق نہیں۔ اس لئے میں نے وہ بند نہیں لکھا + ۱۲ مؤلف۔

[2] یہ بند مرزا صاحب کا نہیں ہے۔ کسی ذاکر نے آخر کے سات بند ملا دئے ہیں۔ جن میں سے پہلا یہ بند ہے۔ مگر میں نے اس سے بحث نہیں کی ہے کہ کسی کی تصنیف ہے۔ میں کہتا ہوں۔ ع جس نے کہا درست کہا اور بجا کہا + ۱۲ مؤلف حقیر۔

شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہوں۔ کس قدر بے حجابی اور بےشرمی ہے۔ طرّہ یہ کہ یہ بھی کہتی ہیں۔ کہ تم سب کے آگے روتے ہوئے شرم آئیگی۔ لیکن یہ کہتے ہوئے شرم نہ آئی"+

جواب خوش فہمی

مَیں کہتا ہوں۔ کہ مولوی صاحب کی خوش فہمی کی یہ معراج کمال ہے۔ کہ وہ اس قول کا قائل "جی بھر کے رولے یہ بنے قاسم کی لاش پر" جناب کُبرٰی کو سمجھ گئے ہیں۔ حالانکہ یہی مصرع اگر اُن کی زبانی ہوتا۔ تو یوں ہوتا۔ ؎ جی بھر کے رولوں مَیں بنے قاسم کی لاش پر۔ مولوی صاحب خود ہی یُوں لکھ رہے ہیں۔ ؎ جی بھر کے رولے یہ بنے قاسم کی لاش پر۔ اِس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اس کا قائل کوئی دُوسرا ہے۔ وہ کون؟ اُوپر کے بند ملاکر پڑھنے سے ثابت ہوگا۔ کہ اس کی کہنے والی جناب بانوؑ مادر فاطمہ کُبرٰی ہیں۔ اُوپر کا بند مولوی صاحب نے اپنی خوش فہمی یا خدا معلوم کس خیال سے نہیں لکھا۔ وہ بند یہ ہے۔ ؎

ناگاہ کی یہ فاطمہ کُبرٰی نے گفتگو — لوگو کوئی ذرا مرے والی سے پُوچھ لو
گھونگھٹ میں اُلٹوں بال مَیں کھولوں جو تم کہو — ماں بولی اب نہ شرم کرو سر کو کھول دو
سر ننگے تم کو جانا ہے انبوہ عام میں — چھپنے گا شمر اوڑھنے آکر خیام میں
یہ بات سُن کے بنڑی نے گھونگھٹ اُلٹ لیا — عباسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا

یعنی حضرت بانوؑ نے صدا دی۔ کیونکہ اُنہیں کا مقولہ اُوپر سے چلا آتا ہے۔ (اس موقع پر مَیں یہ نہ کہونگا۔ کہ مولوی صاحب کے سامنے آتے ہوئے شاید خوش فہمی کو بھی شرم آتی ہے۔ ورنہ اُن کے ہواخواہ بگڑ جائینگے۔ کہ اُن کو ہماری سختی گو وہ جواب میں ہی ہو۔ نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب کی سخت کلامی نہیں دکھائی دیتی)۔ اب یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ یہ جو کلیہ مولوی صاحب نے قائم کیا ہے۔ کہ تمام مرثیہ گویوں نے عادات و رواسم نسواں شرفائے ہند کے موافق عادات اہل حرم کو فرض کیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ مرثیہ گویوں نے اور خصوصاً جناب مرزا صاحب نے کہیں رواسم ہند کے موافق اور کہیں رواج عرب کے

رواج عرب

مطابق تخئیل فرمائی ہے - اگر محض رواسم اہل ہند کے مطابق ہر جگہ تخئیل ہوتی - تو ہودج
کجاوہ محمل کی جگہ سب مرثیہ گو پینس - ڈولی - رتھ - گاڑی وغیرہ لاتے - کہ ہندستان
کی شریف زادیاں ان سواریوں میں سوار ہوتی ہیں - حالانکہ تمام مرثئے دیکھ جائیے - کہیں
ڈولی - پینس - گاڑی وغیرہ کا نام نہیں ہے - اب یہ بھی سُن لیجئے - کہ عرب کی
عورتیں ہندوستانی عورتوں کی طرح شرم نہیں کرتیں - بلکہ اس کو وہ مصنوعی وریائی شرم
سمجھتی ہیں - ہر ملک و ہر رسمے مثل مشہور ہے - چنانچہ مَیں ۱۳۱۱ھ میں بمقام (بغداد)
کاظمین شیخ علی و شیخ حسین صاحبان کے مکان میں مع مستورات کے ٹھیرا ہُوا تھا - ہمارے
ساتھ اور بھی ہندوستان کے شرفاء کے چند خاندان مقیم تھے - شیخ حسین صاحب کی جوان
ناکتخدا بیٹی کو ایک روز اُن کے چچازاد بھائی لپسر شیخ علی نے ایک جوڑی جُوتی لاکر دی - وہ
ہماری عورتوں کے پاس دکھانے کو لائیں - ہماری عورتوں نے پُوچھا - کس نے تم کو یہ جُوتی
دی - اور تم اُن سے کیا باتیں کر رہی تھیں - تو انہوں نے جواب دیا - کہ یہ میرا دُولھا ہے ٭
عورتوں نے پُوچھا - تمہاری شادی ہو چکی ہے - کہا ابھی نہیں - صرف نسبت ہُوئی ہے -
عورتوں نے کہا - تم دُولھا کہتی ہو - اور اُن سے باتیں کرتی ہو - تمکو شرم نہیں آتی - اُس
لڑکی نے جواب دیا - کہ ایسی مصنوعی جھُوٹی شرم تم ہندیوں میں ہے - ہم میں یہ مکّاری
سمجھی جاتی ہے + مولوی صاحب! ایمان سے فرمائیگا - کتب احادیث صحاح
ستّہ وغیرہ میں جو حدیثیں ازواج رسولؐ جناب امّ المومنین عائشہؓ وغیرہ سے مجامعت ..
پیشاب وغیرہ وغیرہ کے متعلق منقول ہیں - کیا ایک ہندی عورت ایسی باتیں بالخصوص
مردوں سے کہہ سکتی ہے - نہیں ہرگز نہیں - بلکہ رواج عرب کے موافق وہ سب باتیں کہی گئی

حکایت واقعی

٭ یہ شیخ حسین و شیخ علی حبیب ابن مظاہر اسدی کی نسل میں سے صحیح النسب عرب ہیں - ہندوستان کی مرد عورتیں آئے دن
اُن کے یہاں اُترتی ہیں - اس لئے اُن کی عورتیں اردو بھی اسی طرح بولتی ہیں جیسی عربی و فارسی - ہندی عورتوں سے وہ سلیس اردو میں
بات چیت کرتی ہیں + ۱۲ ثابت ہیچمدان -

یوں نہیں بولتے۔ یہ خاص میری زبان ہے۔ جس سے اُن کی مراد وہی فیض آبادی زبان ہوتی تھی٭۔ ناظرین! میں یہ بھی نہ کہونگا۔ کہ مولوی صاحب نے (باوصفیکہ وہ زبان سے ناواقف ہیں۔ مگر) یہ اعتراض عامیانہ کر دیا۔

(۱۴) ص ۲۸۱ پر ایک شعر میر صاحب کا دوسرا مرزا صاحب کا حسب ذیل لکھا ہے:-

میر انیس رح	مرزا دبیر رح
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی	مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی	ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

اور لکھا ہے۔ کہ معنوی حیثیت سے بھی میر صاحب کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ میر صاحب کے

٭ اِس موقع پر واقعات انیس مؤلفہ میر احسن صاحب کے ص ۱۲ و ۱۳ کی تھوڑی سی عبارت نقل کر دینا احسن معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے۔ "میر انیس کی شاعری نے لکھنؤ پہنچ کر شہرت حاصل کی۔ اس میں تو کسی کو کلام نہ ہوگا۔ مگر اُن کی تربیت کیلئے لکھنؤ جولانگاہ نہ تھا۔ یہ معمہ اب ہم سے سُنئے۔ میر انیس کے بزرگوں کا سلسلہ ملازمت خاندان بہو بیگم صاحبہ سے برسوں رہا ہے۔ اور لکھنؤ میں بھی خاندان سالار جنگ کی زبان اردو کا معیار مانی جاتی تھی۔ فیض آباد میں محاورہ زبان اصطلاحات ضرب المثل وغیرہ کا ایک دفتر تھا جس کے میر منشی میر انیس کے جد امجد اور اُن کے بعد والد ماجد رہے ہیں۔ یعنی جب کوئی محاورہ اردو کا محلات سے نیا تراش کر نکالا جاتا تھا۔ تو اُس نصاب میں قلمبند ہوتا تھا۔ کہ جس کی سر دفتری کی خدمت خاندان میر انیس سے متعلق تھی۔ اس وجہ سے اُن کی تربیت و تہذیب کا معیار فیض آباد ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ اہل لکھنؤ کو اُن کی زبان سے فیض پہنچا ہے۔ ایک اور استدلال بھی قابل تحریر ہے یعنی میر انیس مرحوم کو مجمع عام میں ہر شخص نے یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا۔ کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ یوں نہیں تحریر فرماتے۔ یہ فخر اُن کو اُس دفتر کی بدولت حاصل ہوا تھا۔ اہل دہلی میر انیس کے اس قول سے اُن کی زبان و محاورہ کا انتساب دہلی سے کرتے ہیں۔ مگر یہ فقط دل خوش کن باتیں ہیں۔ ناواقفان راز اسی کو خوب جانتے ہیں۔" یہ عبارت میں نے واقعات انیس کی اس لئے لکھ دی ہے۔ کہ میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ دفتر فیض آباد میں تھا یا نہیں۔ مجھے تحقیق نہیں ہے۔ بہر حال اہل لکھنؤ کی زبان سے بعض محاورے اُن کے خلاف ضرور نکلے ہیں۔ مؤلف حقیر۔

ہیں۔ یہ تو مرزا صاحب کی کمال بلاغت ہے۔ یہ مثل مشہور ہے۔ کہ قضیۂ زمین برسر زمین
جس ملک عرب کی شاہزادیوں کا حال وہ لکھ رہے ہیں۔ وہیں کی شاہزادیوں اور شرفازادیوں
کے رواج و عادات کو پیش نظر رکھ کر تخییل فرما رہے ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ اکثر بلاد عرب
مصر و شام وغیرہ کی سیر فرما چکے ہیں۔ مگر خدا معلوم وہ سب آپ کی معلومات مرزا مرحوم پر
اعتراض کرتے وقت کہاں سفر کر جاتی ہے۔ یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ یہ مرثیہ مرزا صاحب کا
بالکل ابتدائی مشق زمانۂ شیخ مصحفی کا ہے۔ جس پر بنڑی کی لفظ دلالت کر رہی ہے۔
یہ لفظ بعد کے مرثیوں میں مرزا صاحب نے ترک کر دی ہے۔ ابتدائی مرثیوں کے الفاظ
جُوں کے تُوں رہنے دئے۔ کہ زمانہ تصنیف کا پتہ ایسے ہی لفظ سے ملتا ہے۔ اور
یہی جواب اُس اعتراض کا بھی ہے۔ کہ جو موازنہ کے صفحہ ۲۴۶ پر مولوی صاحب
نے کیا ہے۔ کہ جب فاطمہ کبریٰ نے اپنے بھائی امام زین العابدینؑ سے شہدا کے
دفن کے وقت کہا ہے۔ کہ ع بھائی صاحب مرے دُولھا کو بھی اب دفن کرو۔
یہ قول بھی رواج نسوان عرب کے مطابق ہے +

اعتراض ۱۳۳ سوقیانہ جواب

(۱۳۳) صفحہ ۲۶۸ پر یہ اعتراض اس مصرع پر ہے ع اک بات پکڑ لی ہے کہ یہ بیمار
ہے بیمار۔ "اک بات پکڑ لی" عامیانہ و سوقیانہ طرز کی گفتگو ہے۔ میں کہتا ہوں
(اور زور دے کر اس لئے کہتا ہوں۔ کہ میری زبان ہے)۔ کہ خاص محلات شاہی اور
شرفازادیوں کی یہ زبان ہے۔ ماشاءاللہ اولاد نواب ممتاز الدولہ مرحوم و اولاد
شاہزادہ والا قدر مرحوم اور ارکان خاندان شاہان اودھ اور اور شرفا لکھنؤ میں موجود
ہیں سب سے پوچھ لیجئے۔ مرزا مرحوم کے مرثیوں میں محلات شاہی و شرفائے لکھنؤ
کی زبان سب بالاتفاق کہینگے۔ اور مرزا مرحوم کی زبان کی سند محلات شاہی
میں لی جاتی تھی۔ بلکہ جناب میر انیس مرحوم تو کبھی کبھی کوئی محاورہ فیض آباد
کا بھی نظم فرماتے تھے۔ اور کبھی کبھی خود برسر منبر کہہ بھی دیتے تھے۔ کہ صاحبو اہل لکھنؤ

یہاں مبالغہ جو شعر کی جان ہے زیادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی مچھلی سیخ موج تک آنے کے ساتھ فوراً کباب ہو جاتی تھی۔ مرزا صاحب کے یہاں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ سیخ پر مرغابیوں کا کباب لگایا جاتا تھا۔ اس سے فوراً کباب ہو جانے کا خیال نہیں پیدا ہوتا +

جواب

مَیں کہتا ہُوں۔ ماشاءاللہ چشم بد دُور۔ مولوی صاحب جو بات فرماتے ہیں۔ وہ اُلٹی ہوتی ہے۔ معنوی و لفظی دونوں حیثیتوں سے مرزا مرحوم کا شعر بڑھا ہُوا ہے۔ **اوّل** تو ایک شعر میں اُن کے یہاں کئی باتیں ہیں۔ (۱) ہر حباب کو تنور سے تشبیہ دی۔ جو گولائی و گرمی کے سبب سے مناسب ہے۔ (۲) موج کو سیخ سے استعارہ کیا ہے۔ میر صاحب کے یہاں صرف ایک بات آخر الذکر ہے۔ **دوم** مرغابیاں پانی کے اُوپر رہتی ہیں۔ اور موج بھی سطح آب کے اُوپر آتی ہے۔ پس فوراً کباب ہونے کا خیال اس میں ظاہر ہے۔ اور اس راہ سے مبالغہ اس میں زیادہ ہے۔ جو بقول معترض صاحب شعر کی جان ہے۔ میر صاحب کے یہاں یہ بات کہاں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ جب مچھلی اُبھر کر سیخ موج تک آتی تھی۔ جب کہیں کباب ہوتی تھی۔ مولوی صاحب کے فہم عالی کا پھیر ہے۔ خیال کی سیخ ٹیڑھی تھی۔ اس لئے کباب اعتراض کچّا رہ گیا +

اعتراض ۱۵

(۱۵) ص ۲۱۲ و ۲۱۵ پر فرماتے ہیں۔ کہ میر انیس بھی مذاق عام کی پیروی سے اکثر بہکے ہیں۔ اور بے راہ نکل جاتے ہیں + **مَیں کہتا ہُوں**۔ کہ مبالغہ و حسن تعلیل وغیرہ جو چیزیں ایشیائی شاعری کی جان ہیں۔ اور مرزا مرحوم کے یہاں جن کی بہتات ہے۔ اور میر صاحب کے یہاں بھی کہیں کہیں ہیں۔ اُنہیں چیزوں کو مولوی صاحب بُرا سمجھتے ہیں۔ اور میر و مرزا کے ساتھ تمام ملک کو بد مذاق کہتے ہیں۔ خدا اُن کو راہ راست پر لائے۔ یہ بد مذاقی نہیں ہے۔ خوش مذاقی ہے۔ ؎

کہیں خضر بیابان بلاغت بھی بہکتے ہیں
وہ خود بہکا ہُوا ہے جو اُنہیں بہکا ہُوا سمجھے

اعتراض ۱۶

(۱۶) صفحہ ۲۵۴ پر مرزا صاحب کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ تشبیہات کہیں

پھبتیاں بن جاتی ہیں + مَیں کہتا ہوں - یہ ادّعا بھی بالکل غلط ہے - مرزا صاحب ایک ذی علم ماہر فن شاعر ہیں - اُن کی تشبیہات اعلےٰ درجہ کی ہوتی ہیں - کبھی پھبتیاں نہیں بنتیں - تشبیہیں اُن لوگوں کے کلام میں پھبتیاں بنتی ہیں - جو کم علم شاعر ہیں - معانی و بیان سے ناواقف ہیں +

مرزا صاحب اور تشبیہیں پھبتیاں

(۱۷) صفحہ ۲۶۹ پر یہ بند مرزا صاحب کا لکھ کر ؎

مرزا دبیر کا بند رنگ تاثیر

پھر ہاتھوں پہ اصغر کو رکھا کر کے یہ زاری | لٹکا دئے ہاتھ اُس نے ہمک کر گئی باری
ماں نے کہا لو گود میں یہ آتے ہیں واری | اصغر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری
پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلا لُوں | آ۔ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

لکھتے ہیں کہ صغرےٰ کا رخصت کے وقت علی اصغر کو حسرت اور پیار سے دیکھنا نہایت دردانگیز سماں ہے - لیکن مرزا صاحب ایسے درد انگیز واقعہ کو بھی تاثیر کا رنگ نہ دے سکے + مَیں کہتا ہوں - کہ مرزا صاحب کا بند مذکورہ تاثیر درد سے بھرا ہوا ہے - مگر افسوس مولوی صاحب کے دل پر اثر نہیں ہوتا - مَیں اپنا دل کیونکر مولوی صاحب کے دل میں رکھ دوں - کس غضب کا قدرتی نظارہ اس مصرع میں دکھایا ہے - کہ ع لٹکا دئے ہاتھ اُس نے ہمک کر گئی باری - بچہ جس سے ہلا ہوتا ہے - اُس کی طرف یوہیں ہمکتا ہے پھر اُس کے ساتھ ہی ماں کا یہ کہنا - کہ لو یہ خود گود میں آتے ہیں - پھر صغرےٰ کا ہاتھ اُٹھا کر یہ حسرت آمیز الفاظ میں کہنا - کہ دیکھئے پھر مَیں جیتی ملوں یا نہ ملوں - اور اس کے ساتھ ہی "بلا لوں" کا لفظ جو عورتوں کا خاص محاورہ ہے - کس قدر حسرت سے بھرا ہوا ہے - اور اُس کے بعد یہ کہنا - کہ "آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں" کس قدر سلیس نظم ہے - جس کو نثر کیجے - تو ایک لفظ بھی نہیں بڑھ سکتا - اُس کی نسبت مولوی صاحب فرماتے ہیں - کہ تاثیر کا رنگ نہیں - اور کیسا رنگ ہوتا ہے - اس کے مقابلہ پر میر صاحب کا یہ بند لکھ کر ؎

ہیں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری
اصغر مرا رونا ہے سدا اُن کے تمہاری

وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری
آ۔ اے مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تھے

لکھتے ہیں۔ کہ میر صاحب نے پورا دردِ دل کس مؤثر طریقہ سے کہا۔ مرزا صاحب صرف یہ کہکر رہ گئے ع آ۔ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگالوں۔ اور مرزا صاحب کا یہ مصرع اصغر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری۔ میر صاحب کے اس مصرع کے جواب میں ہے۔ ع وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری۔ لیکن دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔ میر صاحب کے یہاں ہاتھ کے ساتھ کانپنے کی قید نے کس قدر بلاغت پیدا کردی ہے۔ اور ننھے سے مسافر اور چھوٹے مسافر والے دونوں مصرعوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے +

میں کہتا ہوں۔ یہ تو خدا کو علم ہے۔ کہ میر صاحب نے مرزا صاحب کا جواب لکھا ہے یا مرزا صاحب نے۔ یا دونوں نے بطور خود فکر فرمائی ہے۔ اور ہر ایک لاجواب ہے۔ مولوی صاحب کا جو دعوےٰ ہے۔ وہ بلادلیل غیر مسلّم ہے مصرع دونوں کاملوں کے اچھے ہیں۔ بیشک میر صاحب کے مصرع میں ہاتھوں کے ساتھ کانپنے کی قید اچھی اور مؤثر ہے۔ مگر اُس کے ساتھ مرزا صاحب کا یہ کہنا کہ "لٹکائے ہاتھ اُس نے ہمک کر کئی باری" غضب کا مؤثر درد انگیز قدرتی کنایہ ہے۔ اور دونوں مصرعوں میں زمین و آسمان کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ مولوی صاحب کے فہم عالی کا فرق ہے +

(۱۸) صفحہ ۳۴۴ و ۳۴۵ پر مرزا صاحب کی یہ ٹیپ لکھ کر

قطرہ ہے مگر بحث میں میں صرف نہیں ہوں
دریا ہوں سخن کا میں تنگ ظرف نہیں ہوں

مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ دوسرے مصرع میں میں کا لفظ محض فضول ہے پہلے مصرع میں میں کا لفظ آچکا ہے + میں کہتا ہوں۔ ہرگز محض فضول نہیں ہے۔ روزمرہ کی خوبی یہی ہے کہ انسان اگر دس دفعہ بولتا ہے۔ اور ضرورت ہوتی ہے۔ تو ہر جگہ

میں کہتا جاتا ہے۔ پس یہ تو نظم کی خوبی ہے۔ کہ (بقول حقیر ثابت) ؎

تحریر میں تقریر کا عالم نظر آئے تقریر میں تصویر کا عالم نظر آئے

اور اِس بات کا بیّن ثبوت کہ نثر میں ایسے قریب قریب "میں" بولتے ہیں۔ خود مولوی صاحب کی نثر مندرجہ موازنہ صفحہ ۲ ہے۔ کہ مولوی صاحب دو متصل فقروں میں دو جگہ "میں" کا لفظ لائے ہیں۔ وہ دونوں فقرے یہ ہیں۔ (۱) میں اُن سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکا۔ (۲) شعر العجم میں میں اِس مضمون کو انشاء اللہ نہایت تفصیل سے لکھونگا۔ دیکھئے پہلے فقرۂ متصل میں میں آچکا۔ اب پھر "میں" کیوں لائے۔ اِس کا جواب معقول یہی ہے۔ کہ روزمرّہ میں یُونہی بار بار "میں" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مولوی صاحب! آنچہ برخود بپسندی بر دیگرے بپسند۔ آپ مرزا مرحوم پر اعتراض کرتے وقت ایسے جوش میں بھر جاتے ہیں۔ کہ وہ جوش تمام تجربات کو دماغ سے نکال دیتا ہے۔ اور یہ بھی خیال نہیں رہتا۔ کہ ہم خود کیا لکھ چکے ہیں +

اعتراض ۱۹ بے تعلق

(۱۹) اسی طرح صفحہ ۲۴۶ پر اس مرثیہ کے "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" کے چار بند لکھ کر اور لفظ انا العبد کو خلاف سلاست اور مصرع "جان غیر بدن غیر مکان غیر مکین غیر" کو بیگانہ بتا کر فرماتے ہیں۔ کہ "یہ بند چہارم ؎

بیہوش ہے بجلی پہ سمندان کا ہے ہشیار خوابیدہ ہیں سب طالع عباس ہے بیدار

اُوپر کے بند سے دفعۃً اس قدر بے تعلق ہو گیا ہے۔ کہ مطلب سمجھنا مشکل ہے۔ "ان" کا مشار الیہ حضرت عباسؑ ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت عباس کا ذکر صرف پہلے بندوں میں آیا تھا جس سے تین بندوں کا فاصلہ ہے۔ اِس لئے ذہن اس طرف جلدی منتقل نہیں ہوتا" میں کہتا ہوں۔ کہ نہ انا العبد سلاست کے خلاف ہے۔ نہ جان غیر الخ والا مصرع بیگانہ ہے۔ نہ "ان" کے مشار الیہ حضرت عباسؑ کے سمجھنے میں کوئی ذہن کو دقت و تکلیف ہوتی ہے۔ بلکہ معترض صاحب کی اصول مرثیہ سے ناواقفی ہے۔

جب اُوپر کے بندوں میں صاف معلوم ہو چکا کہ حضرت عباسؑ کے حال کا مرثیہ ہے۔ تو اب جہاں کہیں اُن یا اِن کے ضمائر آئینگے (بشرطیکہ قرینہ سے اور کوئی مشارالیہ نہ ہو)۔ وہی حضرت عباسؑ مراد لئے جائینگے۔ اس کے علاوہ دُوسرے مصرع میں حضرت عباسؑ کا نام موجود ہے۔ اضمار قبل الذکر اردو فارسی میں سلیس و فصیح ہے برخلاف عربی کے۔ پس یہاں بھی ان سے مراد وہی حضرت عباسؑ ہیں۔ جن کے حال میں تمام مرثیہ ہے۔ اور میرے پاس کے قلمی مرثیہ میں جو والد مرحوم کے ہاتھ کا (قلمی) تبرک ہے۔ اور غالباً چالیس برس پہلے کا لکھا ہُوا ہے۔ یہ دونوں مصرع یُوں (مقدّم و مؤخّر) ہیں:-

خوابیدہ ہیں سب طالع عباسؑ ہے بیدار بیہوش ہے بجلی پہ سمندان کا ہے ہشیار

اور غالباً مرزا مرحوم کے خاص لبستہ کے مرثیہ کی وہ نقل ہے۔ اِس لئے وہی زیادہ صحیح ہے۔ اس صورت میں اضمار قبل الذکر بھی نہیں آتی۔ اور اعتراض ہی نہیں ہو سکتا۔ باقی جو "خوابیدہ" و "بے ہوش" الفاظ پر مولوی صاحب نے بے ربطی کا ادّعا کیا ہے۔ اُس کا مَیں بجز اس کے کیا جواب دُوں۔ کہ فہم عالی کا قصور ہے۔ صنعت طباق و تضاد کو جو جو شخص بے ربط کہے۔ اُس کا کیا علاج؟

حقیقت موازنہ

(۲۰) یہ بات بھی قابل تحریر ہے۔ کہ مولوی صاحب نے اپنی کتاب کا نام تو موازنہ انیس و دبیر رکھا ہے۔ اور ۲۸۵ صفحے کی وہ کتاب ہے۔ پندرہ سولہ صفحے مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھنے میں صرف فرمائے ہیں۔ باقی قریباً دوسو صفحہ پر کلام میر انیس مرحوم مع تنقید و مدح درج ہے۔ مرزا دبیر مغفور کے کلام کے واسطے فقط پندرہ سولہ ورق صرف کئے ہیں۔ اور اکثر وہ کلام لکھا ہے۔ جو اُن کے نزدیک قابل قدح ہے کیوں انصاف پسند ناظرین!! کیا موازنہ کی یہی شان ہے۔ اور اِس کتاب کو موازنہ کہ سکتے ہیں۔ مرزا دبیرؒ (جن کی مطبوعہ بیس۲۰ جلدیں اور اسی قدر غیر مطبوعہ بتائی جاتی ہیں) کا کلام تو پندرہ سولہ ورق میں

لکھا جائے۔ اور میر انیس مرحوم کے واسطے دو سو صفحے وقف کئے جائیں (جنکی تصنیف مطبوعہ پانچ چھ جلدوں سے زیادہ نہیں ہے)۔ کیا یہی انصاف ہے۔ مَیں کہتا ہُوں۔ **بفرض محال** اگر کل کلام دبیر مندرجۂ موازنہ بھی سُست ہو۔ جب بھی تو کمالات دبیر میں فرق نہیں آسکتا۔ کیونکہ وہ کلام تو کل کلام کا ۱/۱۰۰ حصّہ بھی نہیں ہے۔ اگر کسی شاعر کے ۹۹ شعر اچھے ہیں اور ایک سُست ہے۔ تو کیا وہ شاعر قابل قدح ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ مولوی صاحب کا انصاف قابل غور و انصاف ہے +

کتابت کی غلطی اور میر انیس رح

(۲۱) ناظرین! تمام اہل علم عموماً اور وہ لوگ جن کو اپنی تصانیف چھپوانے کا کام پڑتا ہے خصوصاً اس بات کو خوب جانتے ہیں۔ کہ کاتب عموماً کم علم ہوتے تھے اور ہوتے ہیں۔ باوصفیکہ بڑے بڑے مطبعوں میں مصحح بھی نوکر ہوتے ہیں۔ اور عموماً کاپی و پروف کی صحت و درستی کی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی چھاپہ میں ہزاروں غلطیاں رہ جاتی ہیں کبھی کبھی کاپی نویس و مصلح سنگ اصلاح بھی دے دیتے ہیں۔ مگر ہمارے **مولوی شبلی** صاحب (باوصفیکہ تمام عمر گویا کتابیں چھپواتے رہے) ہم کو اس کی بھی عموماً اجازت نہیں دیتے۔ کہ جو مصرع غلط چھپا ہے۔ وہ ہم صحیح بنا دیں۔ اور معترض مان لے۔ صفحہ ۲۲۶ و ۲۲۷ و ۲۳۰ پر فرماتے ہیں۔ کہ گو اکثر مرثیے غلط چھپے ہیں۔ مگر جو میر صاحب کی طرف سے میرزا محمد رضا صاحب معجز نے نساخ کے اعتراضوں کا جواب دے دیکر لکھا ہے۔ کہ صحیح مصرع یوں ہے۔ اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ ہر جگہ غلط نویسی کا عذر نہیں کام آسکتا۔ اگر اس کو وسعت دی جائے۔ تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو۔ نہایت آسانی سے دعوے کیا جا سکتا ہے۔ کہ یُوں نہیں یُوں تھا +

ناظرین باتمکین! مجھے اوّل تو اس موقع کو دیکھ کر یہ حیرت ہُوئی۔ کہ مولوی شبلی صاحب یہاں مرزا صاحب کو کیوں فراموش فرما گئے۔ جیسے **سرقات** کے ذکر میں خطوط وحدانی میں مرزا دبیر کو لکھا تھا۔ یہاں کیوں نہ لکھا۔* غور کرنے سے اِس کی

* کیونکہ محاسن شعر میں تو وہ عموماً مرزا صاحب کو مستثنےٰ کرتے آئے ہیں۔ اور معائب سرقہ کے بیان میں گو ثابت نہ کر سکے مگر نام ضرور لکھ دیا۔ یہ مولوی صاحب کی مزید محبّت و اتحاد کی دلیل ہے۔ کہ خطوط وحدانی میں اُس موقع پر نام لکھا + ۱۲ ہیچمدان ثابت رضوی۔

وجہ یہ معلوم ہوئی۔ کہ منشی نولکشور صاحب آنجہانی کے مطبع میں جو دو جلدوں میں چند
مرثئے اوّل مرزا مرحوم کے چھپے تھے۔ اور وہی مرثئے بعد کو دفترِ ماتم کی جلدوں میں
جا بجا چھپے۔ تو اُن اوّل کے مطبوعہ مرثیوں میں بند کے بند اور مصرع کے مصرع کچھ کے
کچھ اور غلط سلط نظر آئے۔ اور ان مرثیوں (دفترِ ماتم) میں اکثر صحیح ہیں۔ یہاں تک
کہ کاتب نے دو دو بندوں کو (جلد ہائے نولکشوری میں) مختصر کر کے ایک بند میں لکھ دیا
ہے۔ مثلاً بند اوّل میں قافئے صابر شاکر وغیرہ (تھے) اور بند ثانی میں واور لشکر وغیرہ
تھے۔ تو آٹھ مصرع کے چار کر دئے۔ ایک ٹیپ اُڑا دی۔ دو بند کا جب ایک بند ہُوا۔
تو وہ بند بھی بے ربط نظر آیا۔ اور قافئے بھی صحیح نہ معلوم ہُوئے۔ تو اب یقین ہو گیا۔
کہ وہ پہلے کی کتابت محض غلط تھی۔ اور ہرگز مرزا صاحب ایسے ذی علم واقف رموز
شاعری شاکر کا قافیہ لشکر نہیں لا سکتے تھے۔ اور مرزا صاحب کی نسبت اب ایسے
اعتراضات کی گنجایش مولوی صاحب نے نہ دیکھی۔ کیونکہ نسّاخ کے اعتراضات
اُنھیں مطبوعہ سابق مرثیوں کی بنا پر تھے۔ میرزا محمد رضا صاحب معجز کے جوابات قلمی مرثیوں
کے مطابق تھے جو (مرزا صاحب کے) بعد کو دفترِ ماتم میں چھپ بھی گئے۔ تو دیکھنے والے کو
دونوں مرثئے مطبوعہ سابق و حال دیکھ کر اطمینان ہو جاتا ہے۔ کہ واقعی معجز مرحوم نے
جو جوابات دئے ہیں۔ اور جس طرح صحیح مصرع بتائے ہیں۔ اُسی طرح دفترِ ماتم میں طبع ہُوئے
اور صحیح ہیں۔ افسوس کہ میر صاحب کے مرثئے پھر کسی نے اِس قدر صحت کے ساتھ
بھی نہ چھپوائے۔ جو مولوی صاحب کو یہ کہنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اِس سے میری یہ مراد
نہیں۔ کہ دفترِ ماتم کے تمام مرثئے بالکل صحیح ہیں۔ اب بھی جا بجا غلطیاں ہیں۔ مگر
بہ نسبت مطبوعہ مطبع اودھ اخبار کے بہت کم۔ اور بعض غلطی اُنھے تامل و غور سے
صحیح المذاق ناظر درست کر سکتا ہے۔ خیر اب مَیں اس کا جواب دیتا ہُوں۔ کہ ایسی
تاویلات پر (کہ کاتب کی غلطی ہے۔ مصنّف نے یُوں نہیں۔ یُوں کہا تھا) ہر جگہ مرثیوں

جواب باصواب

(مطبوعہ مصنفہ انیس) میں اعتبار کرنا لازم ہے۔ اور اس کا فیصلہ میر صاحب کی علمی قابلیت پر ایک نظر کرنے سے آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کہ جو لفظ چھپ گیا ہے۔ وہ کاتب یا کاپی نویس وغیرہ کی اصلاح ہے۔ اور جو اُن کے ورثا یا تلامذہ کے پاس قلمی مرثیہ لکھا ہوا ہے۔ وہی صحیح ہے۔ مثلاً میر صاحب کے ایک قلمی مرثیہ میں ہے ع ناگاہ بجا فوج عدو میں دُہلِ جنگ۔ دُہل کو چھاپہ کے مرثیہ میں طبل لکھ دیا ہے۔ اور طَبَل بالفتحتین لغت کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ میر صاحب نے دہل جنگ اپنے مرثیوں میں کہیں اور بھی باندھا ہے یا نہیں۔ جب مرثئے دیکھے۔ تو معلوم ہؤا۔ کہ میر صاحب نے دہل جنگ جا بجا باندھا ہے۔ پس جب کہ اُن کی علمی قابلیت بھی مسلّم ہے۔ اور وہی لفظ دُوسری جگہ اُن کے یہاں نظم بھی ہے۔ اور ایک قلمی مرثئے میں بھی تحریر ہے۔ تو ہم کو ضرور ماننا چاہئے کہ میر صاحب نے صحیح نظم فرمایا۔ مولوی شبلی صاحب یا نسّاخ یا اُن کے ہم خیال ہرگز ہم کو مجبور نہیں کر سکتے۔ کہ میر صاحب کو جاہل کہیں۔ اور اُن کی غلطی کو ہم قبول کریں۔ اور اعتقاد رکھیں۔ کہ جو کچھ غلط سلط چھپ گیا۔ وہی نوشتہ لوح محفوظ کی طرح صحیح ہے۔ اور ہر جگہ غلطی کتابت وطبع کے عُذر کو نہ مانیں +

اب مَیں اسی موازنہ میں جو مصرع مجھے غلط معلوم ہُوئے۔ اُن کو ناظرین باتمکین کو دکھانا چاہتا ہُوں۔ اور اِس سے یہ نتیجہ نکالتا ہُوں۔ کہ جب مولوی شبلی صاحب ایسے ذی علم (شمس العلما) ہو کر اس کثرت سے غلطیاں کر رہے ہیں۔ تو اُن کم مایہ کاتبوں کی غلطیوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جن میں سے اکثر دستور الصبیان تک پڑھے ہُوئے تھے یا ہیں۔ یہ بھی کہدوں۔ کہ مولوی صاحب کو اپنی موازنہ مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۹۰۷ء کی صحّت بھروسہ ہے۔ ورنہ وہ باصحّت نامہ (غلط نامہ) اِس کے ساتھ لگاتے۔ یا معذرت فرماتے۔ کہ اِس میں جا بجا چھاپہ

کی غلطیاں ہیں - اور یہ مطبع صوفی صاحب کا خوش خطی و صحت میں مشہور بھی ہے - بااین ہمہ یہ غلطیوں کی کثرت ہے - تو دوسرے معمولی مطبعوں میں کس قدر زیادہ غلطیاں ہوتی ہونگی +

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
۱۱۲	تھی جتنے زندگی کی حلاوت وہ چھٹ گئے	تھی جن سے زندگی کی حلاوت وہ چھٹ گئے مصرع مطبوعہ بے معنی ہے +
۲۴۰	کہتے ہیں جسے عاشق شید الملک وناس	کہتے ہیں جسے عاشق وشید ملک وناس عاشق وشیدا کے درمیان میں واؤ عاطفہ اُڑ گئے اس کی شرح اُوپر میں لکھ چکا ہوں - اور یہ بھی بتا چکا ہوں - کہ دو عاشقوں اور دو معشوقوں کا بیان ہے - اس لئے دوہرے لفظ لائے ہیں +
۲۴۰	گفّار بڑے طیش سے ہونٹوں کو دبا کے	گفّار بڑے طیش سے ہونٹوں کو چبا کے دُوسرا مصرع یہ ہے - ع دانتوں کے تلے بال محاسن کے دبا کے چبا و دبا مقید قافئے ہیں - ورنہ پھر قافیہ کیا ہوگا - اور ہونٹوں کو غصہ میں چبانا محاورہ ہے - ملنا نہیں ہے +
۲۴۰	اس سر پر دھرے ہات یہ قسمیہ اجل ہے	اس سر پہ دھرے ہات یہ قسمیہ اجل ہے پہ بائے موحدہ سے غلط ہے - یہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے چاہئے +
۲۴	منکر نکرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے	منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		مُنکر کی جگہ مُن کر لکھ دیا ہے۔ یہاں مُنکر سے مراد منکر کمالات دبیر سے ہے۔ جیسے مولوی شبلی صاحب +
۲۴۲	ملبوس قلم کا رنہ دوں ہے نہ پُرانا۔	ملبوس قلم کا رنہ دوں۔ ہے یہ پُرانا "یہ پرانا" کو "نہ پرانا" لکھ کر مصرع تو بے معنی کر دیا +
۲۴۴	قطرے سے مگر بخت ہیں۔ ہیں صرف نہیں ہوں	قطرے سے مگر بحث ہیں۔ ہیں صرف نہیں ہُوں یہ مولوی صاحب کی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔ کسی کم علم کاتب کی غلطی ہے +
۲۴۵	بے مہری افلاک سے گو خاک بسر ہُوں۔	بے مہریِ افلاک سے کیوں خاک بسر ہُوں "کیوں" کو "گو" لکھ دیا۔ مصرع بے معنی ہوگیا۔ اور پھر اعتراض جڑ دیا +
۲۴۸	اب رایت زباں سے علم کروں۔	اب رایت زباں سر منبر علم کروں۔ "سر منبر" کی جگہ فقط "سے" لکھ دیا۔ نسّاخ کے بعد مولوی شبلی صاحب معترض ہُوئے۔ اکثر اُنہیں اعتراضوں کو لباس نو میں جلوہ دیا۔ اب کل کو کوئی تیسرے صاحب پیدا ہو گئے کہینگے مرزا صاحب نے مصرع ناموزون کہا تھا +
۲۵۱	جو ہر نے کنوئیں قعر جہنم کے جُھکائے	جو ہر نے کنوئیں قعر جہنم کے جھنکائے کنوئیں جھنکانا بفتح جیم ایک روزمرہ خاص

مصرع صحیح مع کیفیت	مصرع غلط	نمبر صفحہ
ہے۔ جھکانا بالضم لکھا ہے۔ پیش بھی لگا دیا ہے۔ جو بے معنی ہے +		
مانند مسیم مرگ میان کمر گئی "مسیم مرگ" کی جگہ "سیم مرگ" لکھدیا۔ سیم سے اور مرگ سے کیا مناسبت ہے۔ مرگ میں میم سرے پر ہے۔ کمر میں بیچ میں ہے۔ میان کمر جانا صحیح ہوا +	مانند سیم مرگ میانِ کمر گئی	۲۵۱
بینی جبین ولب سے حسین وجمیل ہے حسین وجمیل مشہور لفظ ہیں۔ اُن کو حسین وخلیل لکھ کر حسین پر علیہ السلام کا ؑ بھی لگا دیا۔ مصرع بلکہ تمام شعر مہمل ہو گیا۔ کیا عمدہ شعر ہے۔ اور بینی کا حسین وجمیل ہونا کس خوبصورتی سے ثابت کیا ہے۔ کہ جبین بسر امامؑ بمنزلہ عرش اور لب گویا سلسبیل ہے +	بینی جبین ولب سے حسینؑ وخلیل ہے سر پر ہے عرش زیر قدم سلسبیل ہے	۲۵۲
ہاروت تھا کہ اُڑ کے کنوئیں سے نکل گیا اوپر اس کے یہ مصرع ہے۔ ؎ پر ذوالجناح صاف دھوئیں سے نکل گیا ہاروت وماروت دو مشہور فرشتے ہیں۔ ہاروت کا کنوئیں میں سے نکلنا ایک مشہور بات ہے۔ افسوس مولوی صاحب یا اُن کے طالعین (تابعین) اس کو بھی نہ سمجھے	باروت تھا کہ اُڑ کے کنوئیں سے نکل گیا	۲۵۲

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		اور پھر مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب بلند پروازی میں نظر نہیں آتے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپنے اعتراضات بیجا کی باروت کا دھواں پھیلا دیا ہے۔ یہ ہٹے تو وہ نظر آئیں +
۲۵۳	کی خود نے خود نمائی سے زیب سر جفا یا دار قد پہ کفر کا بخت سپر چڑھا	کی خودِ خود نمائی سے زیب سر جفا یا دار قد پہ کفر کا بختِ سیہ چڑھا خودِ خود نمائی کیسا لطیف استعارہ ہے "نے" کا لفظ اسمیں زیادہ کر کے غلط وبیمعنی بنا دیا۔ اسی طرح بخت سیہ کو بخت سپر لکھا۔ اِس فہم کا کیا ٹھکانہ ہے +
۲۵۵	مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی	مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی۔ سب سین غیر منقوط سے ہے جسکو شین منقوط سے لکھ دیا ہے بیمعنی ہو گیا۔ اور شب قافیہ آ بھی چکا ہے۔ یہ بھی نہ سوچا۔ دن کو گویا رات کر دیا +
۲۵۶	ہر سجدہ گاہ بن گیا مہر منیر صبح۔	پھر سجدہ گاہ بن گیا مہر منیر صبح۔ ہر سجدہ گاہ کیا معنی۔ اگر ہر سجدہ گاہ کہتے تو بن گئی کہتے کہ سجدہ گاہ مؤنث ہے۔ مگر خدا جانے مولوی صاحب اس کو بھی جانتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ سجدہ گاہ کا رواج صرف فرقہ شیعہ میں ہے۔ شیعوں کی اکثر باتوں سے وہ نابلد ہیں +

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
٢٥٦	لیلائے شب کی رات کو دولت جولٹ گئی	لیلائے شب کے حسن کی دولت جولٹ گئی "حسن کی دولت" کو "رات کو دولت" لکھ کر دن کو گویا شب تار بنا دیا +
٢٥٧	فرماں نور بدر کو پہنچا بدر بدر	فرماں نجوم و بدر کو پہنچا بدر بدر "نجوم و بدر" کی جگہ "نور بدر" لکھ دیا۔ نہ جانے نجوم نے کیا قصور کیا تھا۔ جو اُن کو نکال دیا +
٢٧٥	پیاسا ہوں اس پہ بھی پانی نہ پیونگا مولا جام کوثر نہ بن آقا کے پیوں گا مولا	پیاسا ہوں اِس پہ بھی پانی نہ پیونگا مولا جام کوثر نہ بن آقا کے مَیں لوں گا مولا "اُوپر پیونگا" "نیچے مَیں لونگا" باہم قافیہ ہیں۔ مولوی صاحب نے دونوں جگہ "پیونگا" لکھ دیا۔ قافیہ شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی گئے۔ پھر کہینگے کہ تبیر الکلام شعرا کو اس ایطا کے عیب سے معاف رکھا جائے۔ جیسا کہ میر صاحب کو کہہ چکے ہیں +
٢٨٠	گر میں بقول عمر و شمر ہوں گناہ گار	گر مَیں بقول شمر و عمر ہوں گناہ گار شمر و عمر کو "عمر و شمر" لکھ دیا۔ نہ سمجھے کہ شمر بین السکون ہے لیکن تبین بالفتح ثانی غلط ہے۔ پہلے دہلی کے ایک مشہور شاعر نے یہی غلطی کی تھی۔ اور کہا تھا ع محب حسینؑ کا اور دل رکھے شمر کا سا۔ اُس پر وہیں کے ایک مشہور شاعر نے کہا تھا ؎

نمبر صفحہ	مصرع غلط	مصرع صحیح مع کیفیت
		شمر کو باندھا شمرؔ اس فصیح سے تو خوش ہوا اے طرف دار غلط یاں میم ساکن چاہیئے ہیں کچھ کہوں۔ تو طرفداران مولوی صاحب بُرا مانینگے۔ اس لئے خاموش ہوں +
۲۸۵	روشن پدر کا زور ہے دنیائے دین پر	روشن پدر کا زور ہے دُنیا پہ دین پر اس لئے کہ دنیا و دین میں عطف ہے۔ اور حالت عطف و اضافت میں اعلان نون اُس زمانہ میں ناجائز تھا جب مرزا صاحب نے یہ مرثیہ کہا ہے +

واضح ہو۔ کہ موازنہ مطبوعہ میں (کلام انیسؔ و دبیرؔ میں) ایسی بہت سی غلطیاں ہیں۔ مَیں نے چند غلطیاں جو بادی النظر میں معلوم ہوئیں۔ وہ لکھ دیں۔ کہ ان سے مولوی صاحب کی سخن فہمی کا بھی اندازہ ناظرین سخن سنج و سخن آفرین فرما سکتے ہیں۔ کہ صحیح المذاق سخن سنج چھوٹی غلطی پر غور کر کے اُس کو اکثر دُور کر کے صحیح لکھا کرتا ہے +

اب خاتمہ کا بند یہ بھی سُن لیجئے۔ کہ مَیں نے جو مولوی صاحب کی خوش فہمیوں یا غلطیوں کو نہایت واضح طور پر دکھایا ہے۔ اس کے بھی محرک خود مولوی صاحب ممدوح ہیں۔ کہ وہ موازنہ کے صفحہ ۲۶۶ پر اعتراضات میر صاحب کی سرخی (ہیڈنگ) کی تحت میں لکھتے ہیں (جس موقع پر اُنھوں نے میر صاحب کے کمالات کا اعتراف کر کے اعتراض صحیح کی ضرورت بتائی ہے) کہ اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں۔ ان میں ہزاروں ایسے ہوتے

ہیں۔ جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے"۔

مَیں کہتا ہوں۔ مولوی شبلی صاحب کا شمار بھی اکابر قوم میں ہے۔ کہ وہ شمس العلماء ہیں۔ مَیں نے بھی یہی خیال کیا۔ کہ مولوی صاحب کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا اثر زہر کی طرح قوم و ملک میں پھیل جائیگا۔ اور لوگ اُن کی غلطیوں کی تقلید کرنے لگینگے۔ اِس لئے اُن کی غلطیوں کو آفتاب کی طرح واضح کرکے دکھا دیا۔ اور آفتاب کے دھبے گویا اُن کو سمجھا۔ اب مولوی صاحب موصوف اور اُن کے ہواخواہ چاہے مجھے داد دیں چاہے نہ دیں۔ مَیں اپنا کام کر چکا۔ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ ست — وگر خاموش بنشینم گناہ ست

جن ناظرین حق آئین کی آگاہی کے واسطے مَیں نے یہ محنت اِس عالم ناپرسی میں کی ہے۔ اُن سے امید ہے۔ کہ مجھے بخیر یاد فرمائینگے۔ اور اگر واقعی مجھ سے کہیں غلطی ہوئی ہے۔ تو مجھے مطلع فرما کر ممنون احسان فرمائینگے۔ (اگر واقعی) میری رائے غلطی پر ہوگی۔ یا واقعات میں کچھ فرق ہوگا۔ تو مَیں انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں بشرط حیات بہت خوشی سے شکریہ لکھ کر درست کر دُونگا۔ ورنہ جواب باصواب دُونگا۔

اچھا۔ ناظرین۔ خدا حافظ

اللہ بس۔ باقی ہوس

اب اَور باتیں سُنئے۔ جو حیات دبیرؒ سے متعلق ہیں۔

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ شاعر ماہر و ناثر کامل جناب منشی سید افضل علی صاحب ضوؔ بدالیونی مقیم لکھنؤ مصنف ردّ الموازنہ (شبلی صاحب) وارشد تلامذہ حضرت اوجؔ مدظلہ وسابق اڈیٹر ہر روزہ اخبار لکھنؤ:-

کیا بشر سے ہو وصف ذات دبیرؒ
سرّ حق ہے مکاشفات دبیرؒ
عرفی و انوری و خاقانی
جب کہ واقع ہوئی وفات دبیرؒ
ہیں جو بائیس جلدوں میں مطبوع
غیر مطبوعہ کلیات دبیرؒ
خلف الصدق اُنھیں خدا نے دیا
لکھے کیا خوب واقعات دبیرؒ

تھے صفات ملک صفات دبیرؒ
عابد و زاہد و کریم و جواد
ہیں یہ سب شاہد نکات دبیرؒ
اُن کے بعد اہل نظم کی خاطر
مرثیے اور نوحہ جات دبیرؒ
ہوئیں پوری بفضلہ جو تھیں
حضرت اوجؔ مثل ذات دبیرؒ
سال تالیف ضوؔ کہو ہجری

جتنے ہیں اہلِ حق وہ قائل ہیں
حبّذا خوبیٔ صفات دبیرؒ
ساتھ اُن کے ہوا سخن بھی تمام
بس ہے دُنیا میں کائنات دبیرؒ
ہیں درا۔ ان کے مرثیے اکثر
دین و دُنیا میں خواہشات دبیرؒ
میرے مشفق جناب ثابت نے
۱۳ ۰ ۳۰
زینت بارگہ حیات دبیرؒ

ایضاً

حیات انیسؒ اور اقوال شبلی
ہے رد کرتی ان سب کو تصنیف ثابت
ہے تاریخ ضوؔ بہر سال مسیحی
۱۹ ۶ ۱۲
کہی میں نے ـ ممتاز تالیف ثابت

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیرؒ نتیجہ افکار شاعر ماہر و خوشنویس جناب منشی سید واجد حسین صاحب صغیرؔ لکھنوی کاپی نویس وارشد تلامذہ جناب فصاحتؔ لکھنوی مدظلہ العالی:-

مجموعۂ مکرمی افضل حسین سے
مضموں کی طرح حجم بھی اس کا کثیر ہے
شبلی کے اعتراض کا ایسا دیا جواب
چرخ سخنوری کا وہ ماہ منیر ہے

ظاہر وقار و شان کلام دبیرؒ ہے
بے عیب ہے اُسی طرح اُن کا کلام مدح
دیکھے جو معترض تو کہے بے نظیر ہے
اقلیم شاعری میں ہے کیا اس سے روشنی

حالات ہیں دبیرؒ کے اس میں لکھے ہوئے
معصوم جیسے ذات جناب امیرؑ ہے
کیا ایسے مستند پہ پڑے خاک اعتراض
عالم فروز اک یہ چراغ اے صغیرؔ ہے

کیوں فکر سال طبع کی ہجری میں ہے
۱۳ ۰ ۳۱
لکھو یہ نور شمع حیات دبیرؒ ہے

• نتیجہ فکر شاعر کامل صاحب دیوان مطبوعہ (مسمی بہ ریحانۂ محبت) وغیر مطبوعہ جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب فداؔ اکبر آبادی میر منشی محکمۂ پولیٹیکل ایجنسی ریاست کوٹہ ملک راجپوتانہ - ارشد تلامذہ حضرت منشی غلام محمد خاں صاحب رہاؔ اکبر آبادی مرحوم :-

قطعہ تاریخ تالیف

۳۰ ه ۱۳
عجب عشرت افزائے صاحب دلاں
۱۲ ء ۱۹
فداؔ - فکر ثابت کی کیجے ثنا

۲۲ ف الی ۱۳
عجب شانِ دوراں حیاتِ دبیرؔ
۶۹ ب ۱۹
ہے تالیف کیا صیقلِ بے نظیر

ایضاً تاریخ طبع

۲۲ ف الی ۱۳
زہے اندراج وزبہ پر ضیا
۶۹ ۱۹ ب
زہے زیب قصرِ صغیر وکبیر

۱۲ ء ۱۹
زہے جوئے جود و خوشا دل پذیر
۱۹ آ ۱۳
چھپی خوب معقول و دلکش فداؔ

۲۰ ف ۱۳
زہے فرحت افزا و بزم سرور
۳۱ ا ه ۱۳
ہے اشعارِ موزوں حیاتِ دبیرؔ

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ عالی جناب مولوی عبد اللطیف صاحب یکتاؔ رئیس تھانہ بھون و ناظم نظامت کشن گنج ریاست کوٹہ راجپوتانہ :-

۱۲ ء ۱۹
ماشاء اللہ ثابت رنگیں نگار
۶۹ ب ۱۹
جس کا ہر لفظ ہے بنیش فزا
۱۲ ۱۹
فکر نے چاہا جو سالِ اختتام

۱۲ ء ۱۹
ہے گل بے خار باغ ادج کا
۲۰ ب ۱۳
مسٹری میں جلوہ گر ہے بے حجاب
۱۲ ء ۱۹
خلد سے آئی یہ رضواں کی صدا
۳۰ ه ۱۳
شور ہے مینو میں اس تالیف کا

۳۰ ه ۱۳
طرفگی ہے سرسری لاالف رقم
۶۹ ب ۱۹
شکل حالات دبیر خوش نوا
۶۹ ب ۱۹
عرض او یکتا مؤلف سے یہ کر

ا۔ یہ تاریخ جناب یکتا کے مؤرخ یکتا ہونے پر دال ہے - فکر کی یہ معراج کمال ہے - کہ ہر مصرع میں عیسوی یا ہجری یا بکرمی سال ہے - اور پھر اس قدر بے تکلف مصرع - سبحان اللہ - واضح رہے - کہ ہمزہ کا عدد لینے کا قاعدہ نہیں ہے - اسی خیال سے مؤرخ باخبر نے بھی "ماشاء اللہ" کے ہمزہ کا عدد نہیں لیا ہے - ملاحظہ ہو عدد التاریخ وگلشن خیال وغیرہ + ۱۲ مؤلف حقیر

۲۔ "مینو" زبان پارسی میں بہشت کے معنی پر مستعمل ہے "منو" اس کا مخفف ہے - منوچہر اسی سے متعلق ہے - اردو میں بھی کسی خوشنما آبادی کو "مینو سواد" کہتے ہیں - مثلاً بلدۂ مینو سواد حیدر آباد بولا جاتا ہے + ۱۲ مؤلف حقیر

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجہ فکر عالی جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب بسمل منصرم آب پاشی ریاست کوٹہ۔ ملک راجپوتانہ:۔

ثابت ہوا کمالِ مؤلف جہان پر ۔۔۔ جب حضرت دبیر کی لائف لکھی گئی
آئی فلک سے کان میں آواز ہاتفی ۔۔۔ اب چھوڑ انصرام کو بسمل یہ کہدے صاف
تاریخ کی تلاش تھی دل کو کہ دفعۃً
تالیف ہے یہ مولوی افضل حسین کی

۱۷۱۲-۳۸۲ باقی سنہ ۱۳۳۰ ہجری

رباعی تاریخ تالیف کتاب حیات دبیر مصنفہ شاعر نازک خیال باکمال نواب سید عسکری مرزا خاں صاحب بلیغ لکھنوی:۔

بے مثل قلم بند ہے۔ تقریر دبیرؒ ۔۔۔ ثابت کی عبارت ہے کہ تحریر دبیرؒ
کیا خوب لکھی سوانح عمری۔ واہ ۔۔۔ دیکھو۔ اک اک ورق ہے تصویر دبیرؒ

۱۳۳۰

قطعہ تاریخ تالیف کتاب حیات دبیرؒ مصنفہ جناب میر فراست حسین صاحب فراست رضوی رئیس زید پور ضلع بارہ بنکی۔ ملک اودھ۔ شاگرد رشید حضرت اوج مدظلہ:۔

نکتہ داں۔ ثابت تخلص۔ خوش بیاں۔ افضل حسین ۔۔۔ شاعر سرکار محبوب خدا۔ مداح آلؑ
کرد نذر ناظریں۔ مجموعۂ حالِ دبیرؒ ۔۔۔ تازہ شد گویا حیاتش در زمانِ انتقال
آفریں۔ صد آفریں۔ اے مدح خوان پنجتنؑ ۔۔۔ داشتی یکسو حواس خمسہ را تا پنج سال
سال تالیفش فراست از سر انصاف گفت ۔۔۔ روشنیِ طبع ثابت۔ نیّرِ اوجِ کمال

۱۹۱۱+۱ = ۱۹۱۲ء

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجہ فکر عالی جناب مولوی سید یونس حسنین صاحب یونس زید پوری شاگرد رشید حضرت اوج مدظلہ:۔

کہ؟ تالیف کرد۔ ایں کتاب فرح سا ۔۔۔ الآ۔ ثابت ست آں۔ کز اہل تمیز ست
رقم کن۔ پئے سال تالیف یونس ۔۔۔ حیات دبیرم زجانم عزیز ست

۱۳۳۰

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ شاعر ماہر و عالم کامل یادگار عرفر زند رشید صاحب نجوم السماء

جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی دام فضلہ :-

ضرورت آج زمانے کو جس کی تھی ثابت — دکھائی ہے وہی تصویر واقعات دبیرؒ

لکھا عزیز نے یہ مصرعِ سنِ تدوین — ۳۰ + ۱۳ ہے شمعِ بزم ادب۔ جوہر حیات دبیرؒ

قطعہ تاریخ تالیف نتیجہ طبع عالی جناب مولوی سید محمد جعفر صاحب قدسی جائسی۔ شاگرد رشید جناب مولانا صفی لکھنوی مدظلہ :-

سید افضل حسین۔ مہر ضیا بار علم — ثابت گردون مقام۔ اختر سیار علم

جس نے حیات دبیر۔ لکھ کے اک احسان کیا — خلق پہ روشن کئے۔ جلوہ اسرار علم

قدر شناسانِ فن۔ قدر کرینگے ضرور — منقبت ہے۔ گنجینۂ درہم و دینار علم

مردہ دلوں کے لئے۔ مایۂ عیش و نشاط — کرتی ہے دل باغ باغ۔ نزہتِ گلزار علم

مسطر زینت طراز۔ سلک دُر آبدار — زیب فزائی بیاض۔ گوہر شہوار علم

روح نہ کیوں تازہ ہو۔ ایک نظر دیکھ کر — صفحۂ قرطاس پر۔ جلوۂ انہار علم

شاہ معنی ہے ایک۔ یہ صحف ہر دلعزیز — مصرِ جہاں میں ہوئی۔ گرمی بازار علم

جرعۂ کش انبساط ہر منظر اشتیاق — ساقی ساغر بکف جلوۂ سرشار علم

قدسیؔ رنگیں بیاں۔ تو بھی ہے گل چیں فکر — ہو گل تازہ کوئی۔ طرۂ دستار علم

زیب نشاں بلند مصرع تاریخ ہو — ۳۰ + ۱۳ حصن حیات دبیر مطلع انوار علم

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیرؒ۔ نتیجہ فکر جناب احسن مرزا صاحب شرر لکھنوی۔ مؤلف کتاب فلسفہ صرف و نحو۔ شاگرد رشید حضرت نفیس مرحوم :-

اوج او منشیٔ فلک داند — چہ رقم میکنم صفات دبیرؒ — ہمہ گیر است طرز دلکش او

یادگار رند واقعات دبیرؒ — شش جہت محرم مسدس او — جدتِ فکر کائنات دبیرؒ

اشکار است قوت علمش — در سخن مستتر نکات دبیرؒ — چوں سر یا ۱ برد۔ و شد ثبوت

۳۰ + ۱۳ جام جمشید شد حیات دبیرؒ

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ عالی جناب چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق رضوی رئیس مہابن ضلع متھرا و شاگرد رشید حضرت اوج مدظلہ و مصنف المیزان (جواب موازنہ شبلی مرحوم)

خوب ثابت کی ہے۔ حیات دبیرؒ
ذکر مداح آل اطہرؑ ہے
یعنی مرزا دبیرؒ نیک سیر
جس کا انداز سب سے بہتر ہے
جس کے مصرع ہیں رشک دُر عدن
اُس کی تیغ زباں کا جوہر ہے
ہے بیانِ مصائب شبیرؑ
جس کا ہر اک بشر ثنا گر ہے

جس کا چرچا جہاں میں گھر گھر ہے
حال اُس ذی شرف کا لکھا ہے
ذکر جس کا ہر اک زباں پر ہے
جس کی ہر ایک نظم ہے پُر درد
جس کی ہر نظم سلک گوہر ہے
سر بسر پاک ہے کلام اُس کا
حالِ ذریّتِ پیمبرؐ ہے
انتخاب کلام ہے اس میں

کیوں نہ دل سے اُسے پسند کریں
جو سخن سنج ہے سخنور ہے
سب سے اعلیٰ ہے جس کا طرز کلام
جس کا ہر لفظ تیر و نشتر ہے
جس کو کہتے ہیں لوگ حُسنِ کلام
مدح خاصانِ ربّ اکبر ہے
کیا حیات دبیر کی ہو صفت
تحفہ ذاکران سرور ہے

سال تالیف ہے یہ مصرع فوق
بے بدل۔ بے مثال دفتر ہے ۱۳۰۱

قطعہ دیگر از جناب فوق رضوی موصوف:۔

خوب ہے حضرت ثابت کی یہ تصنیف لطیف
کون ثابت؟ جو ہے ذی منزلت و ذی رفعت
اُس کی تحریر مرصع پہ ہیں لاکھوں شیدا
ذکر مداح حسینؑ ابن علیؑ ہے اُس میں
کر دیا۔ ایک جگہ جمع یہ بے مثل کلام
طبع عالی نے بہت خوب کیا کار ثواب
جس قدر اس کی ثنا ہو۔ وہ بجا ہے۔ بیشک
اس کا ہر باب ہے خوبی و لطافت سے بھرا
نکہت افزا ہے ہر اک شعر مثالِ سنبل

جس کے پڑھنے سے ہر اک شخص کا دل شاداں ہے
صاحب فضل ہے۔ ذی قدر ہے اور ذی شاں ہے
اُس کی تصنیف پہ ہر ایک کا دل قرباں ہے
مومنوں کے لئے اس واسطے حرز جاں ہے
سچ یہ ہے شاعروں پر انکا عجب احساں ہے
یہ صحیفہ۔ سند مغفرتِ عصیاں ہے
اس کی جو مدحت و توصیف ہو۔ سب شایاں ہے
بہتر و دلکش و بے مثل ہر اک عنواں ہے
ضو فشانی میں ہر اک لفظ۔ مہِ تاباں ہے

جس کے ہر سطر پہ ہے تختۂ گلشن کا گماں
جس کے ہر لفظ میں بوئے گلِ تر پنہاں ہے

یا الٰہی رہے مقبول یہ تصنیف لطیف
جب تلک چرخ پہ خورشید مبیں تاباں ہے

اسے خوب ہے نسخہ بے مثل۔ ہے سال تصنیف
کیوں نہ ہمیشہ ہو۔ فرحت کا عجب ساماں ہے

اور تاریخ جو چاہی تو یہ ہاتف نے کہا
لکھ دے اے فوق سخنور۔ گہر غلطاں ہے

قطعہ دیگر مشعر سال تالیف حیات دبیرؒ از جناب فوق موصوف:-

بندۂ ثابت کی تصنیف لطیف و بے بہا
جس کی شہرۃ ہے ہر اک سو جس کی ہر جا دھاک ہے

اس میں حال اُس کا ہے جو ہے شاعر شیریں بیاں
عالم دیں۔ ذاکر سبطِ شہ لولاک ہے

بے بہا و طرفہ زیبا نظم۔ لکھو اس کا سال
اور خواہش ہو تو لکھ دو۔ ارمغان پاک ہے

ایضاً

خوب لکھی حضرت ثابت نے یہ نادر کتاب
جس سے نکھتے ہو گئے شعر و سخن کے منجلی

جس کے نظارے سے ہوتا ہے معطر دماغ
جس سے جی ہوتا ہے خوش۔ اور کھلتی ہے دل کی کلی

ہے سن تصنیف کی خواہش تو لکھ اے طبع فوق
بے بہا ہے ذکر مداح حسینؑ ابن العلیؑ

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر نتیجۂ فکر صوفی صافی طینت صاحب ذوق سلیم مولانا سلیم الدین صاحب سلیم مقیم ریاست بھرت پور:-

نبے ہے مولوی سید افضل حسین
ز مکنون خاطر بکاغذ فگند
بہیں نامۂ دل کشا دل پذیر
عبارت بہ تسخیر معنی۔ کمند
بلاغت دہی بعدہ اش خانہ خیز
فصاحت سیت اندیشہ را شہر بند
بہ تحقیق جوں داد تحقیق داد
معانی پژوہ و حقیقت پسند
عبارات خوبش ہمہ دل نشیں
گزیں رشحۂ خامۂ ارجمند
برو خرمن خوش بیانی نثار
متانت رضا جوئے رائے بلند
بیند اخت از جبہہ تیر جواب
بہ ہر سو ز ہر سوئے تحسیں کنند
ہمہ راستی داستانِ دبیرؒ
خیالات پاکش سراپا بلند
معانی بر الفاظ۔ کرسی نشیں
از و مایۂ شاعری بہرہ مند
نکات پسندیدہ دلغز را
مخالف ازاں گشت زار و نژند
بتاریخ ترتیب گفتم سلیم
حیات دبیر فصاحت پسند

قطعہ تاریخ تالیف کتاب حیات دبیرؒ۔ نتیجہ افکار جناب شیخ قربان علی صاحب قربانؔ۔ ساکن ڈبائی ضلع بلند شہر مقیم و مختار عدالت ہائے ریاست کوٹہ۔ شاگرد رشید مؤلف کتاب:۔

عجیب دلکش و دلچسپ ہے حیات دبیر
مؤلف اس کے ہیں اُستاد میرے ذی رفعت
جناب سیدِ افضل حسین ثابت نام
ہزاروں اہل کمال اور شاعروں کا حال
جو سال عیسوی کی فکر۔ میں نے کی قربانؔ

دبیر کون؟ کہ مدّاح چار دہ معصومؑ
کہ جن کے فضل کی ہے آج اہل علم میں دھوم
جنہیں سمجھتے ہیں۔ ارباب علم و فن مخدوم
اسی کتاب کے پڑھنے سے ہوگیا معلوم
کہا یہ دل نے کہ لکھ۔ ذکر خیر اہل علوم
۱۲ ۶ ۱۹

قطعہ تاریخ تالیف نتیجہ افکار سالک مسالک طریقت صوفی صافی طینت جناب شاہ محمد عبد الحلیم صاحب حلیمؔ۔ صاحب دیوان مطبوعہ:۔

شاعروں کی بزم کے صدر انجمن
جامع فن سخن۔ روشن ضمیر
نکتہ سنجاں جہاں کے پیشوا
مرثیہ گو۔ مرثیہ خواں بے نظیر
یہ ضرورت تھی کہ اردو نثر میں
کیوں نہ ہوں ممنون ہر برنا و پیر

زینت ایوان نظم دل پذیر
آسمان برتری کے ماہتاب
ملک معنی و بلاغت کے امیر
ہر طرح کی نکتہ چینی سے بری
آپ کے حالات ہوں زینت پذیر
اُن کی لائف جب مرتب ہو چکی

مطلع پُر نور خورشید کلام
اوج معنی کے لئے مہر منیر
منقبت گوئے امیر المومنینؑ
کون؟ یعنی حضرت مرزا دبیرؔ
حضرت ثابتؔ نے یہ احساں کیا
بے مثال و بے عدیل و بے نظیر

غیب سے آئی ندا مجھ کو حلیمؔ
مہبط تحقیق حالات دبیرؒ
۱۳ ۵

قطعہ تاریخ ترتیب و تالیف حیات دبیر مصنفہ سالکِ تسلیم و رضا و فنا صاحبزادہ حضرت مذاق بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (مقیم کوٹہ):۔

مجسم روح دانش۔ جاں بینش
چراغ پُر ضیائے بزم اسلام
نہ پوچھو کچھ عبارت کی لطافت

سراپا قابل تعظیم و اکرام
جناب ثابت عالی گہر نے
کہ ہیں مدّاح اُس کے خاص اور عام

گل گلزار علم و حلم و تہذیب
لکھا حال دبیر نیک انجام
بتا اے سالک ہر وارد خوش آب

کہ جمشید معانی کا کہوں جام ۔۔۔ جواب اچھے دئے ہیں معترض کو ۔۔۔ نہیں صحت میں جن کے شک ابہام

وفا کو بھی تلاشِ سالِ ترتیب ۔۔۔ کہا دل نے ۔ چراغ بزم الہام

۱۳ ۵ ۳۰

قطعہ تاریخ تالیف مصنفہ جناب سید محمود حسن صاحب ثاقب دہلوی شاگرد رشید مؤلف (و برادر زادہ و تعلیم یافتہ و شاگرد رشید جناب سید محمد زکریا خاں صاحب زکی ارشد تلامذہ حضرت غالب دہلوی مرحوم و) وکیل درجہ اعلیٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ :۔

جناب مولوی افضل حسین ثابت نے ۔۔۔ لکھے ہیں خوب ہی دل چسپ واقعات دبیر

مؤلف اس کے ہیں اُستاد محترم میرے ۔۔۔ جو فن شعر میں گویا ہیں آپ اپنی نظیر

یہ طرۂ تاج کمال ثابت ہے ۔۔۔ قلم کی تیغ سے ملک سخن کیا تسخیر

فصاحت اور بلاغت کے خوب لکھے نکات ۔۔۔ ہند میں آیۂ قرآں بھی کر دئے تحریر

دئے ہیں معترضوں کو جواب بھی معقول ۔۔۔ مثال آب رواں پاک صاف ہے تقریر

لکھوں وہ مصرع تاریخ عیسوی موزوں ۔۔۔ کہ جس کو پڑھ کے ہوں محظوظ سب صغیر و کبیر

صدائے ہاتف غیب آ رہی ہے لکھ ثاقب ۔۔۔ انیس اہل سخن عنصر حیات دبیر

۱۲ ۶ ۱۹

قطعہ تاریخ تالیف مصنفہ جناب سید ریاض الحسن صاحب ریاض ساکن قصبہ اقل ضلع متھرا وکیل درجہ اعلیٰ عدالت ہائے ریاست کوٹہ :۔

ملک پر حضرت ثابت نے یہ احساں کیا ۔۔۔ لکھے تحقیق سے حالات دبیر مرحوم

ہجری و عیسوی سنہ کی ہے مجھے فکر ریاض ۔۔۔ دل یہ کہتا ہے ۔ کہ تاریخیں ہوں دونو مرقوم

۱۳۳۱ھ ۔۔۔ ۱۹۱۲ع

شغل کا لفظ لکھو ۔ تو ہو عیاں ہجری سال ۔۔۔ شغل بے مثل لکھو ۔ عیسوی سنہ ہوں معلوم

قطعۂ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ مکرم و مخلص بے ریا عالی جناب بابو عبد القادر صاحب ندا اکبر آبادی ۔ اسسٹنٹ انجنیر ریاست کوٹہ ۔ راجپوتانہ :۔

حضرت ثابت !! بڑا احساں کیا ۔۔۔ لکھ کے سچے سچے حالات دبیرؔ ۔۔۔ دی عطارد کو ترقی ماہ پر

کر دئے روشن کمالات دبیرؔ ۔۔۔ ناخنِ تحقیق سے حل کر دئے ۔۔۔ عقدۂ نظمِ خیالاتِ دبیرؔ

لائقِ تعریف ہے ساری کتاب
عام ہیں جود و حالات دبیرؔ

خاص کر چیدہ مقالات دبیرؔ
اے ندا تم سال تدوین کتاب

کر دیا ثابت کہ اردو نظم پر
۱۳۰ ۱۳
لکھ دو۔ نو تحقیق حالات دبیرؔ

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مصنفہ جناب منشی فاضل مولوی عبد السّتار صاحب مختار عدالت ہائے ریاست کوٹہ:۔

۱۹۱۲ء عیسوی
(ب) بسکہ تالیفات نظم شاعر عالی دبیر
۱۳۲۳ف
(ی) یاد باد این شغل ثابت شد پسند اندر جہاں
۱۳۱۹ بنگلہ
(ظ) ظن من بر زین نباشد شان گلزار سخن
۱۳۲۰ فصلی ۱۳۲۰ فصلی
(غ) غنچہ نادر باوج است ہم ریاض نو بہار
۱۹۱۲ء
۱۳۴۱ محمدی
حرف ہر مصرعہ بشد تاریخ سال حال نیز
۱۳۲۳ف ۱۹۱۲ء
عیستاریخ ہمایوں غیرت گلزار جام

۱۹۶۹ بکری
(ل) ہجری کردہ بافیض عروض اہل جہاں را کامگار
۱۳۳۰ع ۱۳۴۱ محمدی
(ی) یاد کن تذکیر و قل تاریخ بہر نامدار
۱۸۳۴ سالی
(ش) شاد عاشق زیں عروس نو عذارش مشکبار
۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء
(غ) غیرت افکار شد اعجاز مرغوب آشکار
۱۹۱۲ء ۱۹۱۲ء
نظم موضوع و ریاض گلرخاں آمد بکار
۱۳۴۱ محمدی ۱۳۱۹ بنگلہ
بازشد تاریخ فن پس حمد باغ نو بہار

قطعہ تاریخ طبع مصنفہ شاعر کامل و طبیب حاذق عالم علوم معقول و منقول عالی جناب حکیم مولوی محمد مظہر الہادی صاحب سہیل امروہوی مقیم و ملازم ریاست کوٹہ۔

آں نغمہ نواز ساز تصنیف
زیبائش منزل تمناست
ہم پردہ کشائے حجلۂ غیب
زیباست کہ اسم بامسمیٰ ست
داد ست دبیرؔ را حیاتے
جدت بزبان خویش گویاست
ہم نثر و عبارتش دل آویز
کحل البصر جواہر آماست
از گوشش ترنم سمعنا

کو شاعر و ناثر دل آراست
ہم طوطیٔ خوش نوائے گفتار
ہم جلوہ نمائے حسن معنیٰ ست
بنوشت حیات آں سخنور
ہم طرح بمعجز مسیحاست
اقوال لطیف تر از ارواح
چوں آب حیات ہم مصفاست
ز الفاظ مہذب و مرصع
آواز نیاں دل آشناست

آرائش مسند محبت
ہم بلبل بوستان انشاست
نامش افضل حسین ثابت
مشہور جہاں دبیرؔ یکتاست
ترتیب بطرز نو نمودہ
احوال صحیح تر ہمہ راست
بینش ز فروغ او منور
تہذیب مصنفش ہویداست
معنی ست بہ یوسفی ہم آغوش

چشم ارباب دلِ زلیخا ست | حسنش زکمال دل فریبی | چشمک زن حسن روئے لیلا ست
لطفش ز دفور ناشکیبی | برہم زن رونق تماشا ست | اسلوب بیاں لطیف و دلکش
انداز ادا قبول دلہا ست | توضیح معانی و بیان ست | ایں وصف ز ہر ورق ہویدا ست
تکرار تجلّیٔ الٰہی | انوار تقدس و تجالے ست | در بزم سخن ز ہند و انگلینڈ
ہم تازی و پارسی مہیّا ست | تا اہل سخن کنند فیصل | بر ہند رکدام جلوہ فرما ست
تا نور سخن جہاں فروز ست | تا گفت رشنود را ہیولا ست | تا حسن قبولِ فرع حسن ست
تا گوش بحسن صورت شید است | تشریف قبول خلعتش باد | ایں ست دعا ہمیں تمنّا ست

ایں ست سہیل سال طبعش | تقوٰیہم دبیر بے غم و کا ست ۱۳۱۱ ۵ ۱۳

قطعہ تاریخ طبع نتیجۂ افکار گہربار شاعر ذی وقار جناب سیّد نظیر الحسن صاحب فوق ارشد تلامذۂ حضرت اعج دامت برکاتہٗ ۔ رئیس مہابن ضلع متھرا و مصنّف المیزان (بجواب موازنہ مولوی شبلی صاحب)ؒ۔

لکھا ہے ثابت نے حال اُس کا | جو شاعروں میں ہے فرد یکتا | ہر ایک جانب ہے جس کا شہرہ
کلام ہے ہر طرف کو مشہور | یہ ہاتف غیب نے سنایا | اگر حسن طبع کی ہے خواہش

تو جلد اسے طبع فوق لکھ دے | حیات مرزا دبیر مبرور ۱۳۱۱ ۵ ۱۳

قطعہ تاریخ طبع از نتائج افکار گہربار شاعر قوم کامل فن جناب مولوی سیّد علی نقی صاحب المعروف بہ مولانا صفی لکھنوی دام اقبالہ سررشتہ دار صاحب ایڈیشنل جج لکھنؤ ۔

جناب سیّد افضل حسین ثابت ما | بحسن سعی چو کرد ایں جریدہ را تحریر
صفی رقم زدہ تاریخ طبع آں نسخہ | انیس خلوت اہل ہمم حیات دبیر ۱۳ ۶ ۱۹

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر نتیجۂ فکر شاعر غرا جناب سیّد یونس حسین صاحب یونس رضوی زیدپوری شاگرد رشید حضرت اوج مدظلہٗ ۔

کہ؟ تالیف کرد ایں کتاب معلّٰی | الا ثابت ست آں کز اہل تمیز است

پئے سال طبعش رقم کرد یونس | حیاتِ دبیرم زجانم عزیز است*

[۱۳۱۱ — ۱۳۰۱]

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر۔ نتیجہ افکار مدّاح آل محمد جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی۔ ارشد تلامذۂ جناب عارف دامت برکاتہٗ:۔

مشفق من ثابت طیبوا بیاں
ہے صدائے صور خامے کی صریر
ہیں یہ جس کے واقعاتِ زندگی
منقبت خوان امیر ابن امیر
کشت زار نظم دلکش کے لئے
والہ و شیدا۔ ہر اک برنا و پیر
نام زندہ کر دیا مدّاح کا

خوب لکھو یہ کتاب دل پذیر
واقعہ ہر ایک لکھا بے عدیل
تھا وہ مدّاح شو گردوں سریر
مرثیہ گوئے حسینؑ تشنہ کام
طبع جس کی صورت ابر مطیر
جو ہے وہ۔ شانِ بلاغت پر نثار
ہے صلہ ثابت کو اے ربّ قدیر

ہو گیا جس سے کہ احیائے کمال
معنی و مفہوم جس کے بے نظیر
اکمل دوران دبیرؔ نکتہ سنج
دعبل و حسّان کا گویا ہم صفیر
وہ سخن دلکش کہ پڑھتے ہی جیسے
جو ہے وہ طرزِ فصاحت کا اسیر
لکھ دو محشرؔ مصرع تاریخ طبع

عزتِ مجالس ہیں حالاتِ دبیرؔ

[۱۳۱۱]

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر۔ نتیجہ فکر عالی جناب میر فراست حسین صاحب فراست رضوی رئیس قصبہ جیہ پور ضلع بارہ بنکی۔ ارشد تلامذہ حضرت اوج مدظلّہ:۔

بفضل خدا سید افضل حسین | چہ خوش کرد ثابت صفات دبیرؔ | دلی افروز و جاں پرور اہل دل
زہے دفتر وصف ذات دبیرؔ | پے سال طبعش فراست نوشت | بگو نعمت حق حیات دبیرؔ

[۱۳۱۱]

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر مصنفۂ جناب منشی ریاض الدین احمد صاحب بسمل منصرم آب پاشی ریاست کوٹا ملک راجپوتانہ:۔

لکھی ہے جس کی حضرت ثابت نے ہسٹری | تلمیذ خاص تھا وہ جناب ضمیرؔ کا
بسمل کو سال طبع کی ہاتف نے دی خبر | ہے شور مرثیوں میں حیات دبیرؔ کا

[۱۹ — ۳]

* یہ بات میں جناب یونس کے ترجمہ میں بھی لکھ چکا۔ اب پھر لکھتا ہوں۔ کہ عزیز دوست کو بعض بغیر الف است کے لکھتے ہیں بعض مع الف کے ذلیعلم شاعر نے رسم الخط کے اختلاف سے فائدہ اٹھایا کہ ایک ہی مصرع میں سے تاریخ تالیف و تاریخ طبع دونوں نکال دیں یہ بھی اُن کے کمال کی دلیل ہے۔ ۱۲ حقیر ثابت۔

قطعہ تاریخ طبع حیات دبیر۔ نتیجہ فکر عالی شاعر غرا جناب مولوی عبد الطیف صاحب المتخلص بیکتا دام مجدہ۔ رئیس تھانہ بھون و ناظم نظامت گلشن گنج ریاست کوٹہ۔ واز رشد تلامذہ جناب امراؤ مرزا صاحب انور مرحوم و جناب فصیح الملک داغ دہلوی:-

زندہ ہوا ہے نام حیات دبیر سے
مداح خاندان جناب امیرؑ کا
یکتا نے سال طبع بھی لکھا ہے بے بہا
ہے قدسیوں میں ذکر حیات دبیرؔ کا

(بعد تخرجہ ۸) ۱۹۱۳ سنہ عیسوی

ایضاً ولہ

ثابت کرینگے خوب کمال دبیرؔ کو
اُمید تھی یہ ثابت عالی جناب سے
لائف میں واقعات عجیبہ کئے رقم
تصحیح کر کے بعض فضیلت مآب سے
دل چسپ اس قدر ہیں مضامین نو بنو
مشکل ہوا ہے آنکھ اُٹھانا کتاب سے
جا نکلا ہے جناب مصنف کو دیکھ کر
نکلا ہے مرحبا۔ دہن شیخ و شاب سے
چھپ کر اس آفتاب سے نکلی یہ ہسٹری
گویا کہ ماہ نو نکل آیا سحاب سے
یکتا نے جب سوال کیا سال طبع کا
تاریخ ملا یہ ہاتف حاضر جواب سے
کہدے کہ انطباع کی تاریخ ہے یہی
ظاہر ہوا ہے اوج دبیر اس کتاب سے

قطعہ تاریخ تالیف حیات دبیر مؤلفہ جناب سید علمدار حسین صاحب واسطی سررشتہ دار اپیل مجسٹریٹی (پٹیالہ) متوطن قصبہ بنوڑ ریاست پٹیالہ۔ ملک پنجاب:

میر افضل حسین ثابت نے
کی حیات دبیر جب تحریر
بن گیا صفحہ صفحہ خلد نظیر
کھل گیا۔ گلشن معانی نو
کیا بلاغت کی شرح فرمائی
مو شگافی سے کر دیا روشن
اور معانی کی خوب کی تفسیر
مطلب شعر۔ مثل مہر منیر
میر ثابت کی با اثر تحریر
ہے سراپا۔ ثبوت ذوق سلیم
سال تاریخ پوچھا ہاتف سے
فکر تاریخ تھی جو دامن گیر
آواز آئی واسطی لکھ دو
خوب لکھی ہے زہے حیات دبیر

تقریظ جناب مسٹر ہیرالال سود۔ بی۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ متخلص بہ شیدا۔ رئیس آگرہ (مائی تھان) و سب جج کوٹہ ملک راجپوتانہ۔ عالم علوم فارسی و انگریزی و سنسکرت و شاعر ہرسہ زبان اردو

انگلینڈ کے وسیع نظر فلاسفر اور پاکیزہ خیال عالم مسٹر ٹامس کارلائل کا قول ہے۔ کہ "دنیا کے تمام سچے پیغمبر اور شاعر اور حکمران ایک ہی مادے کے بنے ہوتے ہیں۔ ان سب کا انعکاس علم و راستی کے ایک ہی لایزال منبع سے ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ہی سوتے سے نکلنے والے چشموں کے پانی مختلف سرزمینوں پر بہنے کی وجہ سے جدا جدا تاثیریں حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح اہل عالم کے سچے رہبر اور رہنما خاصان خدا مختلف حالتوں میں پرورش پانے کی وجہ سے اور مختلف ضروریات دنیا کو پورا کرنے کی غرض سے علیحدہ علیحدہ صورتیں اختیار کر لیتے ہیں"

دنیا کے تمام جاندار چھوٹے اور بڑے تکلیف سے بچنے اور آرام حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ نیکی خوشی کا موجب اور بدی تکلیف کا سبب ہے۔ راستی اور ناراستی کی نہایت خوفناک جنگ ازل سے جاری ہے۔ اور ابد تک رہیگی۔ راستی وکیل خدا ہے۔ اور اُس کی امداد کے لئے سچے اور قابل تکریم ہیرو وقتاً فوقتاً نمودار ہوا کرتے ہیں۔ یہ زبردست لیڈر (راہ نما) حسب ضرورت مختلف قسم کی وردیوں اور بھیسوں میں ظاہر ہوتے ہیں +

جسمانی دماغی۔ روحانی ترقی جماعت انسانی کی بہبودی کا سبب ہوتی ہے۔ اور انہیں تینوں حالتوں کا تنزل موجب زوال قرار دیا جاتا ہے۔ ان تینوں ضروری پہلوؤں میں سے ایک کا بھی گر جانا ہستی کی فوج کو کمزور کر دیتا ہے۔ پس جس قوم کی کمزوری صورت پذیر ہوتی ہے۔ اُسی کی درستی کے قابل لیڈر بارگاہ الٰہی سے نامزد کیا جاتا ہے۔ اور وہ میدان کارزار میں آکر ناراستی کو مغلوب کرتا ہوا خدا کے

پاک کام کی تکمیل کرتا ہے۔ جب دُنیا میں ظلم و تشدّد کا بے انتہا زور ہو جاتا ہے۔ اور ایک بھائی دُوسرے بھائی کے خون کا پیاسا بن کر اُس کی جان و مال کو پامال کرنے لگتا ہے۔ اور ہر طاقت ور آدمی کلاہ کج سر پر رکھ کر اپنے سے کمزور آدمیوں پر بیجا حکومت کرتا ہے۔ اور اُن کو اپنی نفس پرستی کا ذریعہ بناتا ہے۔ تو ایک سچّا ظلّ اللہ درگاہ باری سے مامور کیا ہوا بادشاہ عالم کی اسٹیج پر آتا ہے۔ اور تمام جھوٹے اور مصنوعی حکمرانوں کو نیست و نابود کر کے انسانی جماعت کے جسمانی پہلو کو مادّی تکالیف سے نجات دیتا ہے*

انسان ایک عجیب و غریب جانور ہے۔ جب اُس کی جان و مال کی حفاظت کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور وہ کچھ دنوں سُکھ کی نیند سو لیتا ہے۔ تو اُس کا سر چکراتا ہے۔ اور اُسے قسم قسم کے عیش و عشرت کی سُوجھنے لگتی ہے۔ اس عیش کے متوالے کی دُنیاوی لذّتوں سے تعلّق رکھنے والی خواہشیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں۔ کہ اُسے حلال و حرام کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اپنی ناجائز ضروریات کی فراہمی میں معبود حقیقی کی جانب سے امداد نہ پاتا ہوا بہت سے جھوٹے اور فرضی معبود گھڑ لیتا ہے۔ جو اُسے کبھی پُورا نہ ہونے والی خواہشوں کے سرسبز ہونے کے انتظار میں تھکا ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح سچّے بادشاہوں کے زور بازو کی بدولت جسمانی موت سے بچا ہُوا آدمی رُوحانی موت کا شکار بن جاتا ہے۔ اس مرحلے پر جو نجات دلانیوالا لیڈر منجانب اللہ بھیجا جاتا ہے۔ اُسے پیغمبری کی وردی عطا ہوتی ہے۔ وہ جہالت کے تاریک غار میں پڑے ہُوئے انسان کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتا ہے۔ اور بے حقیقت معبودوں کی حقیقت سے ماہر کرتا ہُوا اُن کو اسرار حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اِس طریق پر راستی کے سیدھے راستے پر لگ کر رسول کے بچھڑے ہُوئے مُسافر رُوحانیت کی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں* جس وقت انسان کی جسمانی اور رُوحانی حالت ترقّی کر جاتی ہے۔ اُس کے اندر حصول علم اور تحقیقات کا مادّہ زور کرتا ہے۔ اُس کا دل اُمنگ پر آکر باریک سے باریک جذبات کا لُطف اُٹھاتا ہے۔ اُس کی حس کی قوّت انتہا کی زوردار ہو کر اُس کو ہر چیز کی اصلیت کے جاننے کی کوشش میں سرگرم کرتی ہے۔ انسان کی تنہا کوشش مشکل سے کامیاب ہوتی ہے۔ اور اس لئے اُس کے واسطے اس موقع پر

بھی غیب سے امداد پہنچتی ہے۔ اس مرحلے پر رہبری کا متبرک کام شاعر کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اور اُسکی
طبع رسا دل کے سمندر میں جذبات کی گہرائیوں کی تہ کو پہنچ کر باریک سے باریک چیز کی اصلیت نکال لاتی ہے۔
اور اُس کی واقعی صورت اہل دُنیا کے روبرو پیش کر دیتی ہے۔ ہم سب جو عوام کے زمرے میں داخل ہیں۔
نیچر کا صرف سطحی نظارہ کرتے ہیں۔ اور شاعر کی نظر اُس کی اندرونی حالتوں کا بھی مشاہدہ کر لیتی ہے۔
شاعر کی وردی پہن کر عرصہ عالم میں نمودار ہونیوالے ہیرو کی مدد سے ہم دُنیا کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی
سے چھوٹی چیز کی ماہیت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اُس کا نفع اور نقصان اور نیک و بد ہم پر روشن
ہو جاتا ہے۔ ہم ہر شے کے واجبی استعمال کرنے کے لائق بن جاتے ہیں۔ پس ہر سچا شاعر ہماری دماغی
ترقی اور اخلاقی نجات کا موجب ہوتا ہے۔ اور اسی لئے علماے عالم کی نظر میں شاعر پیغمبروں سے کم
رتبہ نہیں رکھتا۔ اور سچ پوچھو۔ تو شاعر کا کام پیغمبروں کے کام کے مقابلہ میں کچھ کم بھی نہیں ہے۔ روحانیت
کا تعلق خدا سے اور اخلاق کا اُس کے بندوں سے ہے۔ ہم ابوابن ادھم کے قائل ہیں۔ جو
بجائے خدا کے اُس کے بندوں سے محبت کرتا تھا۔ بندوں سے محبت کرنیوالا خدا سے محبت کرتا
ہے۔ اور جس کے دل میں بندوں کے ساتھ پیار نہیں ہے۔ وہ خدا کو پیار نہیں کر سکتا۔ الغرض مخلوق
عالم کے ساتھ اُنسیت ذات خدا کے ساتھ محبت کرنے کے لئے لازمی ہے۔ اور اس لازمی جزو کی
تکمیل شاعر کے سپرد کی گئی ہے۔ صورت مذکورہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی اہلِ دل نہیں کہہ سکتا۔ کہ ہم نے
شاعر کا رتبہ قائم کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔

سچ اور جھوٹ کا ازل سے ساتھ ہے۔ مصنوعیت اصلیت کے ہمرکاب چلتی ہے۔ آفتاب
عالم تاب کی روشنی اصلی اور کٹسن لمپ کی نقلی ہے۔ اصلی بادشاہوں (جن کو خدا نے بادشاہی کیلئے
پیدا کیا ہے) کے تزک و احتشام کو دیکھ کر بہت سے نقلی اور مصنوعی بادشاہ بھی بن جاتے ہیں۔ گو اُن کا
تاج اُن کے سر پر سوار ہو کر خنجر غنیم کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بہت سے خدائی بھر کے
جھوٹے پیغمبری کا دعوے کرتے ہیں۔ گو اصلیت کھُلنے پر بجائے رحمت کے لعنت اُن کا
حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح بہت سے حریص اور سچے شاعروں کی تعظیم و تکریم کو دیکھ کر للچا جانیوالے

آدمی بھی شاعر بن جاتے ہیں۔ اور دو چار ٹوٹے پھوٹے شعر گھڑ گھڑا کر دنیا کے مشاعرے میں صدر نشینی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ہم کو بھیڑئے کی کھال اوڑھ لینے والے گدھوں اور ہلدی کی گانٹھ پاکر پنساری بن جانے والے چوہوں سے غرض نہیں۔ اُن کی ناپاک ہستی کو خیال میں لانا ہے۔ اصلی شاعروں کی سراسر توہین ہے۔ جو بلند و برتر رتبہ ہم نے شاعروں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ وہ انھیں اہل کمال کو زیب دیتا ہے۔ جن کے دماغ علم کے بے بہا خزانے سے معمور اور دل محبّت کی دولت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جو اپنے خدا کی بخشی ہوئی دولت سے ایک عالم کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ جن کی پاک تعلیم کی بدولت دُنیا میں محبّت کا راج قائم ہوتا ہے۔ اور جن کے مبارک قدموں کے صدقے سے جماعت انسانی اخلاق کے ہمالہ کی چوٹی پر پہنچ جاتی ہے۔ جن کا فرشتوں کے دماغ کو تر و تازہ کرنیوالا نفس انسان کی مُردہ رُوح میں ایک زندگی پھونک دیتا ہے۔ اور جو اپنے ہم جنسوں کو اپنے الہام کے طفیل میں حیوانیت کی ذلّت سے نکال کر فرشتگی کی عظمت کا حقدار بناتے ہیں۔ ایک سچے خدا کی طرف سے شاعری کے لئے پیدا ہونے والے شاعر کا کام ہے۔ کہ (اوّل) وہ نظام عالم کے ہر پہلو سے آگاہ ہو کر بڑی اور چھوٹی تمام چیزوں کی اصلیت اور اُن کے مناسب استعمال سے ماہیت حاصل کرے۔ (دوم) اپنے ہم جنسوں کو بھی اپنی جانی ہوئی باتیں بتلاوے۔ اور دیکھے۔ کہ وہ نیچر کے عطیوں کو جائز طریق پر کام میں لاتے ہیں یا نہیں۔ (سوم) اپنی معلومات کو جن کا حصول معمولی طبقے کے لوگوں کے لئے ناممکن ہے۔ ایسے پیارے میٹھے اور نمکین اور انتہا کا تناسب رکھنے والے الفاظ میں ظاہر کرے۔ کہ وہ سُننے والوں کے دلوں پر نقش ہو جائیں۔ اور اُن کا گہرا اثر اُن کے فائدے کا موجب ہو۔ (چہارم) بدی کی بُرائی اور نیکی کی بھلائی کے وہ دلکش ترانے سُنائے۔ کہ سامعین کو اوّل الذکر سے نفرت اور آخر الذکر سے رغبت پیدا ہو۔ (پنجم) اپنے ہمجنسوں میں باریک بینی کی عادت پیدا کرے۔ اور محبت کو جو نیچر کا اصلی سروپ ہے۔ اہل تماشا کے روبرو اس انداز سے پیش کرے۔ کہ وہ نفاق کی مکروہ صورت سے بیزار اور محبّت کے عاشق زار بن جائیں۔ اُن کا ہر موئے تن ہمہ تن زبان ہو کر محبّت کے گیت گانے لگے۔ اور وہ محبّت ہی کو اپنی زیست کا آغاز اور انجام سمجھ کر

اُس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں +

کوئی باپ اپنے بیٹے کی دولت وحشمت دیکھ کر نہیں جلتا - ایک محبت ہی عداوت - نفرت - کدورت - نخوت - ظلم اور سیکڑوں بدعتوں کا علاج ہے - محبت - حرص وہوا کے بندوں کو کاٹ کر اپنے بندوں کو آزاد کر دیتی ہے - صبر - استقلال - استغنا اُس کے غلاموں کو نصیب ہوتے ہیں - اور وہ ہفت اقلیم کی بادشاہی کو بھی پیار کی ایک نگاہ کے بدلے خرید نا سخت گراں سمجھتے ہیں - دُنیا کی اخلاقی اور جذبات سے تعلق رکھنے والی ہستی کے قیام کے لئے سچے اور اصلی شاعروں کی اشد ضرورت ہے - اس ضرورت کو آسانی سے ظاہر کر دینے کے لئے بھی ایک شاعر یا فلاسفر درکار ہے - ہم نظیر اکبر آبادی کا ایک قطعہ اہل دل کی خدمت میں مثالاً پیش کرتے ہیں - اس قطعہ کے سُننے سے طبیعت پر جو کیفیت طاری ہو گی اُس سے شاعروں کی ضرورت کا اندازہ کیا جانا ممکن ہے :-

قطعہ

تن مُردہ کو کیا تکلف سے رکھنا — گیا وہ تو جس سے مزیّن یہ تن تھا

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا — مُشبّن بدن تھا - معطّر کفن تھا

جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا — نہ تار کفن تھا - نہ عضو بدن تھا

نظیر آگے ہم کو ہوس تھی - کفن کی — جو دیکھا - تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

ہم امید کرتے ہیں - کہ اس قطعہ کو بغور پڑھنے والے اصحاب شاعروں کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں - اور دست بدعا ہیں - کہ اے ناظم کون ومکان دس بیس اس قسم کے شاعر ہماری رہبری کے لئے اور بھیج دے !!

ہم نے اکثر احباب کو مختلف زبانوں - مختلف ملکوں اور مختلف مذاہب کے شاعروں کا مقابلہ کرتے دیکھا ہے - کوئی انگریزی کے شاعروں کو اردو شاعروں سے اچھا بتلاتا ہے - اور کوئی اُس کے برعکس اردو شاعروں کو انگریزی سخنوروں پر ترجیح دیتا ہے - ایک شخص ہندی والوں کی تعریف کرتا ہے - دُوسرا فارسی والوں کی - ہم اس معاملے میں اپنا خیال ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتے - کہ ہم اس قسم

کی تمام بحثوں کو کج بحثی سمجھتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ تمام مناظرے بے معنی ہیں۔ خیال کو ادا کرنے کا زبان صرف ایک آلہ ہے۔ اور ہر زبان میں ایک عمدہ اور پاکیزہ خیال ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ایک اونچے درجے کا دل کو ابھارنے اور طبیعت میں جوش پیدا کرنے والا خیال ہر زبان میں اپنی پاکیزگی قائم رکھ سکتا ہے۔ خواہ وہ زبان جاپانی ہو یا یونانی۔ عبرانی ہو یا ایرانی۔ انگریزی ہو یا ہندوستانی۔ مذہب کا اختلاف بھی کچھ فرق نہیں کرسکتا۔ مذاہب کے درمیان کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں۔ محبّت۔ ہمدردی اور اخلاق کی تعلیم ہر ایک میں موجود ہے۔ اور ہم کافی تفصیل کے ساتھ ظاہر کرچکے ہیں۔ کہ ہر سچے اور نیچرل شاعر کا مشن دنیا میں اخلاق اور محبت کو ترقی دینا ہے۔ بہت سے کج فہم اور چھوٹے دل والے لوگ شعرا کے خلاف لامذہبی کا فتوے صادر کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے فتوے دینے والے سخت غلطی پر ہیں۔ وہ شاعری کے فلسفے سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ نہیں جانتے۔ کہ ایک شاعر بحیثیت انسان کسی مُلک یا مذہب کا ہو لیکن بحیثیت شاعر اُس کا مذہب جُدا ہوتا ہے۔ اُس کا کام عام پنڈتوں۔ مولویوں۔ پادریوں کی طرح مختلف فرقوں میں نفاق کی آگ بھڑکانا نہیں ہے۔ اُس کو خداوندکریم نے بجائے بیگانگت کے یگانگت اور عداوت کو دُور کر کے محبّت پیدا کرنیکے لئے بھیجا ہے۔ مولانا رُومؒ فرماتے ہیں۔ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی

تعصّب اخلاق کا دشمن ہے۔ اور اس لئے تعصّب شاعر کے مذہب میں روا نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی شاعر نے اپنی خداداد طاقت کو تعصّب کی ترقی اور مذہبی اختلاف کو مستحکم کرنے میں صرف کیا ہے۔ تو یہ اُس کے سچے شاعر نہ ہونے کی پہچان ہے۔ وہ شاعر نہیں۔ تُک بند ہے۔ نقّال ہے۔ ننگ شعرا ہے۔ اور شاعروں (محبت کے مشنریوں) کی پنچایت سے باہر کر دئے جانے کے قابل ہے +

شکسپیر۔ ورڈس ورتھ عیسائی تھے۔ لیکن شکسپیر کے ڈرامہ عیسائیوں۔ ہندوؤں۔ مسلمانوں کو ہیومن نیچر (فطرت انسانی) کے مطالعہ میں ایک سی مدد دیتے ہیں۔ ورڈس ورتھ کی دلکش نظمیں بنی نوع انسان کے لئے ہیومن افیکشنس (جذبات انسانی) کے راز کا انکشاف کرنیوالی ہیں۔

ہومر۔ ورجل۔ ڈینٹی کا باوجود اختلاف مذہب کے دُنیا کے ساتھ ایک سا سلوک ہے۔ میر و غالب ہندوؤں کے ویسے ہی محسن تھے جیسے مسلمانوں کے۔ اور گوشائیں تلشی داس کے۔ اولاد کی سعادت مندی۔ بیویوں کی پارسائی اور بھائیوں کی محبت کے متعلق سبق ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے بیحد فائدہ پہنچانے والے ہیں۔ شاعروں کے دُنیا میں بھیجے جانے کی ضرورت۔ اُن کا کام اور اُن کی ذمہ داری کی بابت سطور بالا میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ خداوند کریم شاعروں کو محبت کی ترقی اور اخلاق کی وسعت کے لئے پیدا کرتا ہے۔ ہر شاعر کے سچے یا جھوٹے اصلی یا نقلی ہونے کی آسان پہچان یہ ہے۔ کہ اُس نے محبت کے بیت المال کو جو اہل اللہ کا ورثہ ہے۔ کتنی ترقی دی۔ اور ممالک اتفاق و محبت کی حدود میں کس قدر اضافہ کیا۔ آؤ۔ ہم اس کسوٹی پر مرزا دبیر مرحوم کے کلام کو پرکھیں۔ اور دیکھیں۔ کہ مرحوم سچے اور اصلی شاعروں کی فہرست میں داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اردو شاعری سے تعلق رکھنے والوں میں ایک فرقہ ایسا ہے۔ جو مرثیہ گویوں کو اچھی نگاہ سے دیکھنے کے لئے طیار نہیں ہے۔ اُس کا خیال ہے۔ کہ "بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو ہوا کرتا ہے"۔ ہم اس جماعت کا میمبر بننا نہیں چاہتے۔ بلکہ خواستگار معافی ہوتے ہوئے عرض کرتے ہیں۔ کہ ہم اس تنگ خیال زمرہ کی ممبری کو اپنے لئے موجب ننگ سمجھتے ہیں۔ ہم اس گروہ کے مخالفین کے دوست ہیں۔ اور ہمارا عقیدہ ہے۔ کہ "اردو شاعری میں مرثیہ گوئی کا مرتبہ سب سے اعلےٰ ہے"۔ ہم غزلیں کہتے ہیں۔ اور سُنتے ہیں۔ اور تسلیم کرتے ہیں۔ کہ غزل کے کسی کسی شعر میں بھی سچی شاعری کی بُو آجاتی ہے۔ لیکن غزلوں کی بناپر اصلی اور نقلی شاعر کی تمیز کر لینا ناممکن ہے۔ غزل میں محبت کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ معشوقوں کے ساتھ عاشقانہ گفتگو۔ راز و نیاز کی باتیں۔ وفا و جفا کے شکوے اُس باطنی محبت کی تصویر پیش نہیں کرسکتے۔ جس کو فلاسفروں نے نیچر کے ہارمنی* (نیچر کے اتحاد) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ غزل گو کی محبت

---

* نیچر بذات خود ایک نظم یا نغمہ ہے۔ جس کا ہر اصول (اصل) قوافی اور سُروں کی طرح ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہے۔ اور اردو زبان میں انگریزی کے بہت سے فلسفیانہ خیالات پُورے طور سے ادا نہیں کئے جاسکتے۔ اس لئے مجبوراً جو لفظ زیادہ موزوں و مناسب معلوم ہوا۔ خطوط ہلالی میں لکھ دیا گیا ہے + ۱۲ خاکسار رشید ا۔

خود غرضانہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے معشوق پر اس لئے مرتا ہے۔ کہ اُس کے وصل سے بہرہ یاب ہو۔ وہ اپنے
دلدار کی اس لئے شکایت کرتا ہے۔ کہ اُس جفاکیش کو دُوسرے لوگوں کے ساتھ بھی جنہیں غزل گو اپنا عدو و
یار رقیب سمجھتا ہے۔ محبت ہے۔ الغرض غزل گو اُس محبت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جو محض محبت
کی غرض سے کی جاتی ہے۔ جس کی ضرورت صرف اس لئے محسوس ہوتی ہے۔ کہ وہ انسان کا خمیر ہے۔
اور اُس کی زندگی کے لئے نمک کا کام دیتی ہے۔ غزل کے اخلاقی پہلو کی نسبت تو صرف اس قدر کہہ دینا
ہی کافی ہے۔ کہ موجودہ سیکڑوں دیوانوں میں مشکل سے ایک غزل ایسی نکالی جا سکتی ہے۔ جو کوئی شریف
باپ اپنی بالغہ بیٹی کو پڑھ کر سُنا سکے۔ یا وضعدار شوہر اپنی بیوی کو کسی دُوسرے مرد کو سُنانے کی
اجازت دے۔ وجوہ مذکورہ کی بنا پر ہی کہا گیا ہے۔ کہ غزلیات کے ذریعہ سے سچی شاعری کا منشا مشکل
سے پُورا ہو سکتا ہے۔ قصیدے غزلوں سے بہتر ہیں۔ مثنوی اور مرثئے قریب قریب ایک
ہی قسم کی نظمیں ہیں۔ اور میرے خیال میں ہر مرثیہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مثنوی کی شکل اختیار کر سکتا
ہے۔ مرثیہ ایک اعلےٰ درجہ کی نظم ہے۔ اور اُس کا کہنا بہت مشکل ہے۔ یہی سبب ہے۔ کہ سو ۱۰۰
شاعروں میں سے کم سے کم پچانوے ۹۵ غزل گو اور زیادہ سے زیادہ پانچ مرثیہ گو ہوتے ہیں۔ اور ان
پانچ میں سے بھی ایک کو مشکل سے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ مرثیہ گوئی کے لئے بہت بڑی علمیت اور
وسعت معلومات کی ضرورت ہے۔ مرثیہ گو کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ ہیومن نیچر کا نہایت باریک
مطالعہ کر چکا ہو۔ ایک واقعہ کو نظم کرتے وقت ہزاروں قسم کے آدمی متعلقین واقعہ اُس کے روبرو
پیش ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ ان ہزاروں آدمیوں میں سے ایک کی طبیعت کو بھی پہچاننے میں قاصر رہا
ہے۔ تو وہ اُس کی تصویر کھینچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اہل نظر جانتے ہیں۔ کہ ایک تصویر کا
باریک سا گرا ہُوا پہلو بھی ساری تصویر کو بالکل خراب کر دیتا ہے۔ اور مصوّر کی سخت محنت پر ایک
خفیف سے غلط نقطے کی وجہ سے پانی پھر جاتا ہے +

مرثیہ گو کی محبت اُس کے ہیرو کے ساتھ وصل۔ بوسہ یا کم از کم ایک نگاہ لطف کے لئے نہیں
ہوتی۔ وہ اُس کے ساتھ اس لئے محبت کرتا ہے۔ کہ اُس کو صدق دل سے قابل محبت سمجھتا ہے۔

اور سچی اور بے غرضانہ محبت کی اس سے اچھی دوسری مثال نہیں ہو سکتی - مرثیہ گو کو اپنے پیارے ممدوح کے ساتھ رُوحانی لگاؤ ہوتا ہے - اور اس لئے اُس کے کلام میں جسمانی یا مادّی خط کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا - اور جب لذائذ دُنیویہ سے واسطہ ہی نہیں رکھا جاتا - تو اُس کے پاک اشعار میں بداخلاقی کو داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ملتی - مرثیہ گو کا ممدوح وہ شخص ہوتا ہے - جو اُس کے ایمان کے مُطابق پکا راست باز اور ناراستی کا دشمن ہو - اور ایسے راست باز اور پاکیزہ ہیرو کے اوصاف حمیدہ کا شاعرانہ بیان ناظرین کے دلوں پر قدرتاً ایک اعلےٰ درجہ کا اخلاق بڑھانیوالا اثر پیدا کرتا ہے - آپ کسی سچے شاعر کا مرثیہ پڑھیں - تو آپ کو معلوم ہو گا - کہ اُس کے مرثیہ کا صرف ایک بند کئی واعظوں کے گھنٹوں کی اسپیچوں سے زیادہ عالی جذبات کو اُبھارنے والا اور پُر تاثیر ہوتا ہے - اردو زبان میں مرثیہ گو زیادہ تر مسلمان اور شیعہ مذہب کے لوگ ہوتے ہیں - بعض ہندو اِن کے مرثیوں کو اس لئے رغبت سے نہیں پڑھتے - کہ اُن میں مسلمان بزرگوں کی تعریف ہوتی ہے - اور بعض سُنّیوں کو اُن کے ساتھ اس لئے دلچسپی کم ہوتی ہے - کہ اُن کو ان مرثیوں میں شیعہ اسپرٹ کی جھلک معلوم ہوتی ہے - مَیں ایک ہندو بلکہ آریہ ہوں - لیکن مَیں ہر دو اصحاب مذکور کے طرز خیال کے ساتھ ہمدردی نہیں کر سکتا - میرا خیال یہ ہے - کہ مرثیہ کہنے والا شاعر اپنے دماغ میں راستی اور ناراستی کی جنگ شروع کرتا ہے - جس میں اُس کی فکر رسا راستی کی طرفدار ہوتی ہے - اور ایک اچھے شاعر کا مرثیہ شروع سے اخیر تک پڑھنے کے بعد پڑھنے والے کے دل میں راستی سے رغبت اور ناراستی سے نفرت ضرور پیدا ہو جاتی ہے - ہم قسم مذکور کے اہل ہنود اور اہل سنت و جماعت سے درخواست کرتے ہیں - کہ وہ ایک شیعہ شاعر کا مرثیہ پڑھتے وقت کسی اپنے مذہب کے ایسے بزرگ کا تصوّر باندھ لیا کریں - جو چند ناپاک دل لوگوں کے ظلم سے سخت تکالیف میں مبتلا ہوا ہو - تو اُس وقت اُن کو اس مرثیہ کی اصلی خوبی محسوس ہو سکیگی - اور وہ فوراً معلوم کر لینگے - کہ شاعر نے ایک خاص شخص یا خاص واقعہ کی آڑ میں تمام دُنیا پر حاوی ہونیوالی سچائیوں کا اعلان کیا ہے - ماں اور بہنوں کے سامنے اُن کے بچوں اور بھائیوں کو قتل کرنا اور

پیاسوں کو بوند بوند پانی کے لئے ترسا کر مارنا ایسے ناپاک فعل ہیں۔ کہ اُن سے انسان کو نفرت دلانیوالا شاعر بجائے ظلم و جفا کے نیکی اور محبت کی سلطنت قائم کرنے والا ہیرو کہلانے کا مستحق ہے۔

اس کل داستان کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اردو زبان میں مرثیہ ہی وہ اعلےٰ قسم کی نظم ہے۔ کہ جس کے ذریعے سے ہم اصلی اور نقلی شاعر کا امتحان کر سکتے ہیں۔ یہ مرثئے ہی ہیں۔ جن کی بدولت شاعری کی منشا پوری ہوتی ہے۔ اور جن کے طفیل میں اردو زبان بھی سنسکرت۔ بھاشا اور انگریزی کی طرح مصلح اخلاق اور پیغمبر محبت ہونے کا دعوےٰ کر سکتی ہے۔ ہر فاعل کی فعل سے اور فعل کی اُس کے نتیجے سے عزت ہوتی ہے۔ مرثیوں سے شاعری کی اصلی غرض کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اس لئے اُس کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانا مناسب ہے۔ مرثیہ کی عزت مرثیہ گو کی عزت ہے۔ اور ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم مرثیہ کہنے والے شعرا کو سچّا شاعر سمجھیں۔ اور دُنیا کی نظر میں اُن کا وقار بڑھانے کے لئے جہاں تک ہوسکے کوشش کریں۔ اُن کا اردو اور اردو والوں پر بہت بڑا احسان ہے۔ اور ہم کو چاہئے۔ کہ احسان فراموش نہ ہو کر اُن کی تعظیم کریں۔ اور اُن کا نام روشن کرنے کے لئے دل و جان سے ساعی ہوں۔ یوں تو ہر مرثیہ کہنے والا شاعر قابل عزت ہے۔ لیکن جس قدر اچھے مرثئے کوئی شاعر کہتا ہو۔ اُسی قدر زیادہ تعظیم و تکریم کا وہ مستحق ہے۔

اردو میں مرثیہ کہنے والے پہلے بھی بہت ہوئے ہیں۔ اور اب بھی بہت سے سخنور مرثئے کہتے ہیں۔ لیکن میرزا دبیر کو اس فن کا بادشاہ کہنا نامناسب نہیں ہے۔ اُن کو یکتائے دوران کہنا بھی نازیبا نہیں ہے۔ اگر کسی لڑائی جھگڑے کے خوف سے ایک دوسرے بزرگ کو بھی اُن کا ہمسر مان لیا جائے۔ تو اس میں تو کلام ہی نہیں۔ کہ تیسرا شخص اُن کے پلہ کا پیدا نہیں ہوا۔ اور گو آئندہ کیلئے پیشینگوئی کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ تاہم زمانے کی بدلتی ہوئی ہوا کا رُخ دیکھتے ہوئے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ شاید آئندہ بھی اس قسم کے شاعر کا مُنہ دیکھنا اردو زبان کے نصیب میں نہیں ہے۔

مرزا دبیر اور میر انیس کا مقابلہ ایک پُرانا جھگڑا ہے۔ اس سوال کو طے کرنے کے لئے

دبیریوں اور انیسیوں کی بڑی بڑی جنگ ہوچکی ہیں۔ کئی کتابیں لکھی گئیں۔ کئی مناظرے ہوئی
مولانا شبلی صاحب سے جید عالموں نے اس موازنہ کے مشکل کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور بہتوں کی
نگاہ میں پورا تولنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اعتدال پسندوں کی رائے یہ ہے۔ کہ
دونوں کا مقابلہ کرنا ہی فضول ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں فرد تھا۔ ہم بھی ان اعتدال پسندوں
کی رائے کو ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں۔ کہ اس پتھریلے میدان میں قدم نہ
بڑھائیں۔ مگر جی نہیں مانتا۔ دل میں ایک گدگدی سی اٹھتی ہے۔ طبیعت چاہتی ہے۔ کہ کسی کے
کہنے سننے کی پروا نہ کرتے ہوئے کچھ کر ڈالیں۔ ہم نے بھی فارسی اردو پڑھی ہے۔ اور خاندان
کے رواج کے مطابق ایسی بری بھی نہیں پڑھی بقول شخصے "کو دوں دیکر نہیں پڑھا"۔ اور نہ مولویوں کو
صرف اچار یا حمصراتی دے کر ٹرکاتے رہے ہیں۔ دونوں کاملوں کے کلام کا بہت کچھ حصہ
دیکھا ہے۔ اُن کی بابت ہماری رائے بھی آپ سے آپ قائم ہوگئی ہے۔ خدا جانتا ہے۔
کہ ہم دبیرئے ہیں نہ انیسئے۔ اُردو کے پانچویں سواروں میں ہمارا شمار بھی نہیں ہے۔ ہماری
رائے ایک نوجوان ناتجربہ کار شخص کی رائے ہے۔ اس لئے اگر کسی کو ہم سے اختلاف ہو۔ تو معافی
چاہتے ہیں۔ ہم کو نہ لڑنے کی آرزو ہے نہ جھگڑنے کی فرصت۔

ہماری رائے میں مرزا دبیر مرحوم کو فارسی و عربی کی لیاقت میر انیس مغفور سے زیادہ تھی۔
مرزا صاحب ان زبانوں کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اور اس خوبی سے استعمال کرتے
ہیں۔ کہ خلاف فصاحت نہیں ہوتا۔ ہر لفظ کو نہایت موزون جگہ دی جاتی ہے۔ اور اہل مطالعہ کو نہایت
غور کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ لفظ اپنی جگہ پر بالکل ضروری تھا۔ اور اُس سے بہتر لفظ کی تلاش
ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب کے یہاں فارسی و عربی کی کمی نہیں ہے۔ اُن کے یہاں الفاظ کا کافی
ذخیرہ موجود ہے۔ میر صاحب کے یہاں ان کی کمی کبھی کبھی محسوس ہوتی ہے۔ میر صاحب اکثر مقامات
پر نہایت معمولی الفاظ سے ہی کام نکال لیتے ہیں۔ حالانکہ اُس سے بہتر لفظ مل جانا ماہر زبان کیلئے
مشکل نہیں کہا جاسکتا۔ معمولی الفاظ سے ہماری مراد سیدھے اور چھوٹے الفاظ سے نہیں ہے۔

سے ہے اور چھوٹے الفاظ کا استعمال کرنا ہمارے نزدیک داخل فصاحت ہے۔ معمولی الفاظ سے ہماری مُراد اُن الفاظ سے ہے۔ جو متکلّم کے مطلب کو پُورے طور سے ادا نہیں کر سکتے۔ اور جن کے مقابلے میں زبان میں اور ایسے الفاظ موجود ہیں۔ جو مطلب مذکورہ کے ادا کرنے کی پُوری قدرت رکھتے ہیں +

مرزا صاحب کی معلومات اور علوم مختلفہ سے واقفیت میر صاحب کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ مرزا صاحب کے کلام سے بہت سے تاریخی واقعات اور علوم کے اصول فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ جن کا میر صاحب کے یہاں تلاش کرنا بے سود ہے +

میر صاحب کا کلام صرف فصیح ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں فصاحت اور بلاغت دونوں کی کمی نہیں ہے۔ "بہت لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ مرزا صاحب ضرورت سے زیادہ بلیغ اور اس لئے ٹھس تھے۔ میر صاحب کے کلام کی سی روانی ان کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی۔" ان اصحاب کی گفتگو سراسر غلط ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں سے بیسیوں مرثئے اور ہزاروں بند ایسے اخذ کی جا سکتے ہیں۔ کہ جن کا ثانی بلحاظ فصاحت بھی میر صاحب کے یہاں نکلنا مشکل ہے۔ افسوس کہ طوالت سے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ ہر دعوے کی تائید میں اس موقع پر (ثبوت کے) ڈھیر لگا دئے جاتے۔ حیات دبیرؔ میں ایسے بند ناظرین انصاف پسند خود مطالعہ فرما کر ہمارے کلام کی تصدیق کریں +

مرزا صاحب کے مزاج میں استقلال اور سنجیدگی زیادہ تھی۔ اس لئے اُن کا کلام میر صاحب کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور گہرا ہے۔ اس سنجیدگی اور گہرائی میں اگر نقص ہے تو یہ ہے۔ کہ عوام کو مرزا صاحب کا بعض کلام بدمزہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ مرزا صاحب کا قصور نہیں۔ اس کا الزام جہالت کی گردن پر ہے +

نارنگی اور انار دونوں ہی خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایک بچّے کے سامنے ایک انار اور ایک نارنگی رکھ کر اُس کو مجبور کریں۔ کہ وہ دونوں میں سے صرف ایک کو لے لے۔ تو بچّے دونوں کو

مزہ دار سمجھتا ہو اور دونوں کو ہی لینے کی آمادگی ظاہر کریگا۔ لیکن انتہائے مجبوری پر وہ دونوں میں سے اُس ایک کو لے لیگا۔ جسے وہ اپنے خیال میں زیادہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی ہمارا حال ہے۔ ہم میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے کلام کو مزہ دار سمجھتے ہیں۔ لیکن بچّے مذکور کی طرح ایک کو ہی قبول کرنے کے لئے مجبور ہونے پر ہم **مرزا صاحب کے کلام کو ہی گھول کر پی جائیں گے**+

مرزا صاحب کا کلام ہماری مقرر کی ہوئی کسوٹی پر پرکھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مرزا صاحب واقعی سچّے شاعر تھے۔ وہ شاعری کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ چونکہ ہر اصلی شاعر کا مشن یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ دُنیا میں اخلاق کو ترقی دے۔ اس لئے وہ دُوسرے واقعات کے پیرایہ میں اپنے وقت کی بھلائیوں اور برائیوں کے نغمے سُنایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب کے زمانے میں بھی آج کل کی طرح سچی دینداری کی جگہ ریاکاری کا بہت زور تھا۔ اور وہ اُس سے متنفر تھے۔ اور اُس کی مذمت اس طرح فرماتے ہیں۔ ؎

(۱) نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں　　تردامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

مرزا صاحب چاہتے ہیں۔ کہ انسان اپنے گناہوں سے پشیمان ہو کر خدا سے معافی کا خواستگار ہو۔ (فرماتے ہیں):-

(۲) رباعی

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں　　مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں

چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل　　تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

(۳) مرزا صاحب ایک مصلح اخلاق کی حیثیت میں اپنے ہم جنسوں میں صبر و قناعت اور وضعداری اور بیکسوں اور مفلسوں سے ہمدردی کا مادہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جناب ہمدردی حضرت امام حسینؑ کی زبان سے اُن کی چار برس کی بیٹی سکینہؑ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ ؎

سینے پہ مرے سو چکیں اب خاک پہ سونا　　آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا*

گو قہر ہے اس سن میں جدا باپ سے ہونا　　لاشہ مرا تڑپیگا۔ بہت مجھ کو نہ رونا

گر چاہو مری رُوح ہو ناشاد سکینہ!!　　تو غم میں۔ مرے۔ کیجیو فریاد۔ سکینہ!!

* (نہج البلاغہ میں) جناب امیرؑ نے زہاد کو تنبیہ فرماتے ہوئے فرمایا۔ کہ خدا نے ائمہ حق اور پیشوایان عادل پر فرض کر دیا ہے۔ کہ وہ ضعیف، محتاج آدمیوں کی حالت سے اپنے نفس پر سختیاں کریں۔ تاکہ فقیر کا فقر اور محتاج کی محتاجی و مفلسی اُسکو مضطرب نہ کرے۔ یہ مصرع خاص اسی شیوۂ اہل بیت کی خبر دے رہا ہے۔ ایثار و بخشش و کرم کی یہ معراج کمال ہے ۱۲+ مؤلف حقیر۔

(۴) اسی طرح جب شمر ابن ذی الجوشن حضرت امام حسینؑ کے بھانجوں کو اپنی فوج کے علمدار بنانے کا لالچ دے کر اُن کو حضرت ممدوح کے خلاف باغی بنانا چاہتا ہے۔ تو وہ چھوٹے چھوٹے بچے کیا خوب جواب دیتے ہیں۔ جس سے انتہا کی قناعت اور دلیری و وضعداری ٹپکتی ہے۔ اس موقع کے متعلق مرزا صاحب کے یہ بند ہیں:-

نعرہ کیا علیؑ کے نواسوں نے یک بیک — بس بس زیادہ مُنہ سے نہ اب واہیات بک
چپ نابکار چپ۔ سگ او بے ادب سگ — یہ شور و شر بند۔ بخدا۔ کانپ اٹھے فلک
بہکا نہیں۔ خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں — یہ اُن سے کہہ۔ شقی۔ جو تجھے جانتے نہ ہوں

ہمدوش حمزہؓ۔ حیدرؑ کرار تھے؟ نہ تھے — روزِ احد نبیؐ کے علمدار تھے؟ نہ تھے
عباسؑ اس علم کے سزاوار تھے؟ نہ تھے — شاہ نجفؑ کے یہ دُرِ شہوار تھے؟ نہ تھے
توبہ۔ خدا۔ ہم اس پہ امام ہُدا سے ہوں — بیٹے کے ہوتے۔ نانا کے وارث نواسے ہوں

انبار سیم و زر کے جو اہلِ درم لگائیں — بھولے سے ہم نہ ہات۔ خدا کی قسم۔ لگائیں
آنکھوں میں شہ کا سُرمہ خاک قدم لگائیں — پارس کے بھی پہاڑ کو ٹھوکر نہ ہم لگائیں
سب نے زباں سے آب و غذا کا مزا لیا — ہم نے فقط زباں سے۔ نام خدا۔ لیا

(۵) مرزا صاحب محبت کے دلدادہ تھے۔ وہ اہلِ محبت کی نہایت قدر کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عباسؑ علمدار کی اُلفت کی بابت فرماتے ہیں۔ سہ

جس دن تلک آباد یہ ویرانہ رہیگا — عباسؑ کی اُلفت کا بھی افسانہ رہیگا

مرزا صاحب کا کلام ایسے ایسے اخلاق کی درستی کرنے والے اور محبت کی ترقی کے موجب خیالات کا کبھی خالی نہ ہونے والا خزانہ ہے۔ اگر مرزا کا کلام بغور پڑھا جائے۔ تو یقینی طور پر معلوم ہوگا۔ کہ انہوں نے اہل عالم کے جذبات کو پاک بنانے کے لئے اپنی بیش قیمت زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ انسانی جماعت کو نیک اور پاکیزہ خیال بنانے کے لئے اس دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اسی لئے سچے اور اعلیٰ شاعر تھے

مرزا صاحب کے نیچرل شاعر ہونے کا بڑا بھاری ثبوت یہ بھی ہے۔ کہ اُن کے اور اُن کے ساتھی

میر انیس مرحوم کے بعد دوسرے شاعروں کو مرثیہ کہنے کی کافی جرأت نہیں ہوتی۔ گویا مرثیہ گوئی بھی ان عالی دماغ بزرگوں کے ساتھ ہی عدم کو چلی گئی۔ ہمارا یہ خیال ایمان کے درجے تک پہنچا ہوا ہے کہ جب تک خدا کو منظور نہ ہوگا۔ کہ انسان کی بھلائی کے لئے اردو زبان کو بھی وسیلہ بنایا جائے۔ دبیر یا انیس ثانی پیدا نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہم کتنے بُرے آدمی ہیں۔ اردو بولنے والی قوم کس قدر محسن کُش ہے۔ کہ اُس کی زبان پر بلکہ اُس کی جان پر اس قدر احسانات کرنے والے اخلاق و محبت کے پیغمبر کی سوانح عمری لکھنے کی کسی کو فکر نہ ہوئی۔ ہمارا ارادہ تھا۔ کہ دبیر سے کامل بزرگ کا نام تک دُنیا سے مٹ جائے۔ خدا عادل ہے۔ اُس کو ہمارے ناپاک ارادے کی تائید منظور نہ تھی۔ اور اُس نے ہمارے دوست صادق مولانا سیّد افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی کے دل میں جو ایک اعلےٰ درجہ کے عالم، شاعر اور مرثیہ گو ہونے کے علاوہ عالی جناب مرزا اوج صاحب خلف الصدق مرزا صاحب مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اس ضروری کام کی طرف شوق پیدا کیا۔ اور اُسی کے فضل و کرم سے حیات دبیر تکمیل کو پہنچی۔ حیات دبیر اردو زبان میں لکھی ہوئی اردو شعرا کی سوانح عمریوں میں یکتا سمجھی جائیگی۔ کیونکہ اوّل تو یہ ایک لاثانی شاعر اور کامل پاک باطن کی زندگی کے حالات سے معمور ہے۔ دوئم اس کی تکمیل کے لئے ایک تعجب میں ڈالنے والا معلومات کا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔ یہ حیات (لائف) مرزا صاحب مرحوم کی ایک سچی تصویر ہے۔ اور اس میں اُن تمام بے جا اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو مرزا صاحب اور اُن کی شاعری پر کم فہمی یا کسی اور سبب سے اُٹھائے گئے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں۔ کہ یہ سوانح عمری مصلح اخلاق حامی محبت دبیر کے نام سے دُنیا میں اخلاق اور محبت کو ترقی دینے کی موجب ثابت ہوگی۔ اور اُس کے نیک دل مصنّف کو دارین کا ثواب حاصل ہوگا۔

ہمارا بہت دنوں سے یہ ارادہ ہے۔ کہ اردو شاعری کے متعلق ایک فلسفیانہ رسالہ تحریر کریں جس میں اردو شاعری کے باطنی پہلو کو دکھاتے ہوئے اُن تمام الزامات کا جواب دیں۔ جو شاعری کے فلسفہ سے ناواقف لوگوں نے اس کے ماتھے لگا رکھے ہیں۔ جن اصول پر کتاب مذکور لکھی جائیگی۔ اُس کی کچھ جھلک اس تقریظ میں دکھا دی گئی ہے۔ اگر حیات دبیر کی بدولت ہمارے یہ خیالات پبلک کی

خدمت میں حاضر ہوکر دلچسپی حاصل کرینگے - تو ہم کو کتاب مذکور کے لکھنے کے لئے دونا بلکہ سوگنا حوصلہ حاصل ہوگا + جناب مولوی افضل حسین صاحب ثابت رضوی نے یہ اعلےٰ درجہ کی کتاب لکھکر اپنا کام کردیا ہے - ہمارا کام باقی ہے - اور وہ یہ ہے - کہ مولانا ممدوح کے کام کی قدر کریں - دیکھیں - ہم اپنے فرض سے سُبک دوش ہوتے ہیں یا نہیں - خداوندا! یہ اچھی کتاب مقبول عام و خاص ہو +

ہیرالال - سود - شیدا - اکبرآبادی

۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء - مقام کوٹہ - راجپوتانہ

تقریظ عالم علوم فارسی و انگریزی جناب مستطاب منشی ہیرالال صاحب بی - اے - ایل - ایل - بی - جوڈیشل سکرٹری محکمہ عالیہ خاص حضور دربار بہادر دام اقبالہ (ریاست کوٹہ - راجپوتانہ)

حکیموں کا قول ہے - کہ کائنات کا مشاہد ہر قسم کا کمال حاصل کرسکتا ہے - بشرطیکہ قدرت نے اُسکو خاص آنکھ اور خاص دل و دماغ عطا کیا ہو - کہ جس سے وہ مشاہدات کے دیکھنے اور اُن کے سبب دریافت کرنے ... سمجھنے میں غلطی نہ کھاوے - اس مقولہ کو مدنظر رکھتے ہونے کارلائل نے جو انگلستان کا ایک مشہور فاضل ادب (لٹریچر) ہے - اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو وَرشپ (Heroes and Hero worship) میں ریفارمر جنگجو - نبی اللہ اور شاعر کو مشاہد (Seer) کا لقب دیا ہے - اور مشرح طور پر سمجھایا ہے - کہ اِن لوگوں میں اور عام لوگوں میں فرق یہ ہے - کہ یہ لوگ نیچر کی ماہیت کو سمجھنے والے اور جاننے والے ہوتے ہیں - اور عام لوگ اس فیض سے بے بہرہ - پس اس میں شک نہیں ہے - کہ کائنات ایک ایسی کتاب ہے - کہ جس کا پڑھنے والا خواہ وہ کسی مذاق اور طبیعت کا ہو - اپنے مذاق اور طبیعت کے موافق شے مطلوبہ کو پاتا

چلا جاتا ہے۔ اور جس قدر اس کتاب کے دیکھنے میں جانفشانی کرتا ہے۔ اُسی قدر اُس پر اسرار نہانی ہویدا
ہوتے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کی ترقیاں سب اس کی شاہد ہیں۔ ہوائی جہاز۔ مختلف قسم کے
آلات حرب۔ نئے ستارے اور سیاروں کی معلومات۔ ایکس رے (X. Ray - ایک قسم کی
چمکدار مٹی جس کے استعمال سے جذام تک اچھا ہو جاتا ہے۔ اور دیگر مختلف
قسم کے امراض کا یقینی دفعیہ ہوتا ہے) وغیرہ وغیرہ سب اسی کتاب کے چھوٹے چھوٹے نسخے
ہیں۔ کہ جن کو مشاہدان نے سرورق کتاب سے پڑھ کر عوام پر ظاہر کیا ہے۔ مگر جیسا کہ شروع
میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر کس و ناکس اس کتاب نیچر کے پڑھنے اور سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔
اور جو لوگ اس کتاب کے پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اُن کو قدرت خاص طور
پر اور ایسی خاص خاص قوتوں کے ساتھ پیدا کرتی ہے۔ کہ جو عام لوگوں میں نہیں پائی جاتیں۔
اور اس میں خلاق عالم کی عین مصلحت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ع گو ہمہ شب شب قدر بودے۔
شب قدر نیز بے قدر بودے۔ چنانچہ ہیروز (Heroes) کی تعظیم و تکریم اور اُن کی وقعت
کرنا ہر قوم و ملت و ملک نے فرض عین قرار دیا ہے +

یوں تو ہر قسم کے مشاہد اور موجد کی تعظیم کرنا فرض انسانی ہے۔ کیونکہ اس دُنیا میں مختلف
قسم کی روشنیاں اور ترقیاں اُن کے نفس نفیس اور ذات پاک کے ذریعہ سے ظہور میں آئی ہیں
اور وہ بنی نوع انسان کے اعلیٰ درجہ کے محسن ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اِن بزرگان
علم و فن میں سے وہ کونسے ہیں۔ کہ جن کا تعلق عظیم ذات انسان سے ہے۔ اور جو انسانی
طرز معاشرت۔ تعلقات باہمی۔ علم و ادب۔ رسم و رواج۔ خیالات دینی و دنیوی کے بانی
اور موجد و مصلح ہیں۔ کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے۔ کہ انسان مثل حیوانات کے اُن طریقوں۔
جذبات اور حرکات کا ہرگز پابند نہیں ہے۔ کہ جو قدرت نے وقت پیدائش اُس کو عطا
کئے ہیں۔ بلکہ خلاف اُس کے اُس کی حرکات وغیرہ یک گونہ خود حاصل کردہ ہیں۔
یا اُن اثرات سے متاثر ہو کر پیدا ہوئے ہیں۔ جو اُس پر سوسائٹی۔ تمدن۔ ملکی و قومی تہذیب وغیرہ

منے قائل ہیں ٭

پس ان سب امور پر نظر کرتے ہوئے ماننا پڑیگا۔ کہ وہ ہیرو جس کا بڑا تعلق انسان سے ہے۔ ریفارمر یا نبی ہے۔ اور اس کے ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ دُنیا کے مختلف طبقوں کے انسان (باستثناء اُن کے جو غیر مذہب ہیں۔ اور وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں) کسی نہ کسی ریفارمر کے اصول کے پابند ہیں۔ حالانکہ اُس ریفارمر کو مرے ہوئے صدہا بلکہ ہزارہا برس ہو چکے ہیں۔ مگر اُس کے قول اور فعل۔ وعظ اور الہام نے انسانوں کے دل پر ایسا سکہ بٹھایا ہے۔ کہ جس کو وہ پُشت ہا پُشت تک نہیں بھول سکتے۔ اور اپنے جملہ تعلقات زندگی میں اپنے مقبولہ ریفارمر کے اُصول کو مد نظر رکھتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں لیکن "ریفارمر" کی فضیلت۔ اُس کے احسانات۔ رہنمائی وغیرہ کا ذکر کرنا اس مضمون کے احاطہ سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ ایک وسیع مضمون ہے۔ کہ جس کے لئے فرصت اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ جو بدقسمتی سے راقم کے پاس دونوں نہیں ہیں ٭

ریفارمر کے بعد قابل قدر اور واجب التعظیم ہیرو شاعر قرار پاتا ہے۔ کیونکہ شاعر کا کلام انسان کی آئندہ تہذیب و لٹریچر و طریق معاشرت پر اثر ڈالنے والا و زمانہ سابقہ کی لٹریچر۔ عادات۔ افعال۔ طبیعت اور مذاق کا چمکدار آئینہ ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یُوں کہنا چاہئے۔ کہ ہر خطۂ زمین و ہر زبان کے شاعر کے کلام کا اُس خطہ کے باشندگان اور زباندانوں پر ایسا زبردست اثر پڑتا ہے۔ کہ اُن کی نقل و حرکات اور لٹریچر اور مذاق طبیعت اُس کے جادو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح اگر زمانہ سابقہ کی کسی قوم کے حالات اُن کی تہذیب طریق عمل اور آپس کے برتاؤ کا پتہ لگانا ہو۔ تو اُس قوم کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ ان سب امور پر ضرور روشنی ڈالیگا۔ اور مطالعہ کرنے والے کو اس ذریعہ سے وہ تحقیقات حاصل ہونگی۔ کہ جن کے اظہار کے لئے تواریخ بالکل قاصر ہیں۔ یہ بات کہ شاعر کے کلام کا انسان پر کیوں اس قدر اثر پڑتا ہے محتاج بیان نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ شاعر مثل

مصوروں کے ہر قسم کے سین (scene) پیشکش (انسان) کرتا ہے۔ اور وہ بھی اس طریق سے کہ
انسان کی آنکھ اُس کے دیکھنے سے کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اور آنکھ کے ساتھ دل و دماغ انسان بھی
دلکش نظارہ سے مزہ اُٹھاتے ہیں۔ شاعر کا کام مصور سے کہیں بڑھا چڑھا ہوتا ہے۔ اور
گو اچھے مصور کی بنائی ہوئی تصویر بھی دیکھنے والے کو محو نظارہ کر لیتی ہے۔ مگر جوں ہی کہ دیکھنے والا
تصویر کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے۔ تصویر کے نقش اُس کے دل و دماغ میں پھیکے ہوتے چلے
جاتے ہیں۔ حتےٰ کہ کچھ عرصہ بعد دل و دماغ پر کچھ اثر نہیں رہتا۔ اس کے سوا مصور کی کھینچی ہوئی تصویر
صرف ظاہری مادی حالت کو ظاہر کرتی ہے۔ اور اندرونی حالات اُس سے سراسر پوشیدہ رہتے
ہیں۔ برعکس اس کے شاعر کے کھینچے ہوئے فوٹو کا اثر گو آنکھ پر نہ ہو۔ مگر دل و دماغ انسان پر اُس کا
ایسا عکس پڑتا ہے اور جاگزیں ہو جاتا ہے۔ کہ انسان کی کوشش سے بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔
پھر مصور کی تصویر کی طرح کامل شاعر کی کھینچی ہوئی تصویر ناقص نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُس میں ظاہری اور
اندرونی حالات دونوں فصاحت کے ساتھ دکھلائے جاتے ہیں۔ یعنی یہ کہ مصور اگر کسی انسان
کی تصویر کھینچے۔ تو وہ اُس انسان کی جسمانی کیفیت اور پارچہ پوشیدنی کی رنگت کے اظہار کے
سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر شاعر اُس انسان کے حرکات۔ عادات۔ اخلاق۔ مذاق اور جذبات
کا پورا چربہ اُتار لیتا ہے۔ شاعر کی کھینچی ہوئی تصویر کے با اثر ہونے کی ایک وجہ موجّہ یہ بھی ہے۔ کہ
شاعر تصویر کے کھینچنے میں الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اور چونکہ انسان حیوان سے استعمال نطق"
کی وجہ سے ممتاز ہے۔ کہ تمام حیوانوں میں فقط انسان ہی ناطق ہے۔ اس لئے کلام شاعر کا اثر
خصوصیت کے ساتھ قلب انسان پر پڑتا ہے۔ اور پشت ہا پشت بلکہ صدیوں اور ہزار ہا برس
تک قائم رہتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ ایران کو ایک نظم سنا کر سفر سے واپس لے آنا۔ بخیل اور
وعدہ شکن سلطان کو ایک ہجو کہکر موعودہ انعام ادا کرنے پر آمادہ کر دینا۔ حکمرانان ہند کو
چند اشعار سنا کر جنگ اور صلح پر مستعد کر لینا۔ سامعین کے دلوں میں ایک مجلس اور ایک
وقت میں مرثیہ۔ سلام۔ قصیدہ۔ رباعیات وغیرہ پڑھ کر مختلف قسم کے اثر رنج اور خوشی کے

ڈالن ایشیائی شاعروں کے ایسے کرشمے ہیں۔ جن کی صراحت کی ضرورت نہیں ہے +

یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچا ہؤا ہے۔ کہ شاعر ہر ملک اور ہر قوم کے لٹریچر کی رُوح رواں ہوتے ہیں۔ اور ہر قوم کے لٹریچر کی افزایش اُس قوم کے شاعروں پر منحصر ہوتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ اور تواریخ اس کی گواہی دیتی ہے۔ کہ ہر ترقی کرنے والی زبان میں اعلےٰ درجہ اور پایہ کے شاعر پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر جس وقت کسی زبان کی ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ یا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ تو اُس وقت شاعروں کی کمی قدرتًا ہو جاتی ہے +

دیکھنا یہ ہے۔ کہ شاعر کون کہے جانے کے قابل ہے۔ اور شاعر میں کیا کیا صفات ہونی چاہئیں۔ میرے خیال میں سب سے اوّل ۱ شاعر کو پورے طور پر زبان دان ہونا چاہئے۔ دویم جس ملک اور قوم میں وہ پیدا ہؤا ہے۔ اور جس ملک اور قوم کے وہ حالات درج کرتا ہے۔ اُس کے مختلف رسم و رواج اور طرز و طریق سے واقف ہونا چاہئے۔ سویم ۳ انسان کے جذبات خیالات۔ توہمات کا پُورا ماہر ہونا چاہئے۔ چہارم ۴ موزون طبع ہونا چاہئے۔ پنجم ۵ صاحب علم ہونا چاہئے۔ ششم ۶ قدرتًا شاعرانہ دل و دماغ رکھنے والا ہونا چاہئے۔ کیونکہ مثل مشہور ہے۔ "شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ بنائے نہیں جا سکتے" (Poets are born, not made) +

پس اِن چھ صفات مذکورہ بالا کی رو سے جو شاعر کے لئے ستّہ ضروریہ ہیں آگے اس امر پر بحث کی جائیگی۔ کہ فاضل اجل عالم متبحر جناب مرزا سلامت علی صاحب دبیر لکھنوی مرحوم و مغفور کس درجہ اور پایہ کے شاعر تھے۔ کیونکہ مخدومی جناب مولانا سید افضل حسین صاحب رضوی ثابت لکھنوی نے برسوں جانکاہ محنت کر کے حیات دبیر مرتب کی ہے۔ اور مجھ سے صاحب موصوف کی فرمایش ہے۔ کہ مرزا صاحب مرحوم و مغفور کے متعلق ایک مضمون لکھا جائے۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں (باوجودیکہ مجھ بے بضاعت کا ایسے معاملات میں لکھنے کو قلم اُٹھانا ایک ہنسی کی بات ہے) یہ مضمون لکھا گیا ہے +

(۱) مرزا صاحب کا زباندان ہونا مقبول عوام وخواص ہے۔ اور مرزا صاحب کی زباندانی کا پورا پتہ
اُن کے کلام سے ملتا ہے۔ مرزا صاحب نے مرد۔ عورت۔ بادشاہ۔ فقیر۔ شہری دہقانی۔ بوڑھے۔
بچے۔ فاضل۔ جاہل۔ خادم۔ بازاری وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کے حالات نظم فرمائے ہیں۔ اور خوبی
یہ ہے۔ کہ ان لوگوں کی زبان کو سر مو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اگر کسی بچے کی گفتگو کا موقع ہے۔ تو بچے
کی زبان کا پاس رکھا ہے۔ پیارے پیارے اور دلکش لفظوں کو استعمال کیا ہے۔ بہادر جوان کی گفتگو
نقل کرتے وقت زبان پُرجوش استعمال کی ہے۔ نوکروں۔ غلاموں۔ دہقانوں اور جاہل سپاہیوں
کی زبان ہو بہو اُسی قدر شرفاء کی زبان سے گری ہوئی کام میں لائی گئی ہے۔ جیسی کہ فی الواقع ہوتی ہے۔
غرضیکہ جس پایہ اور فن کے آدمی کا فوٹو اُتارا ہے۔ اُس کی زبان ویسی ہی باندھی ہے۔ مرزا صاحب کی نظم میں
کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا۔ جس کو اردو سے گرا ہوا کہا جاسکے۔ بلکہ کہنا پڑیگا۔ کہ مرزا صاحب کی زبان ٹکسالی
ہے۔ اور ہر طالب علم کو مرزا صاحب کی نظموں سے اردو زبان سیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ جو کہا
جاتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی زبان عام فہم نہیں ہوتی۔ غلط ہے۔ مرزا صاحب نے ضرور کہیں کہیں
فارسی اور عربی کے سخت لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ مگر وہ استعمال ضرورت کے موافق اور ضروری
ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ مرزا صاحب کو اردو کے لفظ نہ ملے۔ تو عربی فارسی کے لفظ استعمال
کر ڈالے۔ کیونکہ بہت سا کلام مرزا صاحب کا (مندرجہ حیات دبیر و موجودہ دفتر ماتم) اس قدر
سلیس ہے۔ کہ جو خود اپنی نظیر ہے۔ اور جس کی نقل کرنا اگر غیر ممکن نہیں۔ تو سخت مشکل ضرور ہے۔
یہ مرزا صاحب ہی کا حوصلہ اور کام ہے۔ کہ ہر قسم کا کلام سلیس سے سلیس اور دقیق سے دقیق
اُنہوں نے بڑی خوبی سے کہا ہے۔ ورنہ ہر شاعر ایک نہ ایک ایسا پہلو اختیار کر لیتا ہے۔ کہ جس سے
وہ مشکل سے ہٹ سکتا ہے۔ یعنی سہل گو شاعروں سے ادق الفاظ کا استعمال اگر وہ چاہیں۔ تو بھی
نہیں ہوسکتا۔ اور ادق اور مشکل گو شاعروں سے سہل گوئی قریبًا ناممکن ہوتی ہے۔ مگر مرزا صاحب
کے پاس ہر قسم کے الفاظ کا اس قدر ذخیرہ ہے۔ کہ ہر مذاق اور طبیعت کے آدمی کو اُس کی خواہش کے
موافق بڑی بہتات کے ساتھ اُن کا کلام آسانی سے مل سکتا ہے۔ پس جو شاعر صرف ایک ہی رنگ

کی کلام گوئی میں مشاق ہیں۔ اُن کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ زبان پر تمام وکمال حاوی نہیں ہیں۔ مگر مرزا صاحب کے لئے ایسا کہنا محض اتہام لگانا ہے + نتیجہ یہ نکلا کہ زبان اردو پر جس قدر مرزا صاحب کو قدرت ہے۔ دُوسرے شاعر کو نہیں معلوم ہوتی +

(۲) مرزا صاحب کی ہندوستان اور عربستان کے طرز وطریق اور رسم ورواج سے واقفیت بھی مسلمہ امر ہے۔ اور یہ واقفیت اُن کی نکاح۔ پیدائش۔ موت وجنازہ۔ جنگ۔ دعوت۔ تعظیم بزرگان اور پردہ نشین خاتونوں کی سواری۔ سفر وحضر کے حالات سے جو اُنہوں نے درج فرمائی ہیں۔ سراسر ظاہر ہوتی ہے۔ مرزا صاحب نے عرب کے سیدھے سادے نکاح۔ جنازہ کی خاموشی اور صبر کے ساتھ طیاری۔ مبارزان جنگ کی رجز خوانی۔ خاتونوں کی سواری کے وقت پردہ داری کے اہتمام کو اُن کے طریق اور رسم ورواج کے موافق قلمبند فرمایا ہے۔ جو بعد وفات بانی اسلام عربستان یا ہندوستان میں جاری تھے۔ اور ایسا کرنے سے مرزا صاحب کے کلام کا اثر اور اُس کی خوبصورتی دو بالا ہو گئی ہے۔ اور سامعین یا مطالعہ کنندہ کی نگاہ کے سامنے اِن واقعات کے سُننے یا پڑھنے سے زمانہ سلف کے عربستان اور اُس کے باشندگان کا آنکھوں میں سچّا فوٹو پھر جاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ کے لئے وہ اپنے آپ کو ناظرین معرکہ کربلا اور دیگر واقعات کا سمجھنے لگتے ہیں +

مرزا صاحب کے شاعر بے مثل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔ کہ اُنہوں نے کسی سانحہ یا حال کو اصلیت اور سچائی سے گرا ہُوا نہیں باندھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اُن کا کلام اس قدر مقبول اور دلکش ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ اگر کوئی شاعر کسی عرب کی شادی کا سماں باندھے۔ اور خلاف دستور عرب عیسائیوں کی شادی کا ڈھنگ اُس شادی میں نمایاں کرے۔ تو اُس کی نظم گو بندش الفاظ اور دیگر شاعرانہ خوبیوں سے پُر ہو۔ مگر سچائی سے گرے ہُوئے ہونے کی وجہ سے سامعین کے دل پر کچھ اثر نہ کر سکیگی +

(۳) مرزا صاحب کا جذبات۔ خیالات۔ توہمات انسانی کا ماہر ہونا۔ مرزا صاحب کے نیچر انسانی پر قادر ہونے کی مثالیں اُن کے کلام میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ مرزا صاحب نے سفر عراق کے وقت دختر مریض کو گھر چھوڑ جانے پر اُس کے تنہا رہنے کے خیالات۔ باپ ماں اور بھائی بہن کے

اُس سے جُدا ہونے پر دلی صدمات ۔ بیمار بہن کے اپنے ننھے سفر میں جانے والے بھائی کے لئے
اظہار محبت و رنج ۔ والدہ سے نوجوان بیٹے کے جنگ میں جانے کے لئے اجازت چاہنے پر مادری
اندیشوں و دلی وسوسوں ۔ زندان کی مصیبتوں میں کم سن بچوں کی گھبراہٹ اور خواہشیں ۔ اور بزرگوں
کے تفکرات وغیرہ وغیرہ انسانی نیچر کو اس متانت ۔ آہستگی اور سچائی کے ساتھ دکھلایا ہے گویا انسانی
دل کو ناظرین کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے ۔ اور یہ مرزا صاحب کی اعلیٰ درجہ کی فضیلت ہے ۔ جو
دوسرے ہندوستانی شاعروں کو مشکل سے حاصل ہو سکتی ہے +

شعراء یورپ کو شعراء ایشیاء پر ترجیح اس وجہ سے دی جاتی ہے ۔ کہ شعراء ایشیا عام طور
پر مثل شعراء یورپ کے انسانی نیچر کو بیان نہیں کر سکتے ۔ شعراء ایشیاء صرف بندش الفاظ ۔ سلاست
زبان ۔ حسن بیان اور دیگر مضامین وعظ و خط پرستی پر اکثر اکتفا کرتے ہیں ۔ اور گو وہ باغ ۔ پہاڑ ۔
میدان ۔ جنگل ۔ خلوت ۔ جلوت ۔ رزمگاہ وغیرہ کے سین بھی کامیابی کے ساتھ کھینچ لیں ۔ مگر انسانی
نیچر کا فوٹو اُتارنا اُن کی مقدرت سے بالکل باہر ہوتا ہے ۔ مگر یہ اعتراض مرزا صاحب پر عائد نہیں ہو سکتا ۔
مرزا صاحب نے انصاف تو یوں ہے کہ اپنے کمال میں شعراء یورپ کو سراسر مات کر دیا ہے ۔ مرزا صاحب
نے ایشیائی طریق شاعری یعنی بندش الفاظ و خوبصورتی زبان و پابندی قواعد و عروض کو ملحوظ رکھتے ہوئے
نیچر انسان کو اس طرح بیان کیا ہے ۔ کہ شعراء یورپ سے جس کا جواب ہونا مشکل ہے گویا مرزا صاحب کے
کلام میں دو نا لطف موجود ہے ۔ ایک لطافت زبان اور دوسرے نزاکت مضامین ۔ پھر مرزا صاحب
کے کلام میں ہر قسم کے انسان کے نیچر کو پورے طور پر دکھلایا گیا ہے ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ انسانی
نیچر کے اظہار پر مرزا صاحب پورے قادر ہیں ۔ اور مثل اکثر شعراء یورپ کے مرزا صاحب کو عورت
یا بچے وغیرہ کے دل و دماغ کے خاکہ اُتارنے میں کوئی مجبوری عائد نہیں ہوتی ۔ جہاں جس کی زبان سے
وہ کوئی خیال ادا کرتے ہیں ۔ اُسی کے مناسب حال ہوتا ہے +

(۴) موزونیت طبع مرزا صاحب پر ختم ہے ۔ مرزا صاحب نے معمولی آدمیوں کی فرمائش
پر گھنٹوں میں صدہا اشعار یک لخت لکھکر اُن کے حوالہ کر دئے ہیں ۔ مرزا صاحب کا مطبوعہ کلام دیگر ہم با د

ہمعصر شاعران ایشیا کے مقابلہ میں دوچند سہ چند بلکہ چہار چند ہے۔ اور بہت سا کلام ایسا ہے جو لوگوں کے گھروں میں پڑا ہوا ہے۔ اور جس کی اشاعت کی ابتک نوبت بھی نہیں پہنچی۔ چنانچہ کچھ ایسا کلام بھی حیات دبیر میں فاضل مؤلف نے درج کیا ہے۔ اور باقی ایسے کلام کا پتہ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ مگر باوجود ایسے پرگو شاعر ہونے کے مرزا صاحب کا کلام کہیں ایسا دستیاب نہیں ہوتا جو موزونیت سے گرا ہوا ہو +

(۵) مرزا صاحب کے صاحب علم ہونے میں شاید ہی کسی کو کلام ہو۔ مرزا صاحب نے جابجا اپنے کلام میں اکثر معتبر حدیثوں اور روایتوں اور آیات قرآن شریف کے مضامین عالیہ کو درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا صاحب کے چست بندش۔ بلند پروازی خیال سے تلمیحات۔ تشبیہات اور استعاروں کا استعمال۔ مختلف بحروں میں نظمیں۔ ردیف کی پیچیدگی اور قافیہ کا مناسب حال ہونا جملہ ایسے امور ہیں جو اُن کے اعلےٰ درجہ کے صاحب علم اور باکمال ہونے پر دال ہیں۔ شاعر کے لئے صاحب علم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بلا صاحب علم ہوئے شاعر سے اُس کے ملک کے لٹریچر اور باشندگان ملک کی زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور نہ اُس کی نصیحت اور پند سے عوام پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ شاعر کی نازک خیالیاں اُسی وقت قابل قدر ہوتی ہیں۔ جبکہ علم و ہنر کے زیوروں سے مرصع ہو کر پبلک میں جلوہ افروز ہوں۔ ورنہ اچھے سے اچھے اور اعلےٰ خیال کا بھدے یا بدنما طریقہ سے اظہار کرنے میں ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اور وہ شرفاء اور مہذب لوگوں کی باریابی سے محروم رہتا ہے +

مرزا صاحب کے صاحب علم ہونے کی وجہ سے اُن کی نازک خیالیوں نے اردو زبان پر بہت بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور اردو لٹریچر میں مرزا صاحب کے نفس نفیس سے وہ وہ ترقیاں نمودار ہوئی ہیں۔ کہ جن کے نشانات کا قیامت تک منہدم ہونا دشوار ہے +

(۶) مرزا صاحب کے قدرتی شاعر ہونے کے بہت سے ثبوت خود اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ سب سے اوّل یہ ہے۔ کہ مرزا صاحب کے کلام کا رنگ اس قدر انوکھا ہے۔ کہ اُس کی نقل

دوسروں سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو لوگ مرزا صاحب کی طرح سے پیدائشی شاعر ہیں۔ اُن کو تو قدرت نے الگ ہی ڈھنگ اور طرز کلام عطا کیا ہے۔ جو مرزا صاحب سے کیوں ملنے لگا۔ اور جو لوگ پیدائشی شاعر نہیں ہیں۔ اُن کے بوتے سے یہ بات بالکل باہر ہے۔ کہ مرزا صاحب کے کلام کی رنگت حاصل کرنے کے لئے شاعری کے میدان میں ایک قدم بھی چل سکیں۔ کیونکہ مرزا صاحب کی جودت طبع۔ عالی مضامین کی آمد۔ زبان کی شستگی و بیساختگی قدرت نے اُن کو خاص طور پر عطا کی ہے۔ کہ جو اکتساب علم و ہنر اور حصول فضل و کمال کے احاطہ سے باہر ہے۔ ع

این سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مرزا صاحب کے کلام میں مضامین کا اتنا بڑا خزانہ موجود ہے۔ کہ تلاش کرنے والا مضامین کو دیکھتے دیکھتے ششدر رہ جاتا ہے۔ مگر جس قدر زیادہ تجسس کرتا ہے۔ اُسی قدر اُس کی محنت کا صلہ اُسے ملتا جاتا ہے۔ بعض اوقات مرزا صاحب کے چند پُر زور بندوں کو سن کر سامعین کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اب سب مضامین (متعلق اس حال کے) ختم ہو چکے ہیں۔ اور آئندہ مرزا صاحب کسی دیگر سلسلہ خیال کو شروع کرینگے۔ مگر یہ یقین سامعین کا فوراً ہی حیرت اور تعجب سے بدل جاتا ہے۔ جب وہ آگے کے بندوں میں نئی نئی اور نرالی نازک خیالیاں مرزا صاحب کی سنتے ہیں۔ اور بالآخر مجبور ہو کر یہی کہنا پڑتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کو قدرت نے خاص طور پر پیدا کیا ہے۔ اور مرزا صاحب کے پیدا کردہ مضامین اسی طرح پر خاص ہیں +

تحریر معروضہ بالا سے ناظرین پر ہویدا ہو گا۔ کہ مرزا صاحب کس پایہ کے شاعر تھے۔ اور اس امر کے تصفیہ کو کہ مرزا صاحب سے بڑھا ہؤا کوئی اور شاعر اردو لٹریچر میں ہؤا ہے۔ یا یہ کہ مرزا صاحب ہی ملک الشعراء اور خاتم الشعراء ہیں۔ میں علم دوست اور قدر شناس پبلک کے انصاف پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ میرا مسلک صلح کل ہے۔ اور میں نہیں چاہتا۔ کہ مرزا صاحب کو اُن کے ہم عصر کسی شاعر پر فضیلت دے کر اُس شاعر کے حامیوں اور طرفداروں کے دل کو رنجیدہ کروں۔ اور ضد کی وجہ سے وہ فیض عام مرزا صاحب سے مستفید نہ ہوں۔ اور اُن کے کلام کا مطالعہ نہ کریں۔ ہاں اس قدر میں کہے

بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ مرزا صاحب کے احسانات کا جو اردو بولنے والی پبلک اور نوخیز اور بقول شاعر "ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے" جلد مرجانے والی اردو لٹریچر پر اُنہوں نے کئے ہیں۔ مُقر نہ ہو کر احسانمند نہ ہونا مُحسن کُشی سے کم نہیں ہے +

آخر میں میں اہل علم کی طرف سے فاضل مؤلف "حیاتِ دبیر" کا کہ جنہوں نے برسوں محنت شاقہ کر کے ایک بزرگ اور محسن ہند کے حالات علم اور فضل کی دُنیا کی پبلک کو پیشکش کئے ہیں۔ اور نوجوانان ہند کو بزرگوں کی عظمت کرنے اور اُن کے احسانات کے ممنون ہونے کا سبق سکھلایا ہے۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اپنے مضمون کو فاضل مؤلف کے لئے اِس دُعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ کہ اللہ جل شانہ اُن کو دُنیا اور عاقبت میں اس کا اجر نیک عطا کرے۔ آمین ثم آمین +

خادم القوم ہیرالال ادھولیہ (بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ جوڈیشل سکرٹری محکمہ محتشمہ خاص دربار کوٹہ دام اقبالہ)

تقریظ عالی جناب عالم علوم معقول و منقول مولوی حکیم محمد مظہر الہادی صاحب سہیل امروہوی مقیم و ملازم ریاست کوٹہ

علوم قدیمہ کے محققین نے پرانے کتبوں۔ عمارتوں کے کھنڈروں۔ زمین دوز شہروں اور کُہنہ پتھروں کی امداد سے علوم و فنون کے بیش بہا جواہر اکٹھے کئے ہیں۔ تحقیقات کا سلسلہ روز بروز معلومات کے ذخیرہ میں ایسا مُعتد بہ اضافہ کر رہا ہے۔ کہ خدا جانے آگے چل کر کیسی کیسی کار آمد چیزیں ہاتھ آنے والی ہیں۔ مگر انسانی تفتیش نے ریاضی کے مسلمہ مسائل کے سوا اب تک کہیں حق الیقین کا درجہ نہیں حاصل کیا۔ کیسے ہی احتجاج و براہین کے پشتوں سے مستحکم دعوے پیش کئے جائیں۔ مگر تردیدی احتمالات اور نقص و منع کے حملے اُنہیں شکست دینے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اب اگر

دلائل مثبتہ کی قوت مدافعت کی پوری طاقت رکھتی ہے۔ ردّ وانکار کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں۔ اور
جد وجہد کے قلعہ پر کامیابی کا جھنڈا نصب ہوجاتا ہے۔ بادِ مُراد ناخدا بن کر جہاز کو ساحل مقصود
پر جا لگاتی ہے۔ تحسین وآفرین کے نعروں سے عالم تحقیق گونج اُٹھتا ہے۔ واہ وا اور سبحان اللہ
کی صدائیں زبانوں سے نکل کر دماغ میں پہنچتی ہیں۔ اور قوائے ذہنیہ میں تحریک۔ خیالات میں جوش
اور ارادوں میں ایسی برانگیختگی پیدا کرتی ہیں۔ کہ وہ قدم تحقیق آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ متجسس
نگاہیں اپنی خواہشات اُن کے استقبال کے لئے بھیجتی ہیں۔ اور متلاشی دل آغوش شوق جدید
معلومات کے لئے کشادہ اور ادراک و فہم پرواز کے بازو کھول کر نئے علمی سرمایہ کی تحصیل شروع
کرتے ہیں۔ فکر وخیال رسائی کے ذریعہ ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کامیابی و رجحان عام کے
ہم نہیں دیکھتے۔ کہ دُنیا میں کوئی مسئلہ بے چون وچرا تسلیم کرلیا گیا۔ اور تمام عالم نے سر قبول جھکا لیا
ایسی حالت میں اگر اہل جرمن علوم وفنون کا موجد یونانیوں کو بتائیں۔ یا بعض انگلستانی محقق یہ سہرا
ہندوستان کے سر باندھیں۔ یا علامہ زیفن۔ شارلو۔ اور مورخ گبن وغیرہ کے نتیجۂ تحقیقات
سے ایشیائے کوچک کے باشندے ثابت ہوں۔ ہم کسی کے سر پہ تاج ایجاد وابداع نہیں رکھ
سکتے۔ کیونکہ سب اپنے اپنے دلائل و پیرایہ استدلال میں اُنہیں پرانے اعمال ناموں کی شہادت
پر وثوق رکھتے ہیں +

ممکن ہے۔ کہ عربی مورخین اور اہل سیر سے پہلے کی تصنیفات علم تاریخ وسیر میں موجود ہوں
مگر بائبل کے سوا کوئی ایسا قدیم مجموعہ عالم میں موجود نہیں ہے۔ جس کے واقعات کی ترتیب وتدوین
خود اُس کی صداقت کی معیار ہو۔ پرانی رامائن اور کہنہ مہابھارت وغیرہ جن کو مذہبی تقدس کا اعزاز
بخشا جاتا ہے۔ اُن کے شاعرانہ مبالغے واقعات کو امکان عادی بلکہ امکان عقلی سے بھی اتنی دور
پھینک رہے ہیں۔ جن کے واسطے غلو سے بھی زیادہ بلیغ لفظ وضع ہونے کی ضرورت ہے۔
لیکن لطف یہ ہے۔ کہ عقیدتمند دل اپنے چشم دید حالات کی نسبت غلطی بصارت کو تسلیم کر سکتے ہیں
مگر اُن محالات کے وقوع میں امنّا وصدقنا سے ایک انچ نہیں ہٹ سکتے +

بہر حال کل خرب بما لدیہم فرحون کے موافق ہر شخص کا اعتقادی قبلہ اُس کا ذاتی میلان ہُوا کرتا ہے۔ لیکن مسٹر اسپرنگر مسٹر کارن ہل جیسے معزز محققوں کی شہادت اور بیشمار تصانیف کے انبار اور اُن تصنیفات میں بے انتہا ایسی کتابوں اور مصنّفوں کی فہرستوں کی زبردست گواہی (گو اب کتب خانوں میں اُن کا وجود بھی نہیں ہے) اس بات کا قطعی فیصلہ کرتی ہے۔ کہ مسلمان مُورخوں اور سوانح عمریوں کے مصنّفوں نے ان فنون لطیفہ کو کس تاریکی اور ظلمت سے نکال کر کس روشنی اور نورانیت تک پہنچایا۔ حفیض دروغ و ناراستی سے اوج صداقت پر چڑھایا۔ قعر ذلت و گمنامی سے تخت بلند نامی پر لا بٹھایا۔ گویا ایک مردہ لاش میں رُوح پھونک کر اعجاز مسیحائی دکھلایا۔ دربار تحقیق میں راست بیانی کے برقی لیمپ روشن کر دئے۔ تمام حُسن و قبح۔ عیب و صواب۔ خوبیاں اور بُرائیاں دیکھنے والوں کو صاف نظر آ رہی ہیں۔ صداقت کی اکسریز شعاعیں اندرونی حقیقت کو باہر ہی سے دکھلا رہی ہیں۔ اگر ایک مُورخ کسی کی طرفداری میں سرشار ہو کر یا غلطی و ناواقفیت سے مسلسل واقعات لکھتے لکھتے غلط نتیجہ کی ٹیڑھی پگڈنڈی پر چل دیا ہے۔ تو ناظرین خود تسلسل حالات سے شاہ راہ حقیقت پر ہو لیتے ہیں۔ کیونکہ کوئی دشمنی اور کسی قسم کی عداوت۔ کوئی مطلب اور کوئی نفرت اُنہیں کسی واقعہ کے نقل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ علم الرجال اور ترتیب اسناد کا کارآمد ایجاد صرف اُنہیں کو مدد نہیں دیتا تھا۔ بلکہ وہ آج بھی بارہ تیرہ صدی کے بعد اُسی طرح ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ اور ہم جب چاہیں۔ اور جس خبر کو چاہیں۔ مختلف بیانات میں سے چھانٹ کر صحیح و سقیم۔ درست و نادرست بتلا سکتے ہیں۔ آج کون شخص ہمارے مقابلہ میں یہ بتلا سکتا ہے۔ کہ فلاں واقعہ کا ماخذ کہاں ہے۔ اور اُس کے اخباری وسائط کی کیا شان ہے۔ سلسلہ اسناد میں سچا جھوٹا۔ قوی الحفظ اور ضعیف الحافظہ معتبر و نامعتبر شخص ہے یا نہیں +

ابتدا میں فلسفہ، تاریخ و سیر کی زبانی تعلیم ضمناً ہُوا کرتی تھی۔ اور ذہنوں میں اُس کا ذخیرہ مجتمع رہا کرتا تھا جسب ضرورت کام میں لاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد اُس کی علمی بنیاد پڑ گئی۔ ابو مسعود و سلیمان اعمش وغیرہ نے مختصر یادداشتیں لکھ کر تلامذہ کو دینی شروع کیں۔ جس قدر بُعد زمانی بڑھتا جاتا تھا۔

کے اِس سرے سے اُس سرے تک۔ بغداد سے چل کر اندلس اور مشرق سے مغرب تک کی خاک
چھان ڈالتے تھے۔ تب کہیں تصنیف و تالیف پر قلم اُٹھاتے تھے +

زہری جیسے مشہور محدث کو مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات کی نسبت معلوم ہوا۔ کہ
حرث بن فہر سے چند ایسے الفاظ آخر حدیث میں روایت کئے گئے ہیں۔ جو اُن کی سند والوں میں کسی میں
نہ تھے۔ حرث بن فہر زندہ تھے۔ مگر بے پتہ تھے۔ انہیں خلجان پیدا ہوا۔ اور آسائش و آرام پر
خاک ڈال کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جوئندہ یابندہ۔ تین سال کی سرگردانی کے بعد گوہر مقصود
ہاتھ آیا +

ابن عیینہ کو ایک حدیث کی سند میں سہو کا گمان ہوگیا۔ درس و تدریس بند کر کے ایک
مدت تک کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف رہے۔ عہد کر لیا۔ جب تک سند کی تصحیح اور اپنے
حفظ کی تصدیق نہ ہو جائیگی۔ ہرگز حدیث بیان نہ کرونگا۔ انہیں خوف یہ تھا۔ کہ اگر سہو کا عارضہ لاحق
ہو چکا ہے۔ تو ممکن ہے۔ کہ بیان کرتے وقت کوئی لفظ غلط نکل جائے۔ پانچ سال تک پریشان
پھرتے رہے۔ دو بار حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اسی لئے حاضر ہوئے۔ جس قریہ اور
قصبہ میں گذر ہوتا تھا۔ جس درس میں شریک ہوتے تھے۔ گوہر مدعا ڈھونڈتے تھے۔ لوگ ان کی
آمد سُن کر بڑے شوق و عقیدت سے حدیث سُننے کے لئے آتے تھے۔ مگر یہ اپنی دردناک حالت پر خود
بھی روتے اور دوسروں کو بھی رُلاتے تھے۔ پانچویں سال حبیب بن عتیک ان کے گھر مہمان ہوئے۔
اثنائے طعام میں انہوں نے ایک حدیث آداب طعام میں اُسی سند سے بیان کی۔ جس میں ابن عیینہ
مشتبہ تھے۔ انہیں جو سند یاد تھی۔ اُسی کی تائید مہمان کی زبان سے ہوئی۔ یہ سُنتے ہی اُچھل پڑے۔
اور گھنٹوں روتے رہے۔ جب گریہ و زاری سے افاقہ ہوا۔ تو مہمان محترم کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی حیثیت
سے بڑھ کر وسیع پیمانہ پر تمام علما و محدثین شہر کی دعوت میں سب اثاث البیت بیچ کر لگا دیا۔ اُسی
دن سے پھر دریائے افادہ و استفادہ زور شور سے بہنے لگا +

علامہ ابو اسحق نیشاپوری مصنف سیرۃ الغزالی نے چونتیس سال کی جانکاہی کے بعد

اس فن کی ضرورت بڑھتی جاتی تھی +

اس فلسفہ کی بنیاد قائم کرکے مسلمہ اور ثبت اصول کے وزن اور پیمانوں سے اس طرح موزون کیا۔ کہ جب اُن قاعدوں کی میزان میں رکھ کر کسی واقعہ کو تولتے ہیں۔ کمی بیشی کا تفاوت جزو لایتجزے کی مقدار تک معلوم ہوجاتا ہے۔ آج لندن اور برلن کے کتب خانے جن تاریخوں کی بدولت درج جواہر و گنجینہ الماس پر ترجیح رکھتے ہیں۔ وہ عربی دماغوں کے پریس کے چھپے ہوئے ہیں۔ لائف و ہسٹری کے ذخیرے جن پر یورپ کو ناز ہے وہ سب انہیں بادیہ گرد عربوں کا صدقہ ہے۔ بغداد و اندلس کے دار العلوم اور اُن کے متعلقہ مکتبوں کے چشموں سے یورپ کے جن ہونہار طلبہ نے جدا جدا کیفیت اور الگ الگ مزہ کے گھونٹ پئے تھے۔ وہ اُن کے پیٹوں میں جاکر عجب کار آمد بن گئے۔ اور جب اُن کو اپنے ملک کے دل و دماغ کی زمینیں درست کرکے اعلےٰ پیمانہ پر کاشت کیا۔ تو وہ عجیب و غریب نظر فریب پھل لانے لگے۔ اب وہی عربی تخم یوروپین زمینوں میں ایسا پھلا پھولا۔ کہ اس کی دلربا سرسبزی نے موجدوں کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ بیچارے ابن خلدون سے کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ تو نے کس محنت و دلسوزی سے ان اصول کی تدوین کی تھی۔ اور کب کی تھی؟ جس زمانہ میں نہ کوئی شاہی کمیشن مقرر کئے جاتے تھے۔ نہ قوموں کے دست سخاوکرم جانگزاری و عرق ریزی کی کفالت کرتے تھے۔ نہ خود تدوین کرنے والے کو جانچ پرتال کے ذریعے میسّر تھے۔ نہ جہازوں اور ریلوں کے سیلون اور فرسٹ کلاس گاڑیاں۔ اور نہ اسٹیشنوں کے ریفرلیشمنٹ روم سفر کو حضر سے بڑھ کر راحت کدہ بنانے والے تھے۔ نہ ترتیب واقعات اور تحقیق حالات کے لئے ڈاک خانے اور تار گھر صحیح اور جلد تر خبروں کے بہم پہنچانے کا وسیلہ تھے۔ سفر اہل ہمّت کے نزدیک گنتا ہی وسیلۂ ظفر سمجھا جاتا تھا۔ مگر مسافروں کے لئے نمونہ سقر ضرور تھا۔ بڑے بڑے محقق بھڑک پیاس کے صدموں سے کوہ و دشت میں مرکر رہ جاتے تھے۔ اور رہزنوں کو ہر تحقیق کے ڈھونڈنے والے انسانی اور وحشی درندوں کا لقمہ ہوجاتے تھے۔ مگر تنہا شخص وہ حوصلے اور ہمّت کر بیٹھتا تھا۔ جو آج منفقرا اور متحدہ پارٹیوں سے اس آسائش اور راحت کے زمانہ میں نہیں ہوسکتے۔ اُس نے ادنےٰ ادنےٰ واقعہ کی تحقیق میں اور ایک ایک حدیث کی تلاش میں دنیا

اپنی بیش بہا تصنیف پبلک میں پیش کی۔ تو دیباچۂ کتاب سُنتے ہی اُن کی عالی ہمتی اور تحقیق و تفتیش کی جانکاہیوں کا دلوں پر سکہ بیٹھ گیا۔ یہ اولوالعزم سوانح نگار تمام اُن شہروں۔ قریوں۔ وادیوں اور صحراؤں میں خود سفر کرکے پہنچتا تھا۔ جہاں جہاں امام غزالی کے پہنچنے کی خبر سنتا تھا۔ اگرچہ امام غزالی کو ایک صدی سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا۔ مگر وہ جہاں اپنے علوم کی روشنی پھیلا آئے تھے۔ ابھی اُن تجلیوں میں کمی نہ آئی تھی۔ اس لئے مصنف ممدوح کو نہایت عجیب و غریب اور سچے حالات مسلسل واقعات ملتے چلے گئے۔ اس لئے یہ کتاب امام غزالی کے حالات کا ایک روزنامچہ بن گئی ✦

یہ دو تین قصے بطور نمونہ اس اندازہ کے لئے لکھ دئے ہیں۔ کہ ذرا ذرا سی بات کی تحقیق میں کیسی سخت جسمانی محنتیں برداشت کی جاتی تھیں۔ اب اس تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے۔ کہ جب روایت ان استحکامات سے مکمل پائی جاتی تھی۔ تب ہر واقعہ اور بیان کو درایت و فہم کی کسوٹی پر کستے تھے۔ منطقی میزان میں تولتے تھے۔ فلسفہ کے پیمانوں اور ذہن و ادراک کے قدموں سے ناپتے تھے۔ اسباب و علل کی جستجو کرتے تھے۔ حالات گرد و پیش سے تطبیق دیتے تھے۔ رسوم و اوضاع و قواعد تمدن زمانی و مقتضیات احوال سے توثیق کرتے تھے۔ آپ کی تصنیف اس قدر تراش خراش۔ ایسی دیکھ بھال اور صحت و سقم کی پرتال کے بعد جو مجموعہ شائع کیا جاتا تھا۔ اگرچہ حقائق و واقعات کا لب لباب۔ رائے صائب اور اصابت خیال کا نتیجہ ہوتا تھا۔ لیکن اس پر بھی دیکھنے والوں کو مذہبی طرفداری یا رسوخ عقیدت یا نفسانی تنفر کا شبہ ہو جاتا۔ تو مقررہ قواعد کو پیش نظر رکھ کر خود اصلاح کر سکتے تھے۔ مگر سبحان اللہ کیا روشن دماغ کیسی منصف طبیعتیں پائی تھیں۔ کس قدر دل صاف تھے۔ کتنے بلند خیال تھے۔ کہ تعصب کے الزام سے بری رہنے کے لئے کسی واقعہ اور کسی کیفیت کو چھپاتے نہ تھے۔ خواہ اُس کی تردید میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیتے۔ مگر مداہنت کو ادائے فرض میں سنگ راہ تصور کرتے تھے ✦

اس انصاف پسندی کو دیکھئے۔ کہ میں نے آج تک عربی زبان میں چھوٹی بڑی سب ملا کر بارہ[۱۲] سوانح عمریاں جناب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اور ان بارہ[۱۲] کتابوں سے

نام ہن موجودہ کتابوں میں اور نظر آئے۔ ان دیکھی ہوئی کتابوں میں سے آٹھ شافعیوں کی اور چار حنفیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ شافعی مصنّفوں نے امام ابوحنیفہ کے زہد و تقدس۔ علم و فضل اور اُن کی اصلی صفت قوت اجتہاد و استنباط مسائل کی تشریح میں جس تقدم و کمال کو ثابت کیا ہے۔ حنفی مصنّفوں کی کتابوں میں وہ بات نہیں +

صاف ظاہر ہے۔ کہ تکمیل کا مرتبہ بغیر محنت و جانفشانی اور بلا امتداد زمانی کے حاصل نہیں ہوتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ وہی پھل جو درخت پر آفتاب کی شعاعوں سے تدریجی حرارت حاصل کرکے اور ہوا کے صدموں۔ پانی اور برف کے طمانچوں کو برداشت کرکے دو ہفتہ میں پختہ ہوتے ہیں۔ وہی توڑ کر جب پال میں دبا دئے جاتے ہیں۔ ایک ہفتہ نہیں گذرنے پاتا۔ کہ نرم اور پلپلے ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا لطافت و نفاست میں مزہ اور خوشبو میں۔ کیا صورت اور رنگت میں۔ کیا تازگی اور نظر فریبی میں دونوں برابر ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ سال۔ ساگوان۔ آبنوس وغیرہ جن کی لکڑیاں صدیوں کام دیتی ہیں۔ برسوں میں جاکر اس قابل ہوتے ہیں۔ کہ اُن کی لکڑی کام میں لائی جائے۔ اس لئے قدرت کا عام اصول یہی نظر آتا ہے "دیر آید درست آید وہ چہ زود آید دیر نپاید"+

ایک بڑے قابل مصنّف پر لوگوں نے اعتراض کیا۔ کہ برسوں انتظار میں مبتلا رکھ کر تم ایک کتاب مرتب کرتے ہو۔ اور بیسیوں بار اُس پر نظر ثانی کرتے رہتے ہو۔ تب کہیں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوتی ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ میں ایسی تصویر بناتا ہوں۔ جو ہمیشہ قائم رہے +

جلدی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ لفظوں کی رنگینی اور عبارت کی ظاہری خوبیوں کے سبب کچھ دنوں تصنیف کی قدر و منزلت ہو جاتی ہے۔ مگر جب گہری نظریں تنقیدی نگاہیں عمارت کی اندرونی خرابیوں تک پہنچتی ہیں۔ تو پلاسٹر کے نیچے کی تمام بدنما یاں عیب و صواب کھل جاتے ہیں۔ وہ بہار وہ رنگ روپ وہ چمک دمک سب کافور ہو جاتی ہے۔ وہ طلسمی لیمپ چشم زدن میں گل ہو جاتے ہیں۔ وہ دھوکے کے پھول نکتہ چینی کے پہلے ہی تھپیڑے سے ہمیشہ کے لئے کمہلا کر رہ جاتے ہیں۔ پھر التفات کی نظریں تمنّا بھری نگاہیں انہیں دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوتیں۔ کھوٹے مال کو دیکھ کر مشتاق دل

اور خریدار طبیعتیں بھر جاتی ہیں۔ اور تصنیف کے خوشنما پودے کو کس مپرسی کا پالہ مار جاتا ہے۔

بالکل یہی حال ہمارے مخدوم و واجب الاحترام شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مدظلہ کی عجیب و غریب تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" کا ہے۔ اخباروں میں اشتہار دیکھ کر شوق دیدار اور ولولۂ خریداری پیدا ہوا۔ اوّل تو مثل مشہور "بڑے گھر کی بڑی بات"۔ آپ کی عربی و فارسی کی ادبی قابلیت اسلوب بیان کی دلکشی۔ اردو کی نامور تصنیفات جنہوں نے اردو لائف سے پوری لائبریری کو مستغنی کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی تھیں۔ کہ عجیب جامع اور لاجواب کتاب ہوگی۔ دوسری مسرت یہ تھی۔ کہ موازنہ میں جناب انیس و حضرت دبیر دونوں کے حالات صحیح ایک محقق کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہونگے۔ حضرت انیس کی بعض ادھوری سوانح عمریاں دیکھنے کا تو اتفاق بھی ہوا ہے۔ لیکن اردو کی کس قدر بدنصیبی ہے۔ کہ آج تک اس محسن و مربی کی سوانح عمری سے اُس کا دامن خالی ہے۔ گو مرزائے مرحوم کا فضل و کمال کسی روشناسی کا محتاج نہیں ہے۔ ع

حاجت مشاطہ نیست روئے دلارام را

مگر کیا اُس جم غفیر کے لئے باعث ننگ و عار نہیں۔ جو آپ کی اصلاح سے مستفید ہو کر مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اور کیا ان شعرائے نامور کو شرم نہیں آتی۔ جو شاعری کے ساتھ ناثر بے بدل ہیں کہ نظیر اکبر آبادی کی بے نظیر سوانح عمری حضرت شہباز کے ہاتھ سے شائع ہو جائے۔ ذوق و غالب و داغ وغیرہ اساتذہ کے کارنامے تازہ رکھنے کے لئے حضرت حالی و آزاد و احسن اپنے فرائض اخلاقی سے سبکدوشی حاصل کر سکیں۔ مگر مرزا دبیر جیسے کثیر التلامذہ اور عام فیض کے حالات مرتب ہونے کے لئے ایک ایک کا منہ تکیں۔ اس لئے جب معلوم ہوا۔ کہ علامہ شبلی نے لکھنؤ کے قیام کا شکریہ اس صورت میں ادا فرمایا ہے۔ خواہ مخواہ دل میں ان کی شکر گذاری کا احساس ہوا۔ مگر آہ اُس ملال و افسوس کا اظہار کسی طرح ممکن نہیں۔ جو سرسری طور پر موازنہ کو پڑھ کر ہوا۔ اور جس قدر زیادہ غور کیا جاتا تھا رنج و ملال کا تھرمامیٹر ڈگریوں چڑھتا چلا جاتا تھا۔ اُمید یہ تھی۔ کہ علامہ شبلی کی تصنیف منصفانہ طور پر اُس جھگڑے کا قطعی فیصلہ کر دیگی۔ جو حضرت انیس و دبیر کے عقیدت مندوں میں عرصہ تک جاری رہا ہے۔

اُن کی جادو بیانی۔ اُن کی وسعت معلومات سے تاریخی۔ ادبی معنوی۔ بیانی فوائد پہنچیں گے۔ مگر بجائے اُس کے معلوم ہُوا۔ کہ ہم جس قدر آگے بڑھ رہے ہیں۔ تاریکی وظلمت بڑھتی جاتی ہے۔ جو کچھ اب تک پڑھا لکھا تھا۔ سب غارت ہو کر لاعلمی اور حیرت کے پردہ معلومات پر پڑتے چلے جاتے ہیں۔ مختصر یہ ہے۔ کہ آپ نے جس بیدردی سے دبیر مرحوم کی خوبیوں پر خاک ڈالنے کی عجیب وغریب سعی فرمائی ہے۔ ہم آپ کے ساتھ حسن عقیدت رکھتے ہوئے یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کہ عجلت اور جلدی میں آپ حضرت دبیر کے کمالات کا اندازہ نہیں فرما سکے۔ حُسن کو عیب اور خوبیوں کو بُرائیاں سمجھ گئے۔ آپ اپنی تصنیف کو پبلک سے انٹروڈوس کرانے میں جلد بازی سے کام نہ لیتے۔ تو غالباً خود آپ کی مشہور قابلیت اور بلند نظری ضرور تمام کتاب پر خط نسخ کھینچ دینے پر مجبور کر دیتی۔ کیونکہ جس کتاب کی بنا ہی غلطی پر ہے۔ اُس کے مسائل بناء الفاسد علے الفاسد کے مصداق ہیں۔ باوجود اِن تمام قلق وافسوس کے ایک بڑی خوشی یہ ہے۔ کہ موازنہ کی تصنیف سے عالم تصنیف وتالیف میں ایک شورش برپا ہو گئی۔ طبیعتوں میں خلش اور خلش کے ساتھ تحریک بڑھنے لگی۔ سچ ہے۔ بعض المفاسد یورث المقاصد۔ مُلک میں ایک عام ضرورت محسوس ہونے لگی۔ کہ حضرت دبیر کے صحیح حالات اور ہر قسم کے کلام کا نمونہ پبلک میں پیش کر کے یہ دکھلایا جائے۔ کہ جامع کمالات ہونے کے لحاظ سے یہ بینظیر شاعر کیا پایہ رکھتا ہے +

مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین شائع ہوئے۔ موازنہ کے اوندھے سیدھے جواب بھی دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ مگر مَیں نے جس قدر دیکھے۔ وہ متانت وتہذیب سے ایسے گرے ہوئے ہیں۔ کہ اُن کے وجود سے عدم اچھا تھا +

مگر منا شاعر بے نظیر خوش بیان وخوش گو جناب مولوی سید افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی ایک مدت مدید سے نہایت ثبات واستقلال کے ساتھ حالات شعرائے مرثیہ گو کی ترتیب میں مصروف تھے۔ حیات دبیر کا ذخیرہ بہت کچھ فراہم کیا تھا۔ جس قدر اُس کی اشاعت میں دیر ہوتی تھی۔ شائقین کی تمناؤں کا خون ہوتا تھا۔ مگر آپ کے محققانہ ارادے کامل جانچ پڑتال کے

بغیر اُسے روشناس ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آپ کا یہ خیال تھا۔ اور بالکل درست تھا کہ انسان کوئی کام کیسی ہی نیک نیتی اور کتنی ہی کوشش کے ساتھ انجام دے۔ اُس میں اوّل تو نقص رہتا ہی ہے۔ مگر نہ ہونے پر بھی ملامت کرنے والے اُسے خلعت قبول نہیں پہناتے۔ لیکن انسان کو اپنی ممکن طاقت۔ واقعات کی تصدیق۔ حالات کی صحت۔ انتخاب کی وسعت اور بحث کے متعلق رائے کی اصابت واسطے کام کی تقویت میں ضرور مبذول کرنی چاہیئے۔ اور یہ باتیں مدت تک سلسلۂ تفتیش کو جاری رکھنے کے بغیر نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے خدا جانے کب اور کیونکر حیات دبیر کی رُونمائی ہوتی۔ یہ صرف موازنہ کی اشاعت کا نتیجہ ہے۔ کہ حضرت ثابت نے فراہم شدہ سرمایہ شبانہ روزی کوششوں اور بیجا الفشانیوں سے اپنے خیال میں جلد سے جلد مرتب فرما کر چھپنے کو بھیج دیا۔ دی جوش نے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں میں مکمل کرا دیا۔

حضرت ثابت بلند خیال۔ وسیع المعلومات۔ عربی و فارسی کے با استعداد صاحب علم ہیں۔ مذہبی پختگی کے باوجود صلح پسند اور عجب مرنجان مرنج بزرگ ہیں۔ اخلاق و انسانیت کا مجسمہ کہا جائے۔ تو زیبا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی معارضانہ بحثوں سے احتراز کرنے والے اور دونوں جگہ کے کاملوں کی یکساں عظمت کرنے والے ہیں۔ شعر گوئی میں ان کا درجہ موجودہ زمانہ کے نامور اُستادوں میں ہونا چاہیئے۔ تمام عمر غزل کہتے رہے ہے۔ اب کچھ احتراز سا ہے۔ کلام عیوب سے پاک۔ اُصول شاعرانہ کی بندشوں میں جکڑا ہوا بہت مضمون خیز ہوتا ہے۔ طبیعت میں ایجاد دلچسپ و اختراع دلکش بھی ہے۔ افسوس ملازمت کی پابندی کے سبب عمر کا بہترین حصہ ایسی جگہ گذارنا پڑا۔ جہاں کمال و اہل کمال کے قدر کرنے والے نہیں۔ لکھنؤ یا دہلی میں اگر فارغ البالی میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملتا۔ تو آج اُستادی کا ہندوستان میں ڈنکہ بجا دیتے۔

کچھ تو آپ کے مذکورہ اوصاف سے اور کچھ آپ کی جانکاہیوں سے آپ کی تصنیف کا تمام خوبیوں کو جامع ہونا لازم قرار پاتا ہے۔ اس لئے حیات دبیر کو بغور دیکھنے کے بعد

ئیں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اُسے مجمل طور پر بیان کرتا ہوں +

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ دبیر کے سچے شیدا کے قلم سے نکلی ہے۔ جو مرحوم کی محبت و عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر ادب و تہذیب یا سخن فہمی و تحقیق نے مرزا صاحب کے مقابل میر انیس کی حق تلفی نہیں کرنے دی۔ اور جس عقیدت یا انصاف کے ساتھ مرزا صاحب کے معترضین کو تحقیقی جواب دئے ہیں۔ حضرت انیس کو بھی اعتراضات سے بچانے کی ویسی ہی کوشش کی ہے +

زبان

کسی کی تعریف میں صرف یہ کہدینا کافی نہیں۔ کہ وہ اہل زبان ہے۔ کیونکہ تمام اہل زبان مضمون کے ادا کرنے پر یکساں قادر نہیں ہوتے۔ بلکہ اُنہیں میں سے بعض کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ کسی طرح مافی الضمیر کو سامع کے ذہن نشین کر ہی نہیں سکتے۔ بعض ایسے ثقیل اور فصاحت سے گرے ہوئے لفظوں کی بھرمار کرتے ہیں۔ کہ معمولی بے پڑھے لکھے آدمی اُن کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس کتاب میں جس زبان سے کام لیا گیا ہے۔ وہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان نہایت صاف روزمرّہ ہے۔ الفاظ اپنے معانی مطلوبہ کو نہایت وضاحت سے ادا کر رہے ہیں۔ ثقیل الفاظ۔ متنافر کلمات۔ متروک محاورات۔ وحشی و اجنبی کلمات۔ بازاری روزمرّہ سے پاک ہے۔ جن معانی کے ادا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ لفظوں نے دوش بدوش مساعدت کی ہے۔ سلاست عنان بعنان دوڑتی ہے۔ صفائی قدم بقدم چلتی ہے۔ چستی شانہ سے شانہ ملائے ہوئے ہے۔ عبارتوں کا ارتباط سلک مروارید بنا رہا ہے۔ بیکار اور بھرتی کی تفسیری عبارتیں نہیں۔ تطویل لاطائل و اختصار مخل سے گریز ہے۔ فقرہ چھوٹے چھوٹے ہیں۔ بڑے بڑے جملے نہیں ہیں۔ کہ کوسوں پر جا کر خبر نکلے۔ اور ذہن پراگندہ ہو کر پہلے ٹکڑوں کو کھو بیٹھے۔ موقع بموقع لطائف۔ ظرائف دلچسپی کے پھول کھلاتے چلے جاتے ہیں +

اسلوب بیان

بیان کا طرز بہت دلکش ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں۔ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ جہاں کسی بات پر زور دینا مدنظر ہے۔ اُس کے لئے ویسے ہی زوردار الفاظ اس ترتیب سے جمائے ہیں۔ کہ محض

اسلوب بیان ہزار شہادتوں کی قائم مقامی کر رہا ہے۔ جس مسئلہ کے اثبات کی ضرورت تھی۔ اُسے دلائل محکمہ سے ثابت کرنے میں کمی نہیں کی۔ اور اس سلسلہ اور ترتیب سے لائے ہیں۔ کہ قیاسات برہانی کا بدیہی نتیجہ اثبات مدعا ہو جاتا ہے +

جس واقعہ سے متاثر کرنا مدنظر ہے۔ اُس کے لئے سوز و گداز سے بھرے ہوئے لفظ دل کو نرم کرنے کا پورا کام دے رہے ہیں۔ جس بات کی تردید کرنی چاہی ہے۔ اُس کے اُکھاڑنے میں جس قدر پہلو نکل سکتے تھے۔ سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ اور ادائے مضمون کا سلیقہ موقع اور محل کی شناخت کا ملکہ مصنف کو ایسا آتا ہے۔ کہ جہاں بالضرور رکاوٹ ہونی چاہئے۔ کتاب کا دیکھنے والا سحر کلام سے مسحور ہو کر بے روک ٹوک سرپٹ گذر جائیگا +

ترتیب مضامین

چھاپہ خانوں کی کثرت اور اُن میں بیکاری کا مشغلہ یہ رہتا ہے۔ کہ کسی معمولی استعداد کے آدمی کو دس پانچ روپیہ دے کر کوئی ناول یا سوانح عمری لکھوالی۔ اور چھاپ کر ٹکے سیدھے کئے۔ وہ طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ کہ پیسے پیسے خلفا و سلاطین اور اولیا و صلحا کی سوانح عمریاں بکتی پھرتی ہیں۔ اُنہیں دیکھنے کے بعد دماغ میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ انہیں کے مقابلہ میں حیات جاوید۔ حیات سعدی۔ سیرۃ النعمان۔ البرامکہ۔ حیات غالب وغیرہ بے شمار ایسی باوقعت تصنیفیں موجود ہیں۔ جو اپنی انشا پردازی۔ ترتیب مضامین و تحقیق واقعات میں اس فن کے اعلےٰ نمونے کہے جا سکتے ہیں +

اگرچہ مصنف حیات دبیر نے اپنی تصنیف کو سلسلہ مضامین میں کسی کا تابع نہیں رکھا۔ اور جہاں جس مضمون کا ارتباط و ضرورت دیکھی۔ ایک کے بعد دوسرا مضمون شروع کر دیا۔ مثلاً مرزا صاحب کے اخلاق حمیدہ و عادات پسندیدہ کا بیان۔ ولادت۔ حلیہ۔ استعداد وغیرہ کے سلسلہ میں کیا ہے۔ اور اس کے متعلق بہت سے ہیڈنگ لکھ کر بظاہر طول دیا ہے۔ بہت سی باتیں جداگانہ عنوانوں کی محتاج نہ تھیں۔ شاید نئی روشنی کے شیدا اسے پسند نہ کریں۔ لیکن بغور دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقامی تسلسل اسی کا مقتضی اور مقتضائے حال بھی تھا۔ واقعات کی کثرت اور ہر واقعہ کی نوعی خصوصیت نزاکت پسندی میں جداگانہ شرح چاہتی تھی۔ اور یہ جدت ایک خوشنما اختراع ہے +

بعض مطالب اور حالات مکرر بیان میں آئے ہیں۔ دیباچہ میں اس کا سبب خود یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ ناظرین دور پہنچ کر گذشتہ بیانات کو شاید بھول گئے ہوں۔ یہ سبب کچھ دلچسپ نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بعض حالات و مقاصد کی کیا خصوصیت ہے۔ اور عموماً ایسا کیا جائے۔ تو کتاب حشو و زوائد کا مخزن ہو جائے +

مرزا صاحب کے ابتدائی عمر کے حالات کی پرداز اس عنوان سے اٹھائی ہے۔ کہ دیکھنے والے کو اُن کے ہونہار ہونے کا خود بخود یقین ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پہلے ہی سے اُن کی آئندہ ترقیوں پر پیشین گوئی کرنے کا سامان ہو جاتا ہے +

یہ بھی تعریف کے قابل ہے۔ کہ حالات کو مرتب ظاہر کرنے کے لئے قیاسات اور سطحی رائیوں سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہی لکھا۔ جو معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا۔ جو بات ٹھیک طور پر معلوم نہ تھی۔ اُس پر قلم نہیں اُٹھایا۔ مرزا صاحب کے کلام کی تدریجی ترقی اور زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں کی مثالیں۔ اُس زمانہ کی سوسائٹی کا پورا نقشہ خوب کھینچا ہے +

مرزا صاحب کے شاگردوں کا اگر مجمل ذکر ہوتا۔ تو معمولی بات تھی۔ اور عربی و اردو کی بہت سی سوانح عمریوں میں ایسا کیا گیا ہے۔ حقیقت میں ایک فاضل کے کمال کا یہ بھی بیّن ثبوت ہے۔ کہ اُس کے تلامذہ میں بڑے بلند پایہ اور نامور لوگ دکھلائے جائیں۔ مگر مصنف حیات دبیر نے اسے ایک مستقل مضمون قرار دے کر شاگردوں کے حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ یہ حصہ مرزا صاحب کی لائف سے غیر متعلق سا اور مصنف کے ایک خاص خیال کی کچھ تکمیل ہے۔ کہ وہ شعرائے مرثیہ گو کا مستقل تذکرہ لکھنا چاہتے تھے۔ ملک کو احسان ماننا چاہئے۔ کہ مرزا صاحب کی بدولت ان با دقعت شعرا کے حالات مفت میں معلوم ہو گئے +

حیات دبیر کا موضوع اگرچہ ایک محترم زندگی کے حالات ہیں۔ مگر جہاں اپنے ہیرو کے کلام کے محاسن و فضائل کا ذکر کیا ہے۔ وہاں علم معانی و بیان کے مسائل کی تشریح اور فصاحت و بلاغت کے نکات کا حل اس خوبی سے کیا ہے۔ کہ ان فنون ادبیہ پر کوئی ایسی جامع اور معمولی استعداد والوں کو آسانی سے فائدہ پہنچانے والی کتاب اُردو زبان میں موجود نہیں۔ غوامض علوم کو ایسے سہل پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ کہ اُسے پڑھکر ایک بے استعداد آدمی اچھی لیاقت پیدا کر سکتا ہے +

صنعتوں کے بیان میں بڑا کمال ظاہر کیا ہے۔ لفظی اور معنوی صنائع کو دو جداگانہ فصلوں کے تحت میں ہر صنعت کا جداگانہ عنوان قرار دیا ہے۔ اُن کی تعریفیں بہت جامع و مانع اور سہل ترین الفاظ میں لکھی ہیں۔ اور بہتر سے بہتر مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے چھانٹ کر درج کی ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہے۔ اوّل اُسی صنعت کی قرآنی آیت پیش کر کے یہ دکھلایا ہے۔ کہ آج جو کم فہم مسلمان صنائع اور بدائع کو فصاحت اور حسن کلام میں مخل بتاتے ہیں۔ وہ فصاحت کے معنی نہیں جانتے۔ وہ انگریزی کی تقلید میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں۔ کہ اُنہیں انگریزی بے رنگ تصویر نازک اور خوشنما نقش و نگار سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسی کیاری سے جس میں کہیں کہیں گلاب۔ موتیا وغیرہ کے پھول بھی زیبائش بڑھا رہے ہیں۔ وہ میدان اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں برساتی پانی کے اثر سے مختلف وضع اور الگ الگ قد و قامت کے پودے پھوٹ نکلے ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ بالذات کلام کے حسن و قبح سے اُنہیں بحث نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو یہ جانتے ہیں۔ کہ جو ترکیب شکسپیر۔ گولڈ اسمتھ۔ بائرن۔ ہومر۔ ڈینٹی نے نہیں برتی۔ وہ نامقبول اور ٹکسال باہر ہے۔ ہم نے بارہا دیکھا۔ کہ اتفاقاً لف و نشر۔ تجنیس اور ایہام وغیرہ کسی انگریزی کے شاعر کے کلام میں مل گئے۔ تو یہ خانہ خراب بے تمیز تعریفوں کے طومار باندھ دیتے ہیں +

مصنف حیات دبیر نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ بھی بتلایا ہے۔ کہ یہ صنعتیں کس جگہ کلام میں تاثیر۔ دلکشی۔ قوت۔ خوبی اور حسن پیدا کرتی ہیں۔ اور کہاں اور کس طرح سخن کو اُس کے پایہ سے گرا کر بے اثر

اور بے نمک کر دیتی ہیں۔ اس موقع پر یہ افسوس کرنا پڑتا ہے۔ کہ جن صنعتوں کو معرض بیان سے نکال دیا گیا ہے۔ اُن کی مثالیں بھی مرزا صاحب کے کلام میں بافراط موجود ہیں۔ اگر تھوڑی سی تکلیف اور کی جاتی۔ تو اُمتا حصّہ ایک مستقل تصنیف علم بدیع کی ہو جاتا +

حیات دبیر ایک انسانی کارگزاری ہے۔ اس لئے بعض ایسی باتیں بھی اُس میں ضرور ہیں جن پر تنقیدی نگاہ اپنا عمل جاری کر سکتی ہے۔ مثلاً الفاظ کی تین قسمیں دلچسپ۔ دلگداز اور دلکش بیان فرماکر مسائل کی عمارت ان پر قائم کی ہے۔ حالانکہ ان اقسام میں باہمی نسبت تضاد نہیں ہے۔ اور جب تک من وجہٍ بھی تضاد نہ ہو۔ آپس میں قسیم نہیں ہو سکتیں۔ وہی لفظ جو اپنی بیرونی خوشنمائی یا اندرونی اثر سے دل کو کھینچتا ہے۔ ممکن ہے ایسا پُرلطف اور شیریں ہو۔ کہ بار بار اُسے دُہرانے سے قند مکرر کا مزہ آئے۔ اور اس حیثیت سے دلکشی کے ساتھ اُس میں دلچسپی بھی پیدا ہو جائے۔ اور اُسی لفظ کے بار بار خیال میں لانے اور تصور کے بعد زبان سے ادا ہونے کا نتیجہ سوز و گداز ہو جائے۔ جیسا کہ ہم صوفیہ کرام کے یہاں سماع کی مجلسوں میں دیکھتے ہیں۔ کہ بعض اشعار دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اُن کے بار بار پڑھنے سے کیفیت و وجد جو دلچسپی و دلکشی و دلگدازی کے انتہائی نتیجے ہیں۔ ہویدا ہوتے ہیں۔ اس صورت میں وہی لفظ تینوں اوصاف سے متصف ہو سکتا ہے۔ یہ یا اس قسم کی جزوی فروگذاشتیں ایسی ہیں۔ کہ جن سے کوئی کتاب بمشکل خالی ہو سکتی ہے۔ اور اُس کے حسن معنوی میں خلل انداز نہیں ہیں +

تصحیح حالات

مصنّف ممدوح لکھنؤ کے رہنے والے اور حضرت اوج مدظلہ کے رشید شاگرد ہیں۔ اور چونکہ آپ کے نانا جناب سیّد محمد رضا ظہیر مرحوم مرزا صاحب کے نامور شاگرد اور لکھنؤ کے چوٹی کے مرثیہ خواں اور دربار دبیری کے دوامی حاضر باش تھے۔ اس لئے مصنّف ممدوح نے مرثیہ خوانی کی گود میں پرورش پائی۔ اور منقبت کی آب و ہوا سے نشو و نما ہوئی۔ ہوش بھی نہ سنبھالنے پائے تھے۔ کہ اس فن کی مشق میں لگا دئے گئے۔ گھر میں رات دن یہی چرچے رہا کرتے تھے۔ اور یہی مشغلے

کے سننے کا اتفاق ہوا کرتے تھے۔ رات دن میر صاحب اور مرزا صاحب کے حالات گذشتہ و موجودہ کے سننے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مجلسوں میں ان بزرگوں کو پڑھتے سنتے اور دیکھتے تھے۔ جس جلسہ میں گذر ہوتا تھا یہی ذکر یہی فکر۔ چونکہ یہی مذاق فطرتی تھا۔ اور اسی کا عادی بنایا گیا تھا۔ اسی میں لطف آتا تھا۔ اور اسی میں وقت گذارنا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح بھولے ہوئے حالات تازہ ہوتے رہتے تھے۔ عنفوان شباب ضرور لکھنؤ کی دلچسپیوں میں بسر ہؤا۔ لیکن اُس کے بعد لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ تاہم سال دو سال میں مہینے دو مہینے کو لکھنؤ کا پھیرا ہوتا رہا۔ وہاں پہنچ کر آئینہ حفظ کے زنگ پر جلا ہوتی رہتی تھی۔ مرزا صاحب کو ابھی کچھ ایسا زمانہ نہیں گذرا۔ کہ اُن کے صحیح حالات کا پتہ چلانا دشوار ہو۔ ہاں مخالفوں کی ہرزہ درائیوں اور محبین کی خوش اعتقادیوں نے اصلی حالات میں تحریف و تخلیط بہت کچھ کر رکھی تھی۔ تحقیق و تفتیش اور تنقید و انتخاب کی ضرورت تھی۔ تحقیق کرنے والے کے لئے یہ کام بہت آسان تھا۔ اوّل تو حالات کا بڑا ذخیرہ دماغ میں جمع تھا۔ دوسرے برسوں سے ان حالات کو متفرق صفحات پر غیر مرتب جمع کر کے اُن کی تحقیق و تفتیش میں مصروف تھے۔ علاوہ ازیں جس مجمع میں کچھ سراغ ملتا تھا۔ اور جہاں ہم خیال ملتا تھا۔ یہ بندۂ خدا کچھ نہ کچھ سرمایہ فراہم کر کے لاتا تھا۔ یہ خوشی کی بات ہے۔ جن لوگوں سے حالات لئے گئے۔ اُن میں اکثر صلحا۔ علما۔ مجتہدین بڑے باوقعت و حرمت لوگ ہیں۔ اور جن تحریرات سے امداد لی گئی ہے۔ وہ اکثر معتبر کتابیں ہیں۔ جن میں شاہی فرمانوں کی نقلیں اور عمائد سلطنت کے خطوط بڑی مستند شہادتیں ہیں۔ یہ ذرائع ہیں۔ جن سے نہایت صحیح حالات دستیاب ہوئے۔ اور جانچ پرتال سے اُن میں جو کوئی جزوی اختلاف تھا۔ اُسے تطبیق دی گئی۔ سچے حالات کے ملنے سے صحیح رایوں کے قائم کرنے میں کامیابی ہوئی۔ غالباً ایک مورخ اور سوانح نگار کی اعلےٰ سے اعلےٰ کامیابی یہی ہو سکتی ہے۔ کہ اُس کے مخزن میں صداقت و راست بیانی کا ذخیرہ بھرا ہؤا ہو۔ میں دو بارہ حضرت ثابت کا شکریہ ادا کرتا ہؤا اُن کی جانفشانی کی کامیابی پر داد دیتا ہوں۔ کہ اُن کی عنایت سے ناخدائے نظم اردو کے صحیح حالات کا مجموعہ ہماری آنکھوں کو ضیا و نور اور دل کو لطف و سرور بخش رہا ہے۔

ردُّ المعارضہ

ہر زمانہ میں اہل کمال کے دشمن دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ کہ محض حسد و عداوت اور خود غرضی کے سبب کسی کے کمالات کو مٹا کر اپنا سکّہ جمانا چاہتے ہیں۔ ان میں کچھ تو معاصرین ہوتے ہیں۔ ان کا ایسا کرنا پست فطرتی اور اخلاقی کمزوری سہی۔ لیکن چونکہ دُنیا میں خود غرضی عموماً چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے ذاتی فائدہ کی نظر سے معمولی بات ہوگئی ہے۔ کچھ لوگ اُن کاملین کے بعد بدنیتی سے یا مثل مشہور ہے ع

بدنام بھی گر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

کسی بلند نام کی شہرت پر حملہ کر کے اپنا نام اُچھالنا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم کے دشمن وہ ہیں۔ جن میں سخن فہمی کا مادہ نہیں ہوتا۔ اور نقص لیاقت کے پیمانہ میں کمال کو ناپتے ہیں۔ اور اپنے مفروضہ غلط معیار پر کستے ہیں +

مزہ یہ ہے کہ جو حال اعتراض کرنے والوں کا ہے۔ وہی حال دوستوں اور محبوں کا ہے۔ کہ یا تو جوش عقیدت و فرط محبت میں اُنہیں ہر عیب حسن اور ہر بُرائی بھلائی نظر آتی ہے۔ دُوسروں کے کلام میں وہی عیب اُنہیں عیب معلوم ہوتا ہے۔ اور اپنے محب کے کلام میں وہی عیب صواب سمجھا جاتا ہے۔ نیز ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ فرط محبّت میں اظہار عیب سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ اکثر پُرانے زمانے کے لائف لکھنے والے اس بلا میں زیادہ مبتلا نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ گویا ان لوگوں کو جن کے حالات سُنا رہے ہیں۔ مافوق الانسانیت میں دکھلا کر اُنہیں معصوم قرار دے رہے ہیں۔ اور یہاں ہی سے اُن کی بیجا طرفداری کھُل کر سوء ارادت کا سبب ہو جاتی ہے۔ فرط محبّت کی ایک مثال سُناتا ہُوں۔ لارڈ بائرن ایک نامور شاعر اور کریہ المنظر شخص تھا۔ پیشانی پر عجیب بدنما شکن پڑے رہتے تھے۔ نیچے کے ہونٹ کو ہر وقت دانتوں سے دبانے کا عادی تھا۔ انگلستان کی شدید سردی میں کبھی گلوبند نہیں باندھتا تھا۔ اُس کے

مقلدوں کو اُس کی یہ وضع ایسی محبوب تھی۔ کہ اُنھوں نے یہ تصنع یہ سب بدنمائیاں بڑی کوشش سے
پیدا کر لی تھیں +
یا یہ صورت ہوتی ہے۔ کہ ان محبین کی لیاقتیں حسن قبح کے پرکھنے سے عاری ہوتی ہیں۔ اُن کا
ذہن اصلی نقص اور حقیقی خوبی تک نہیں پہنچتا۔ اور یہ اپنے خیالی ڈھکوسلوں کے چکر میں گھومتے
رہتے ہیں +
گذشتہ معرکہ آرائیاں تقویم پارینہ ہو گئیں۔ میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے
کمالات تسلیم کر لئے گئے۔ مگر زمانہ حال کے معترضین میں سے شمس العلما علامہ شبلی جیسے
مشہور فاضل اور قابل مصنف اور شمس العلما مسٹر امداد امام صاحب ایسے لائق اہل قلم کی نسبت سخت
حیرت ہوتی ہے۔ کہ اُن کو کس قسم کے دشمنوں میں شمار کیا جائے۔ ہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے
کہ حضرت شبلی کا پایۂ عربیت گو کتنا ہی بلند ہو۔ اور جناب مسٹر امداد امام صاحب انگریزیت کے آسمان
کے چاند ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر شاعری و فصاحت و بلاغت میں غالب کے پڈ کے نہیں۔ پس اس
نقاد سخن کی تحریری شہادت سے جناب مرزا صاحب کے فضل و کمال اور مرثیت کے میدان میں یکہ تاز ہونے
کا ثبوت دیکھنے کے بعد ان بزرگ معترضین کی شان میں یہی کہنا پڑتا ہے ع

معذور دار مست کہ تو او را ندیدۂ

سوانح نگار کا فرض تھا۔ کہ غلط فہمی اور نالیاقتی کے سبب جن لوگوں نے غلط اعتراض کر کے
آفتاب پر خاک ڈالنی چاہی ہے۔ اُس گرد کو صاف بیانی کے پانی سے بٹھا دے۔ بلکہ بہتر ہو۔ کہ
وہ پانی اور گرد مل کر اُن خاک ڈالنے والوں کے دامن فہم و ادراک پر بدنما دھبے بن کر ہویدا ہوں۔
اسی واسطے حیات دبیر میں جوابات کے خوشنما عنوان "نافہمی کا داغ" "زباندانی کی غلطیوں کا داغ"
"اتہام و سفید جھوٹ کا داغ" وغیرہ نظر آتے ہیں +
مَیں سچ کہتا ہوں۔ منصف ناظرین کتاب ختم کرنے کے بعد قطعی اعتراف کرینگے۔ کہ تقریباً
تمام جوابات نہایت شافی اور تحقیقی ہیں۔ اگرچہ الزامی جواب بھی بڑی آسانی سے ممکن تھے (کیونکہ

حضرت معترض کے کلام نثر و نظم میں تمام وہ باتیں موجود ہیں۔ جن کو آپ کی عیب جو نظر حضرت مرزا صاحب کے لئے عیب و نقص قرار دیتی ہے) ۔ مگر مصنف حیات نے محققانہ پہلو زیادہ پسند کیا۔ جوابوں کی معقولیت اور وقعت صرف اس بات سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت مرزا کے جس کلام پر اعتراض کئے گئے ہیں۔ اکثر جگہ اُس کی تائید ی نظیر میں آیۂ قرآنی لکھ کر یہ بتلایا ہے۔ کہ اگر اس اعتراض کے مورد حضرت مرزا ہو سکتے ہیں ۔ تو معاذ اللہ کلام الہٰی پر بھی یہ اعتراض وارد ہوگا + نہج البلاغہ کے بلیغ خطبوں اور ادب و معانی و بیان کی مسلم عبارتوں کو نقل کر کے غلط اعتراضوں کے استیصال میں بلیغ کوشش فرمائی ہے۔ اسی کے ساتھ تحریر کی متانت بیان کی سنجیدگی۔ الفاظ کی تہذیب اور اسلوب بیان کی شائستگی۔ مجیب کی عالی ظرفی۔ بلند خیالی کی شہادت دے رہی ہے۔ اور اس پیشینگوئی پر جرأت دلاتی ہے۔ کہ کتاب کی مقبولیت عام ہوگی۔ اور معقولیت کا اعتراف کیا جائیگا۔ بلکہ مجھے تو مخدومنا علامہ شبلی کی صاف گوئی سے امید بندھتی ہے۔ کہ اس کا دلی خیر مقدم ادا فرما کر اپنے اعتراضات واپس لے لینگے +

یہ بھی بیان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ مصنف نے مرزا صاحب کی کثیر الکلامی کو پیش کر کے اقرار کیا ہے۔ کہ جو شخص اس قدر نظم لکھنے والا ہو۔ اُس کے کلام میں کہیں تعقید وغیرہ خرابیوں کا آجانا کچھ بعید نہیں۔ لیکن اس پر بھی خواہ مخواہ اُن اشعار کو جن میں درحقیقت کچھ غرابت یا ثقل ذوق سلیم کو محسوس ہوتا ہے۔ معرض جواب دہی میں لا بٹھایا ہے۔ اور اُن کی ثقالت و غرابت سے انکار کیا ہے۔ یا میر صاحب و مرزا صاحب کے وہ اشعار جن کی فصاحت کا مقابلہ علامہ شبلی نے کر کے میر صاحب کے اشعار کی فصاحت ظاہر کی ہے۔ آپ نے بھی اُنہیں بالمقابل نقل کر کے صرف یہ کہدیا ہے۔ کہ دونوں فصیح ہیں۔ یا دونوں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً

مرزا صاحب	میر صاحب
کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں	سائل کو بخش دی وہ انگوٹھی نماز میں
آیہ نہ آیا مثل علیؑ مدح جود میں	قیمت نہ دے سکا کوئی جس کی حجاز میں

دونوں بزرگوں نے ایک ہی واقعہ کو انتہائے جود و سخاوت کی نظر میں پیش کیا ہے۔ گو مرزا صاحب کو مذمت ریا مدنظر ہے۔ لیکن فصاحت کلام کا بیّن فرق ہے۔ یہ کہنا کہ دونوں یکساں ہیں۔ یا تو خوش عقیدتی ہے یا اخفائے حق۔ بلکہ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کے ایسے بیشمار ہم مضمون شعر موجود ہیں۔ جو فصاحت میں میر صاحب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ علیٰ ہذا میر صاحب کے بہت سے اشعار ہیں مرزا صاحب سے بہتر فصاحت ہے۔ اور اس کے ذیل میں چند مثالیں لکھ دینا کافی جواب تھا +

یا مثلاً مرزا صاحب کے حسب ذیل مصرعے ع

لے کر رطب دلو دو دم کہنے لگے شاہ

ع مستغرق رُوح اُس نے کیا تب عسل و شیر

ع اس سر پہ دھرے ہاتھ یہ قسمیہ اجل ہے۔

ان میں ثقیل الفاظ نہ بھی مانے جائیں۔ مگر ہیئت ترکیبی نے قطعی ثقالت پیدا کردی ہے۔ اور اس سے انکار کرنا محض طوفان محبّت ہے۔ ہاں ان کی ثقالت سے انکار کرنیکی بجائے اگر تسلیم کر کے یہ کہہ دیا جاتا۔ کہ ایسی ثقالتوں سے کوئی مبرّا نہیں۔ اور مثلاً میر صاحب کے چند مصرعے لکھ دئے جاتے۔ تو زیادہ محققانہ اصول کی پابندی ہوتی +

انتخاب کلام حضرت دبیر

زمانۂ حال کے سوانح عمری لکھنے والے اس بات کا قطعی فیصلہ صادر کرچکے ہیں۔ کہ جس کا حال لکھا جائے۔ اُس کی خوبیوں کے ساتھ اصلی بُرائیاں ضرور دکھلائی جائیں۔ جب کتاب کو اس تکمیل سے خالی پاتے ہیں۔ وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس لئے حضرت ثابت کو

زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا نہایت ضروری تھا۔ لیکن کم سے کم یہ ایڈیشن یا جلد اوّل اس کی کچھ تلافی نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے۔ کہ آئندہ جلدیں اور خدا کرے اسی جلد کے دوبارہ شائع ہونے کا موقع آئے تو اسی جلد میں یہ کمی پوری کر دی جائے +

یہ تو ہو سکتا ہے۔ کہ مرزا صاحب کی پرہیز گاری اور وسعت اخلاق کے سبب اُن سے شرعی اور اخلاقی معصیت و جرم ایسے نہ سرزد ہوئے ہوں۔ کہ وہ روز روشن میں لائے جائیں۔ اور حضرت ثابت اُنہیں درج کتاب فرمائیں۔ لیکن عالم شاعری میں اُن سے ضرور لغزشیں ہوئیں۔ اور وہ نظر آ رہی ہیں۔ ان کو قلم کے دائرہ سے بالکل خارج کر دینا یہ کھٹکنے کے قابل بات ہوتی۔ لیکن بعض اعتراضوں کی گرد سے دامن بچا کر گذر جانا اور کہیں کہیں دبی زبان سے بعض لغزشوں کو بشریت کے حوالہ کر دینا اور رمانداز طریقہ پر حم ٹھونک کر لڑنے کو مستعد نہ ہونا یہ ایسی باتیں ہیں۔ کہ اس کی اشک شوی کر کے شدید طرفداری کے الزام کو دفع کرتی ہیں۔ اور کتاب کو ہر طرح کی تکمیل کا پایہ بخشنے میں ساعی ہیں +

شاید بعض ناظرین انتخاب کی وسعت کو طوالت سمجھیں۔ مگر یہ بات نہیں۔ مرزا صاحب کے کلام کو بہتر اور برتر ثابت کرنے کے لئے ایک ایک مضمون کے کئی کئی نمبر لکھنے ضروری تھے۔ کیونکہ معترضین کی تردید کا یہ اچھا اور آسان طریقہ اور شائقین کے لئے منتخب مضمون کی افراط کا ذریعہ ہے۔ وہ کلام جو اب تک شائع ہونے سے محفوظ ہے۔ اُس میں سے بھی کلام منتخب بڑی کوشش سے حاصل کیا گیا ہے۔ حق یہ ہے۔ کہ کلام منتخب کے انتخاب کا حق ادا کیا ہے۔ چھانٹے ہوئے مضمون اپنی سرخیوں سے مربوط ہیں۔ کوئی قسم نظم انتخاب سے محروم نہیں رہی +

یوں تو عام طور پر حضرت انیس کے مرتبہ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن بڑی ایمانداری یہ بھی ہے۔ کہ بالمقابل ہم مضمون جو کلام دونوں کا نقل کیا ہے۔ یکساں اور بہتر کلام چھانٹا ہے۔ یہ لغزش قدم کا موقع تھا۔ اور ایک طرف کا پلہ جھکنے سے ہیرو کی منقصت اور دوسری طرف کا

پڑ جھکانے سے انصاف کا خون اور ملک کے سادگی پسندوں سے لڑائی مول لینی تھی +

مقابلہ شعرائے عرب و عجم و انگلستان و ہند

اس مقابلہ سے یہ دکھلانا مقصود ہے۔ کہ جن شعرا سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب نے بلند پروازی و نازک خیالی و مضمون آفرینی کے میدان میں اُن سے کتنی دُور آگے بڑھ کر جھنڈا گاڑا ہے۔ اور متفقہ مضامین میں کیا کیا جدتیں پیدا کی ہیں۔ یا محض اسلوب بیان بدل کر کیسی کیسی دلچسپیاں پیدا کر دی ہیں۔ مقابلہ اور اُس سے اس نتیجہ کے امیدوار ہونے پر میں اپنی رائے آئندہ ظاہر کرونگا۔ یہ مسلم ہے۔ کہ یہ شدید محنت اور عظیم الشان تلاش اس حد تک نہایت قابل قدر ہے۔ کہ ہم گویا ایک وقت گھر بیٹھے مختلف ولایتوں کے پھل پھول دیکھ سکتے ہیں۔ کھا سکتے ہیں۔ سونگھ سکتے ہیں۔ ایران و ہندوستان کے انار طائف عرب کے رُمان اور انگلستان کے پوموگرانیٹ ایک ہی ڈش میں ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ کسی کے دانے سُرخ کسی کے گلابی۔ کسی کے سفید ہیں۔ کوئی میٹھا ہے۔ کوئی کھٹا۔ کوئی کھٹ مٹھا۔ کوئی کسیلا۔ یہی حال مختلف مقامات کے شعرا کے مقابلہ کا ہے۔ اگر جی دیکھنا چاہے۔ کہ کسی مضمون خاص کو ایران والے کیونکر ادا کرتے ہیں۔ اور عرب کے بدوی اور عہد تمدن کے نازک خیال شعرا کے ادائے مضمون کا کیا ڈھنگ ہے۔ ہندوستانی کیا ملاحت پیدا کر رہے ہیں۔ انگلستانی کیسا بیرنگ سادہ نقشہ دکھلا رہے ہیں۔ تو مختلف دیوانوں کے اکٹھا کرنے اور اُن میں اُس مضمون خاص کی تلاش کی مصیبت اٹھانی پڑیگی۔ یہاں سب کے یکجائی نمونے موجود ہیں۔ ایک ایسا باغ لگایا ہے۔ جس میں مختلف ملکوں کے گلاب گلاب ایک جگہ۔ سیوتی سیوتی ایک جگہ۔ غرض جدا جدا قسم کے الگ الگ ممالک کے ایک ایک پھول کی خاص کیاری موجود ہے۔ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق جو پھول چاہے پسند کر لے۔ اور پھول بھی کیسے۔ جوہی کے پھول۔ طرہ تاج قبول۔ کسی کی سادگی ستم ڈھا رہی ہے۔ کسی کا بناؤ سنگار مارے ڈالتا ہے۔ کسی کی پھبن پر دل لوٹ پوٹ ہے۔ ان اعتبارات سے یہ مقابلہ ایک خوشگوار سامان تفریح ہے۔ اور مصنف کی محنت رائگاں نہیں جا سکتی +

اب رہا مقصود مقابلہ۔ اُس کی نسبت مجملاً میں عرض کئے دیتا ہُوں +

اردو میں متقدمین کے ساتھ متاخرین کے کلام کے مقابلہ کی بنیاد حضرت حالی مدظلہ العالی نے ڈالی۔ لیکن جناب ممدوح کا فیصلہ اس بارہ میں کلی طور پر ناطق نہیں ہے۔ بلکہ صرف فارسی کی محدود شاعری میں ایک زبان دان اور ایک اہل زبان کے برابر ہوسکنے اور اہل زبان سے گوے سبقت لے جاسکنے تک محدود ہے۔ اس لئے ہماری بحث سے خارج ہے +

سُنئے! ہر ملک کی مضمون نگاری اور سخن پردازی وہاں کے رسم ورواج اور اُس ملک کے رہنے والوں کی عادتوں اور طبعی کیفیتوں کا فوٹو ہوتی ہے۔ ملک کے نشیب وفراز۔ خشکی وتری۔ آب وہوا کا ضرور دخل ہوتا ہے۔ کہیں کے باشندے ذہین ذکی صحیح الحواس اور کہیں کے رہنیوالے غبی۔ کند ذہن اور مخبوط الحواس ہوتے ہیں۔ مقامی تمدن ومعاشرت بھی شاعری پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ کہیں کے مُردہ کے جنازہ کے ساتھ باجے بجائے جاتے ہیں۔ گریہ وزاری تمسخر سمجھا جاتا ہے۔ کہیں سر پر خاک اُڑاتے اور بھُس اُڑاتے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ شاعر کے سامنے اور گرد وپیش ہوتا ہے۔ وہی اُس کی تشبیہوں کا ذخیرہ۔ استعاروں کا خزانہ۔ کنایوں کا سرمایہ وسابط مجاز کے قرب وبعد کا باعث ہوتا ہے۔ اور انہیں چیزوں پر شاعری کا دار ومدار ہے۔ دیکھئے۔ یہاں کی بہار کا اور زمانہ ہے۔ اور ہی کیفیتیں ہیں۔ اور ہی طرح گذارتے ہیں۔ فارس کی بہار کا اور وقت اور اُس کی تفریحات ومشاغل کچھ اور ہی ہیں۔ کہیں بہار وخزاں دونوں ندارد۔ الا ان مکا کان کا عالم۔ ہندوستان میں ریا ونمود کا یہ زور شور۔ کہ خیرات بھی نمود کا ذریعہ ہے۔ عرب میں فیاضی کی یہ صفت کہ اس ہاتھ کی اُس ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ ہندوستان کی عبادتوں میں کبھی ناچ رنگ جزو مذہب۔ عرب سے جن عبادتوں کی اشاعت ہُوئی۔ اُن میں سے نماز کی یہ کیفیت کہ آیۂ قرآنی موسیقی کی راگنی میں ادا ہو جائے۔ تو نماز ہی ساقط نہیں بلکہ گنہگاری نفع میں۔ قدیم ہندوستان میں پردہ نہیں۔ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں عورت بناؤ سنگار کرکے آئے۔ اور جن بانکے ٹیڑھے جوان کو چاہے چھانٹ لے۔ اور یہ سب سے بہتر شادی قرار دی جائے۔ تو یہاں کا غریب شاعر

حیا و شرم صفات انسانی ہیں کیوں لائیگا۔ اُس کی بجائے بیباکی۔ عیاری اور چالاکی کی امید کرنا چاہئے۔
جہاں برستا ہی نہیں۔ وہاں چشم تر کو اُس کا مشبہ کون بنائیگا۔ صحرائے افریقہ کے رہنے والوں کے دماغ
میں گنگا۔ جمنا۔ دجلہ اور فرات کی روانی کہاں سے آئیگی۔ یونان کا شاعر ہُومر سر ٹپک کر مرجائے۔ مگر
ان لفظوں میں گرمی کا نقشہ نہیں کھینچ سکتا۔

وُہ دھوپ کہ مُرغانِ ہَوا کرتے ہیں نالہ
بریاں ہُوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا
پانی کے عِوض آگ برستی ہے زمیں پر

بس ہاتھ رکھا قبضہ پہ اور پڑ گیا چھالا
اِس دھوپ میں اِس میں کھڑے ہیں شہِ والا
پر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہِ دیں پر

اور کچھ شعر ہی پر منحصر نہیں ہے۔ نثر میں بھی وہی تشبیہیں وہی مجازات کام میں لائے جاتے ہیں
مگر نثر کے مشرح فقرے وہ نزاکت نہیں پیدا ہونے دیتے۔ شعر میں یہ خوبی ہے۔ کہ جس مضمون کو نثر
میں طوالت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اُسی کا دلچسپ اختصار لفظوں کو مقدم مُوخر کر کے موزوں پیرایہ
میں لے آتے ہیں۔ اس تبدیلی سے وُہی بے اثر منتر کارگر ہو جاتا ہے۔ دلکشی و دلگدازی کی بجلی
پیدا ہو کر سُننے والوں کو بیتاب کر دیتی ہے۔ وہی الفاظ جواب تک تاثیر سے مُعرّا تھے اب ہیئت
ترکیبی کی بدولت مقناطیسی کشش بھی رکھتے ہیں۔ اور جذب کہربائی بھی موجود ہے۔ مگر نثر ہو یا نظم۔
انشا پرداز ہوں یا شعرا۔ سب اپنے ملکی خصوصیات۔ طبعی جذبات۔ مزمنہ عادات کے احاطہ میں گشت
لگانے پر مجبور ہیں۔ تخئیل کا یہ کام ہے۔ کہ اُنہیں معانی میں جو خزانۂ خیال میں مجتمع ہیں۔ کتر بیونت کر کے
نئی نئی صورت میں جلوہ گر کر دے۔ اور تخئیل جو کچھ ایجاد و اختراع کر کے الفاظ کے جسم میں معانی کی رُوح
پھونکتی ہے۔ وہ سب قوائے مخفیہ حسیہ و عقلیہ کی فیاضی ہے۔ اور سب مذکورہ خصوصیتوں کے
دائرہ میں رہ کر رنگ روپ۔ قدو قامت۔ وضع اور ڈھنگ میں متمیز ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے
کہ ایرانی شعرا کا منظورِ نظر انسانی فطرت کے خلاف سہی۔ مگر ملکی عادت کے سبب امرد ہے۔ اور عربی
شاعروں کی محبوب جاں نواز عورت اور ہندی شعرا کے زنانے عشق کا مطلوب داڑھی مونچھ والا مچھندر ہے۔
علیٰ ہٰذا کسی ملک میں موئے میگوں اور چشم ازرق زیبائش حُسن ہیں۔ اور کہیں کالے کالے

بال اور سرمگیں آنکھیں۔ اسی طرح ایک ہی ملک میں زمانوں کے اختلاف کے ساتھ ساتھ جس قدر خیالات وجذبات ورسوم وعادات میں اختلاف ہوتا چلا جائیگا۔ شاعر اُسی کا اتباع کرتا رہیگا۔ کیونکہ وہ سوسائٹی کی حالتوں کا آرگن ہے۔ جب ایک ہی ملک کے مختلف الاوقات شعرا میں باہم قدرتی طور پر امتیاز عظیم ہونا چاہئے۔ تو غیر ملک والے اور وہ بھی جن میں صدیوں کا بُعد زمانی ہو۔ ایک مرکز پر کیونکر گھوم سکتے ہیں۔ بلکہ تمام خصوصیات مذکورہ کے لحاظ سے اُس وقت میں اُسی زمانہ کے معمولی سے معمولی شاعر کا کلام اور اُس کے خیالات اِس زمانہ کے برتر سے برتر شاعر کے نازک خیالات سے زیادہ مقبول ہونے کے لائق تھے۔ اور اُس وقت کی سوسائٹی میں اس فیشن ایبل مال کا کوئی خریدار نہ ہوتا +

پس صاف نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ متنبی جیسا اُس وقت کا نازک خیال اگر تیرھویں صدی ہجری میں یہاں پیدا ہوتا۔ اسی زمانہ کی آب وہوا میں نشوونما پاتا۔ تو قطعی دُوسرا دبیر ہوتا۔ اور حضرت دبیر اگر متنبی کے زمانہ میں پیدا ہوتے۔ اور اسی سوسائٹی میں پرورش ہوتی۔ تو دُوسرے متنبی ہوتے۔ نظر بہ معروضہ بالا میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں۔ کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے شعرا کے کلام کا مقابلہ ایک ایسا کام ہے۔ جس کے عدم وجود میں اگر مساوات کی نسبت بھی ہو۔ تو بڑی کامیابی ہے +

اب مَیں صمع خراشی کو ختم کرتا ہُوا دُعا کرتا ہوں۔ کہ خدائے تعالے حیات دبیر کو قبول عام کا خلعت مرحمت فرمائے۔ اور مصنف علامہ کی سعی مشکور کرے۔ فقط +

محمد مظہر الہادی سُہیل عفی عنہ طبیب امروہوی۔ کوٹہ۔ ۳ فروری ۱۹۱۳ء

تقریظ٭ عالم علوم مشرقی ومغربی جناب حکیم سید احمد حسین صاحب مدیر الشفا مقیم ریاست کوٹہ۔ راجپوتانہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین والصلوٰۃ والسلام علےٰ

٭ تقریظ لمبی ہوگئی تھی۔ لہٰذا مختصر کی گئی۔ اس میں منطق کے فلسفہ وغیرہ پر بحث تھی۔ جو انشاء اللہ جلد ثانی میں شائع ہوگی +

سید المرسلین خاتم النبیین محمد وآلہ واصحابہ صلوٰۃ وائمۃ لا یحد بحد ولا یعد

بعدد +

دُنیا میں سچی عزت کے مستحق اہل قلم ہیں۔ جن سے بہتر بنی نوع انسان کا اور کوئی خدمتگذار نہیں ہو سکتا۔ مصنفین کا قلم جس عظمت و شان سے عالم پر حکومت کر رہا ہے۔ بڑے بڑے حکمرانوں کو نصیب نہیں۔ بلکہ وہ بھی اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ قلم کی یہ ادنےٰ قدرت ہے۔ کہ جس کو چاہے۔ بقائے دوام عطا کرے۔ اور جس کو چاہے۔ نیک نام اور بدنام کر دے +

جس شخص کا دل تعصب و طرفداری سے پاک اخلاقی فضائل خصوصاً صداقت و عدالت سے مزین اور عشق الٰہی اور ہمدردی و محبت مخلوق کے رنگ سے رنگین نہ ہو۔ وہ شخص قلم ہاتھ میں لینے کا کسی طرح مستحق نہیں +

دُنیا[1] میں صرف مسلمانوں کو ہی یہ فخر حاصل ہے۔ کہ جس قدر اُنھوں نے بارہ سو[۱۲۰۰] سال کے عرصہ میں لاکھوں علماء فصحاء و کاملین و فلاسفروں کی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ اتنی کسی قوم نے نہیں لکھیں۔ اس

---

[1] ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو علم اسماء الرجال کی بدولت وہ عزت حاصل ہوئی۔ جو کسی قوم کو حاصل نہیں۔ نہ تو کوئی قوم ایسی گذری نہ اب موجود ہے۔ کہ جس نے مسلمانوں کی مانند بارہ سو[۱۲۰۰] سال کے عرصہ میں ہر ایک اہل علم کے حالات زندگی قلمبند کئے ہوں۔ اگر مسلمانوں کی کتب رجال جمع کی جائیں۔ تو غالباً ہم کو پانچ لاکھ حکماء و علماء و مشاہیر کا تذکرہ مل جائے۔ ان کی تاریخ میں کوئی قرن یا نامی جگہ ایسی نہیں جس کا کوئی مشہور آدمی سوانحات زندگی لکھنے سے بچا ہو +

[۲] ۸۱۹ء میں بہت سے مؤرخ خصوصاً محمد الکلبی اور دسویں صدی میں طبری۔ مسعودی۔ اصفہانی اور حمزہ وغیرہ تھے جنھوں نے تاریخ عالم اور کرہ ارض کے ہر زمانہ کی تاریخ لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تھا۔ ابوالفدا۔ نویری اور ابوالقاسم قرطبی کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہیگا جنھوں نے اقوام کی ترقی تہذیب۔ مذہبی و ملکی حالات۔ قوانین سیاست۔ تمدن اور قومی انقلابات پر روشنی ڈالی ہے۔ ابن سعد کی کتاب طبقات اور محمد بن اسمٰعیل بخاری۔ ابن ابی خثیمہ۔ ابن ابی حاتم۔ ابن شاہین۔ ابن حبان۔ ابن عدی۔ ابن حجر اور ابوالفضل ابن طاہر کی تصنیفات نہایت مشہور ہیں۔ ان میں بہت سی یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ان بزرگوں نے راویوں کے اخلاق و عادات کی تحقیقات اور اُن کی روایات کی چھان بین کرنے کے بعد معتبر اور غیر معتبر قرار دیا۔ اور مجروح و ضعیف راویوں کو علیحدہ کیا +

زمانہ میں اگر ہندوستانیوں نے سوانح عمریاں لکھنے کے لئے قلم بھی اٹھایا ہے۔ تو یا تو دلی عقیدت کا اظہار کر کے سوائے تعریفوں کے ان کی کوئی بات بھی قابل تنقید نہ سمجھے۔ یا کسی کی توہین کر کے دل پھپولے پھوڑتے ہیں۔ خطا و نسیان ہر آدمی کے خمیر میں داخل ہے۔ کسی شخص کی محض تعریفیں لکھ دینا گویا اسکو انسانیت سے خارج کر دینا ہے۔ ہمیشہ وہی سوانح عمریاں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائینگی جن میں انصاف سے راست رائے زنی کی گئی ہوگی۔ آج کل بعض سوانح عمریاں ملک کو فائدہ پہنچانے کی نیت سے نہیں لکھی جاتیں۔ بلکہ کسی خاص شخص کو مشہور کرنے کی نیت سے لکھی جاتی ہیں۔ ایسے اہل قلم ملک کے خدمت گذار نہیں۔ بلکہ اس خاص شخص کے ہیں۔ جس کی تعریفوں کے وہ پل باندھتے ہیں۔ اہالیان یورپ نے فن بیوگرافی کو حیرت انگیز کمالیت تک پہنچا دیا ہے۔ جن سے سبق لینا ضروری ہے منصفانہ تنقید کے پہلو بہ پہلو عیوب و نقائص بھی دکھلائے جاتے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے کے اخلاق بھی درست ہو جائیں۔ میرا جناب ثابت کی طرف اشارہ نہیں۔ بلکہ میں ان کی جانکاہ محنت کا معترف ہوں اور ان کی یہ کتاب کئی وجوہ سے ملک کے لئے مفید جانتا ہوں۔ انہوں نے برسوں کی محنت اور تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے۔ مرزا دبیر مغفور فرشتہ خصلت بزرگ اور اپنی قوم میں مجتہد و عالم دیندار مانے جاتے تھے۔ پس جب کہ قابل تعریف حالات کے ملنے میں بھی دشواری پیش آئی ہے۔ اور زندگی میں بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹۵ نمبر ۱)

فرقہ امامیہ میں حسن بن علی بن فضال۔ عبد اللہ بن جبلہ نے ۲۰۰ھ ہجری میں اسماء الرجال کی کتابیں لکھیں۔ اور حمید بن زیاد نینوی نے ۳۰۰ھ ہجری میں رجال کی دقیقہ سنجی سے تحقیقات کی۔ اور ان کی جرح و تعدیل میں کتاب لکھی۔ محمد بن عیسی بن یقطین شیخ محمد بن یعقوب کلینی۔ شیخ صدوق۔ محمد بن بابویہ قمی۔ نجاشی۔ کشی۔ شیخ ابوجعفر طوسی۔ علامہ حلی۔ تقی الدین بن داؤد۔ شیخ شہید ثانی۔ فاضل مرزا محمد استرآبادی اور میر شرف الدین نہایت مشہور و معروف شیعہ ہیں۔ جنہوں نے علم اسماء الرجال میں نہایت مفید کتابیں لکھی ہیں +

اہل سنت والجماعت کے یہاں استیعاب۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔ کاشف۔ کتاب الضعفاء المتروکین۔ تہذیب التہذیب۔ تقریب التہذیب۔ تہذیب الاسماء۔ لسان المیزان۔ اصابہ فی تمیز الصحابہ۔ تدریب الراوی۔ شرح تقریب النووی۔ وغیرہ وغیرہ کتب نہایت مشہور و معروف ہیں۔ ۱۲ عاجز راقم +

ایسے شخص کے عیوب سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ خصوصاً ایک سچی بزرگ کے عیوب پر تو کسی کی نظر ہی نہیں
پڑتی۔ بلکہ ہمیشہ اس کے ساتھ تائید ایزدی شامل حال رہتی ہے۔ اس لئے محبی ثابت نے ایسے بزرگ
کی اخلاقی عیب چینی سے اپنی قلم کو آلودہ نہ کیا۔ ایسے مقتدر صاحب کمال کی اخلاقی عیب چینی کا ثواب
نہ بھی۔ حضرت ثابت میرے دوست ہیں۔ اور مہینوں ان کی گفتگو اور کلام سُننے اور ان کے خیالات
سے واقف ہونے کا مجھے موقع ملتا رہا ہے۔ اور آج کل بھی شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو۔ جو
میں ان کی ملاقات سے محروم رہتا ہوں۔ ان کے خیالات اور مضامین پر غور کرنے سے بھی
معلوم ہوا۔ کہ جناب ثابت مرزا صاحب کا مرتبہ دُنیا بھر کے شعرائے متقدمین و متاخرین
سے افضل جانتے ہیں۔ اور اسی لئے اُنہوں نے نہایت ثابت قدمی سے عربی و فارسی وغیرہ
کے شعرائے باکمال سے مقابلہ کیا ہے۔ تاکہ مرزا صاحب کی فضیلت سب سے اعلےٰ ثابت
ہو جائے۔ گویا جناب ثابت نے جناب دبیر مرحوم کے اُردو اشعار سے عربی وغیرہ اشعار کا جو مقابلہ
کیا ہے۔ وہ شاعروں کی سوانح عمریاں لکھنے والوں کے لئے ایک جدید راہ نکالی ہے +

مجھ سے حیات دبیر جیسی محققانہ کتاب کا ریویو چاہا گیا ہے۔ جب تقاضا حد سے گذر گیا۔
اور میں نے ریویو کے لئے قلم اُٹھایا۔ تو یہ کام نہایت ہی مشکل معلوم ہوا۔ کیونکہ دبیر و انیس مرحومین
کے کلام بلاغت نظام پر مدت سے تنقید اور رائے زنی ہو رہی ہے۔ اور ایک بڑا ذخیرہ اس قسم
کے لٹریچر کا اخباری مضامین رسائل و کتب کی صورت میں لکھا جا چکا ہے۔ اس سبب سے
حیات دبیر پر رائے زنی اور تنقید سہل کام نہیں رہا۔ میرے ہاں یہ سامان موجود نہیں۔ اس کے
علاوہ جن حضرات نے بڑے بڑے شاعروں کے ناموں کے ساتھ یعنی شعرائے متقدمین و
متاخرین کے فضل و کمال کے تذکرہ میں صرف جناب انیس مرحوم کے اسم گرامی لکھنے پر اکتفا کی ہے۔
خواہ اُنہوں نے جناب دبیر کی نسبت کچھ بھی نہیں لکھا۔ مگر وہ بھی لائق ملامت ٹھیرائے
گئے ہیں +

میری رائے میں اگر محض انیسئے ہونے کی وجہ سے کوئی شخص جناب دبیر کی واقعی خوبیاں

اور کمالات کا معترف نہ ہو۔ تو بلا شک اس کی یہ تنگ ظرفی لائق ملامت و اعتراض ہے۔ اور اسی طرح عاشقانِ کلام انیس بھی کہ سکتے ہیں۔ مگر بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ کہ جناب دبیر کے لائق اور مشہور شاگردوں نے کلام انیس سے اپنا تعشق ظاہر کرنے میں لومۃ لائم کی پروا نہیں کی۔ دنیا میں ہر آدمی۔ اور اس کے کام لاثانی ہیں۔ بہت سے اسالیب مرزا صاحب کے کلام میں ایسے ہیں۔ کہ میر انیس کے ہاں ان کا پتہ اور نشان نہیں۔ ان کی قادر الکلامی اور پرگوئی اظہر من الشمس وابین من الامس ہے۔ بعض معمولی الفاظ کو ایسے ایسے اسالیب سے بیان کیا ہے۔ کہ ان کی وقعت بڑھ گئی ہے۔ جب وہ فلسفیانہ علمی مصطلحات اور مشکل الفاظ کا استعمال دکھلاتے ہیں۔ یا باریک حکیمانہ مسائل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ تو سوائے افاضل ان کی داد اور کوئی نہیں دے سکتا۔ معمولی سے معمولی خیال اور واقعہ کی ایسی عظمت معلوم ہونے لگتی ہے۔ کہ کامل الفن محو حیرت ہو کر چلا اٹھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ عالم قدس سے بیشمار معانی و الفاظ یا اسرار و حقایق کا نزول ہو رہا ہے۔ انہوں نے صدہا عربی و فارسی الفاظ اور اصطلاحات علمیہ کے ہزارہا طرق استعمال سے زبان اردو کو مالا مال کر دیا ہے۔ ان کی آمد میں بے ساختہ پن اس بلا کا ہے۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے سامنے اردو زبان کی ہی نہیں۔ بلکہ عربی و فارسی کی ڈکشنریاں بھی دست بستہ حاضر ہیں۔ صدہا استعارات و تشبیہات غلامی کر رہے ہیں۔ اور صدہا نئے غلام بنائے جا رہے ہیں۔ صدہا کی درخواست قبول نہیں ہوتی۔ جس طرح چاہتے ہیں۔ ان سے خدمت لیتے ہیں ٭

صنائع و بدائع کی آسمان سے بارش ہو رہی ہے۔ جن پر جناب کو اس درجہ قدرت و اختیار حاصل ہے۔ کہ جس وقت چاہتے ہیں۔ استعمال کر کے دکھلا دیتے ہیں۔ اور مشکل سے مشکل صنعتوں اور مرصع و مسجع عبارات و الفاظ کو نئی نئی ترکیبوں اور معنی آفرینی کے رنگا رنگ پھولوں سے گلستان سخن کی ہر روش کو جس طرح چاہتے ہیں۔ نہال کر دیتے ہیں۔ اگر مسائل حکمیہ و مصطلحات علمیہ کا بیان شروع ہوا ہے۔ تو اُن سے اُن معانی کے اظہار کا کام لیا ہے۔

کہ عالم متبحر بھی حیران و ششدر رہ گئے ہیں۔ سادہ کلام کے ٹکڑے بھی اپنی سادگی اور عام فہم ہونے میں مشہور اور دل میں گذر جانے والے ہیں۔ جناب دبیر خود عالم و فاضل تھے۔ ان کے شاگردوں میں عالم و فصیح بھی ہیں۔ مجتہد و محدث بھی۔ ہندو بھی ہیں مسلمان بھی۔ میرزا نوشہ غالب مرحوم سے اہل زبان اور مجتہد العصر اور عالی جناب مفتی میر محمد عباس صاحب سے عالم اجل اور فاضل بے بدل ان کی فصاحت کا لوہا مانے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر جناب میر انیس مرحوم و مغفور کی وہ ادا جس پر ایک عالم مفتون و شیدا ہے بیان کرنا ضروری ہے۔ جناب انیس مرحوم کیفیات نفسانی اور جذبات باطنی یعنی رنج و الم۔ حسرت و یاس۔ تعجب و شرم۔ غصہ و جوش۔ شجاعت۔ خوف و جبن۔ اضطراب۔ مایوسی۔ بےچینی اور محبت وغیرہ کو بیان ہی نہیں کرتے۔ بلکہ دوسروں کے دل میں جس حد تک چاہتے ہیں۔ پیدا کر دیتے ہیں۔ قلوب خلائق کی باگ ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ واقعات کی ایسی سچی تصویریں کھینچتے ہیں۔ کہ وہ ہو بہو ذہن کے سامنے متمثل ہو جاتی ہیں۔ اور ان کو اس سلسلہ و ترتیب سے کھینچتے ہیں۔ کہ جب تک پوری شبیہ کسی حادثہ یا واقعہ کی نہیں اتر لیتی۔ یا واقعی نظارہ کسی موقع کا آئینہ ذہن میں منطبع نہیں ہو لیتا۔ اس وقت تک آدمی تمام واقعات بلکہ اپنے آپ کو بھی بھولا رہتا ہے۔ اور ابتدا میں جس خوبی اور جن رنگوں اور دلکش طرز سے وہ تصویر یا نقشہ عالم خیال میں کھنچنا شروع ہوتا ہے۔ اسی خوبی اور انہیں رنگوں اور اسی طرز کو لئے ہوئے اختتام پا جاتا ہے۔ اور انسان اس کے خاتمہ تک اور تمام باتوں بلکہ اپنے آپ سے بھی غافل رہتا ہے۔ بیچ میں نہ کسی دوسرے واقعہ کا خیال آتا ہے۔ نہ مشکل یا مغلق و اجنبی الفاظ کے آ جانے سے طبیعت الجھتی ہے۔ اور نہ لفظی ہیر پھیر میں پڑ کر اصل واقعہ سے دل کو دوسری جانب ہٹانا پڑتا ہے۔ یہ سچ ہے۔

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیس + جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

یہ نہایت مختصر بیان ان دونوں بزرگوں کے کمالات کا ہے۔ اگر ان کے کلام کا مقابلہ دنیا کے مشہور شعرا سے کیا جائے۔ تو بجا ہے۔ مگر ہم اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا معترف اور کم فرصتی

و کثیر الاشتغالی کا مفتر ہوں۔ مطب کی اہم ذمہ داریوں اور طبی تحقیقات کے سبب سے ہر وقت دماغ تھکا ہوا رہتا ہے۔ مگر جب اپنے سچے مخلص کی تعمیل ارشاد اور بار بار کے سخت تقاضے کے سبب کچھ لکھنے کے لئے قلم اُٹھاتا ہوں۔ تو دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ اور ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ اور اپنی کمزوری پر نظر کر کے کہنے لگتا ہوں۔ کہ میں کیا اور میری رائے زنی کیا ؎

گنجایش عداوت اغیار یک طرف + یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

ان مجبوریوں کے علاوہ میرے سچے اور مخلص احباب میں عاشقانِ کلام جناب انیس مرحوم بھی ہیں۔ اور قدر دانان جناب دبیر مرحوم بھی۔ بعض نازک دماغ سچے دوستوں کا یہ حال ہے۔ کہ دونوں بزرگوں سے کسی ایک کے لئے کچھ لکھنے پر بھی اعتراض ہو جاتا ہے۔ پس میں اس کتاب کا ریویو جیسا کہ چاہئے ویسا نہیں لکھ سکتا +

جناب ثابت زاد اللہ شرفہ میرے سچے بے ریا احباب اور نہایت مخلص رفیقوں سے ہیں۔ ساری کتاب کو طبع ہونے سے پہلے میں نے پڑھا ہے۔ اور مولوی شبلی کے غلط اعتراضات کے جوابات لکھنے اور موازنہ دبیر و انیس پڑھنے کی ترغیب بھی اس کتاب کے دیکھنے سے ہوئی تھی[1]۔ اس کتاب میں زبان اُردو اور شاعری کے ایسے نکات بھی قلمبند ہوئے ہیں۔ جو شاید اُردو میں پہلے نہیں لکھے گئے۔ اور معانی بیان اور صنائع و بدائع کا اُردو میں استعمال دکھلانے سے زبان کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ اور گو ان باتوں کو سوانح عمری سے کچھ تعلق نہیں۔ مگر ادب اُردو کی اس خدمت نے اس سوانح عمری کو نہایت باوقعت اور مفید بنا دیا ہے۔ ایک اور مفید ایجاد جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ یہ ہے کہ جناب دبیر مرحوم کے فاضل اور لائق شاگردوں کے حالات بھی قلمبند فرمائے ہیں۔ بلکہ شاگردوں کے شاگرد بھی شامل کئے ہیں۔ ان کے حالات کا قلمبند ہونا مشکل تھا۔ جناب دبیر مرحوم کے حالات زندگی کے سبب سے ان کے شاگردوں کو

[1] روزانہ پیسہ اخبار مطبوعہ ۲۴ اگست ۱۹۱۲ء و ۲۶ اگست ۱۹۱۳ء میں میرے دو مضامین بہ تردید اعتراضات مولوی شبلی شائع ہو چکے ہیں۔ راقم عابد احمد حسین +

بھی بقائے دوام حاصل ہوگیا ہے - اس میں کچھ شک نہیں - کہ باکمال کی عظمت وفضیلت
یا علمی خدمات کو فروغ و شہرت لائق اور فاضل شاگردوں کی حسن خدمات وسعی سے ہوا کرتا ہے -
اور کسی کو ایسے شاگردوں کا ملنا جو عقیدت مندی — اور اپنے اُستاد کی محبّت وعشق میں
سرشار ہوں - بلکہ اپنی عزیز سے عزیز شے کو بھی نثار کردینا فخر جانتے ہوں - بڑی خوش قسمتی
ہے * جناب دبیر کے کلام بلاغت نظام میں یعنی انکی شاعری میں ہر رنگ موجود ہے - کیونکہ مرثیہ
گوئی میں ڈراما - ایپک - پاسٹورل اور لائرک (عشقیہ) اور ہر قسم کی شاعری جمع ہوسکتی ہے ~~~
میں نے سنا ہے - کہ جناب دبیر کا کلام سوز میں بیشتر پڑھا جاتا ہے - اور بعض اوقات
سوزخوانوں کی فرمائش پر بیٹھے بیٹھے مرزا صاحب نے بین کے بند لکھ دئے ہیں - جس
کے دماغ میں کچھ بھی عقل ہے * وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کے فہم کے مطابق اصلاح خیالات (اور اصلاح)
زبان کرنا اپنا فرض خیال کریگا - اور مرزا صاحب مرحوم و میر انیس مرحوم سے کسی ایک کو دوسرے
پر ترجیح دینے سے احتراز کریگا - کیونکہ ملک کی صدہا ضرورتیں ہیں - محض ایک کو دوسرے پر
ترجیح دینے کے دلائل و براہین کی ایجاد و اختراع سوائے دل آزاری اور قلم گھسائی - اور
سیاہی وکاغذ کے نقصان اور آپس کی منافرت بڑھنے کے ہرگز اور کوئی نتیجہ پیدا نہ کریگی - دونوں
بزرگ اپنے اپنے رنگ میں کامل اور فرد ہیں - خدائے پاک وحدت کو دوست رکھتا ہے -

~~ گو میر انیس بھی اپنی حیرت انگیز قادر الکلامی اور مرثیہ گوئی میں کچھ کم عزّت کے مستحق نہیں ہیں -
جیسا کہ ایک مشہور ذی علم تحریر فرماتے ہیں - کہ "بلاشبہ جناب انیس کی شاعری ایسی قدرت رکھتی ہے - کہ
جب تک اس کا موازنہ ہومر - ورجل - فردوسی - ملٹن - والمیک اور ویاس سے نہ کیا جائے - اُن
کی خوبیوں کا پانا بیرون امکان ہے - جن لوگوں نے مختلف اقوام کی شاعری پر نظر نہیں ڈالی - وہ
میر صاحب کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتے" خود جناب دبیر کے دل میں میر صاحب مرحوم کی بڑی عزّت
تھی - مگر اس جگہ میں نے صرف جناب کا اسم گرامی لکھا ہے - کیونکہ تقریظ حیات دبیر ہے * ۱۲

عاجز سید احمد حسین الراجی اسلئے رحمۃ رب المشرقین

مختصر فہرست کتب امامیہ جنرل بک اجنسی

نانک پھلہ۔ لوہاری منڈی۔ لاہور

تبصرۃ الایمان } مولفہ المولانا مولوی سید محمد مہدی صاحب۔ زبان اردو میں جو مشتمل ہے بیان وجود ذیجود جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وائمہ علیہم السلام کے خصوصاً ظہور جناب صاحب الامر علیہ السلام بہت بسط کے ساتھ کتب تواریخ عیسائیہ وبراہمہ واسلامیہ سے ثابت کیا ہے۔ اور انجیل وتوریت وزبور و وید میں سے تمام پیشینگوئیوں کی اصل عبارات بحوالہ صفحہ وسطر خوب لکھی ہیں۔ اور تمام کے اردو میں معنی لکھ دئے ہیں۔ الحق یہ کتاب جس کے نام نامی سے خوبی مضامین کا پتہ چلتا ہے۔ ایسی زبردست وپُرزور تصنیف وتالیف ہے۔ کہ جس کا مثل اس وقت تک دوسرا نہیں دیکھا گیا۔ تمام اعتراضات کے تسلی بخش ودنداں شکن جواب دئے ہیں۔ خوب یقین جان لیں۔ کہ اس کتاب میں اُن معلومات کا کافی ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ جو آج تک کسی اردو کتاب میں نہیں ملیگا۔ وجہ یہ کہ اُن معلومات کا مخزن ومعدن کتب عربی وفارسی وکتب نصارےٰ وبراہمہ میں مرقوم ہیں۔ مگر اس زمانہ میں بسبب فقدان علم وکمی شوق کے اُن سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ ناظرین کی آگاہی کے واسطے اس کتاب کی مختصر فہرست مضامین ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

دیباچہ وحال سبب تالیف کتاب۔ مقدمہ۔ باب اوّل دربیان توحید۔ باب دوم دربیان عدل۔ باب سوم دربیان نبوت وثبوت اس کا کتب آسمانی ودیگر مذاہب سے اور ہندوؤں کے بید سے مع شرح وبسط کے۔ باب چہارم دربیان امامت فصل

اس لئے دُنیا میں ہر چیز اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ اور ہر شخص کا رنگ جُدا ہے۔ اپنے دستخط بھی تو بعینہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی شخص بھی تو دو چیزوں کو ایک جیسی بنانے پر قادر نہیں +

مَیں خدائے کریم سے دُعا کرتا ہُوں۔ کہ یہ سوانح عمری ملک کو فائدہ پہنچائے۔ اور مصنّف ممدوح کو اپنی محنت و عقیدت کا صلہ دونوں جہاں میں مل جائے +

خاکسار سیّد احمد حسین مدیر الشفاء

مقیم کوٹہ (راجپوتانہ)

یکم فروری ۱۹۱۳ء

کتبہ احقر الافقر محمد اسمٰعیل کاتب و نقاش لاہوری عفی عنہ بقلم خود

اوّل - بیان امامت کا مع ثبوت اقوال ائمہ معصومین علیہم السلام و دیگر مذاہب سے - خصوصاً ہندوؤں کے بید سے اور مہادیو کی پیشینگوئی - فصل دوم بیان ولادت موفور السعادت امام عصر حجۃ اللہ عجل اللہ فرجہ و قصہ حضرت نرجس خاتون ع کے - فصل سوم - اسماء القاب امام ہدایت مآب و وجہ تسمیہ و خطاب و سبب ممانعت تذکار نام خاص جناب و دفع دخل معاندین - فصل چہارم - بیان اخبار کہنہ وغیرہ بعضے اخبار و دلائل اثبات حقیقت قائم و دفع شبہات معاندین طول عمر میں جناب کے - فصل پنجم - بیان معجزات و خوارق عادات و لوائب امورات کے جو اس برگزیدۂ خالق ارض و سماوات سے ظاہر ہوئے فصل ششم بیان احوال سفراء کے جو زمان غیبت صغرٰی میں درمیان شیعہ اور حضرت قائم ع کے واسطہ ہیں - فصل ہفتم اُن لوگوں کا بیان جنہوں نے شرف فیض صحبت سے شرافت ابدی حاصل کی - فصل ہشتم - علامات ظہور و خروج سفیانی و دجال کے بیان میں - فصل نہم - بیان اثبات رجعت - باب پنجم - معاد کے بیان میں +

غرض کہ اس کتاب کی جس قدر تعریف لکھی جائے کم ہے - اس وقت تک اردو میں ایسی جامع کتاب دوسری نہیں ملتی - اگر ہزار بار پڑھیں روح کو تازگی ہوگی - عجب دلچسپ اور مفید مضامین ہیں - دعائیں و قصائد و ساقی نامہ وغیرہ - اس کتاب کا لطف دیکھنے سے آتا ہے - جیسی یہ عمدہ کتاب ہے - ویسی ہی خوشخط جلی قلم چھپوائی ہے - اسکی تقطیع ۲۰×۲۶ - حجم ۴۸۴ صفحہ - بسبب خوبی کتاب کے یہ دعوے سے کہتا ہوں - کہ جس صاحب کو بعد مطالعہ کتاب ناپسند ہو - شوق سے واپس کریں - مگر کتاب میلی و چرک و پارہ نہ ہونے پائے - خرچہ ڈاک ہر حالت میں منگانے والے کے ذمہ ہوگا - یہ کتاب اس وقت تک عہ قیمت پر فروخت ہو رہی ہے - لیکن ہماری دلی خواہش ہے - کہ کوئی صاحب علم اس کتاب کے فیوض سے بے بہرہ نہ رہے - اس سبب سے اس کی قیمت اب صرف عہ کردی ہے - جو مفت کے برابر ہے +

نوٹ :- باقی فہرست ٹائٹل کے صفحہ ۳ و ۴ پر دیکھو +

تحقیق المتین اردو ترجمہ حق الیقین یہ کتاب سرکار شریعت مدار ملا محمد باقر مجلسی اعلی اللہ مقامہ کی تصانیف سے ایک اعلےٰ درجہ کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مجلسی علیہ الرحمہ نے اصول دین اور ضروری مسائل شرعیہ کو قرآن و احادیث سے ایسے سہل طور پر ثابت کیا ہے۔ کہ کم فہم آدمی بھی خوب سمجھکر حق الیقین کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اوّل اس کتاب کو مصنف علام علیہ الرحمہ نے عربی میں لکھا۔ چونکہ یہ مقبول خاص و عام ہوئی۔ اس سبب سے پھر سلیس فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اب چونکہ عام رواج اردو زبان کا ہے۔ اس وجہ سے جناب قبلہ مولوی سید مجتبےٰ حسین صاحب مرحوم جائسی مترجم حیات القلوب و نور الابصار وغیرہ نے اس کتاب مستطاب لاجواب کا عام فہم اردو میں ترجمہ کیا۔ اور پھر (سونے پر سہاگہ) فخر الحکماء ظہیر العلماء مولانا سید علی اظہر صاحب قبلہ نے ملاحظ فرما کر اس طلائے خالص کو زر کامل العیار بلکہ زر جعفری کر کے تمام حقوق ہمارے کارخانہ کو عنایت فرمائے۔ خدا کے فضل و کرم سے اس وقت کتاب نہایت خوشخط کاغذ مصری و ڈمی سفید تقطیع ۲۰×۲۶ پر چھپ کر طیار ہے۔ ضخامت ۸۶۴ صفحہ۔ قیمت صرف دو روپے (عگر) جو مفت کے برابر ہے۔ اس وقت تک اس قدر ارزاں شیعہ مذہب کی کوئی کتاب آپنے نہ دیکھی ہوگی +

چشمۂ نجات اردو ترجمہ **عین الحیات**۔ کتاب عین الحیات کے نام نامی سے تمام شیعی دنیا واقف ہے۔ درحقیقت یہ کتاب طالبان معرفت و عقبےٰ و واعظین و ذاکرین کی جان ہے۔ اس کتاب میں ہر ایک حال کے ساتھ تمثیلات و قصص و حکایات عجب دلچسپ لکھی ہیں۔ ہزار بار اس کتاب کو پڑھیں۔ دل سیر نہ ہوگا۔ قیمت صرف عہ رعایتی عہ +

تذکرۂ علامۂ ملا محمد باقر مجلسی اعلی اللہ مقامہ بہت کوشش اور محنت سے کتب معتبرہ سے جمع کر کے تمام حالات مثلاً حالات بزرگان مجلسیؒ۔ زمانہ طفولیت سے

تا وفات تمام حالات مجلسیؒ ۔ شاہان وامراء زمانہ مجلسیؒ ۔ کرامات مجلسیؒ ۔ حالات عزیز و
اقارب وشاگردان مجلسیؒ ۔ اسمائے کتب تمام وکمال مصنفہ مجلسیؒ ۔ وصایا ونصائح
مجلسیؒ ۔ مجلسی علیہ الرحمہ نے جو جو استفادے جناب صاحب الامر علیہ السلام سے
حاصل کئے تھے مفصّل لکھے گئے ہیں ۔ غرض کہ عجب دلچسپ تذکرہ ہے ۔ اس کے
مطالعہ سے ناظرین کو معلوم ہو جائیگا ۔ کہ اولیاء اللہ ایسے ہوتے ہیں ۔ اور علماء مذہب حقہ ایسے
گذرے ہیں ۔ جیسے یہ تذکرہ عمدہ اور بے مثل ہے ۔ ایسے ہی نہایت خوشخط اور عمدہ کاغذ
پر چھپوایا گیا ہے ۔ اگر مؤلف کی محنت کا خیال کیا جائے ۔ تو اس کی قیمت دس روپے بھی
بہت کم ہے ۔ مگر اس خیال سے کہ کوئی صاحب اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہے ۔
قیمت صرف آٹھ آنے (۸؍) مقرر کی ہے ۔ حضرات شائقین بہت جلد طلب فرمائیں ۔
ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا +

تطبیق ۔ اپنے رنگ کی نئی کتاب ہے ۔ اردو زبان میں اصول دین وفروع دین کی تشریح
کر کے ثابت کیا ہے ۔ کہ تمام مسائل اسلامی کتب آسمانی انبیاء سلف کے مطابق ہیں ۔ اکثر مؤرخین
کے حوالے برابر دئے گئے ہیں ۔ خوشخط وکاغذ ولایتی ۔ ۲۷۰ صفحہ ۔ قیمت صرف چھ آنے (۶؍)
عجیب کتاب ہے ۔ اس کا لطف دیکھنے سے آتا ہے +

سوانح عمری جناب علامہ سرکار شمس العلماء مولوی حکیم سید غلام حسنین صاحب قبلہ کنتوری دام ظلہ ۔
جس میں سرکار علامہ دام ظلہ کے مجرب نسخے طبی وکیمیاوی وحالات تشخیص امراض وحالات سفر
وغیرہ وغیرہ ۔ خالص چاندی بنانے کا مجرب نسخہ جو تیار کیا گیا ۔ غرض نہایت مفید ودلچسپ کتاب
ہے ۔ ولایتی رنگین کاغذ ۔ اعلےٰ درجہ خوشخط وقلم جلی ۔ اصلی قیمت عے ۔ اصلی لاگت عہ؍ ۔
اس وقت سرکار علامہ دام ظلہ نے اپنی فیاضی سے صرف بارہ آنے (۱۲؍) قیمت
کر دی ہے ۔ تاکہ ہر ایک شخص اس سے مستفید ہو ۔ ضخامت ۵۰۰ صفحہ +

...غلام عباس مینجر امامیہ جنرل ایجنسی لاہور لوہاری منڈی کوچہ نانک سے طلب کرو ۔

ہو" یہ امیدوار ہیں"۔ لیکن یہ تو بعد کو فرمایا ہے۔ پہلے اس سے بچّے کی بے قراری کی تصویر بوجہ پیاس کے یوں کھینچی ہے :۔

بچّے کی بیقراری

ماں نے بہت گلے سے لگایا نہ چپ ہوئے — گہوارے میں پھوپھی نے جھلایا نہ چپ ہوئے
بہنوں نے گودیوں میں کھلایا نہ چپ ہوئے — رو رو کے سارے گھر کو رلایا نہ چپ ہوئے

واں اشکبار تھے۔ تو یہاں بے قرار ہیں
پانی کے تم سبھوں سے یہ اُمّیدوار ہیں

دبیرؔ کا قلم رفتہ رفتہ اصل مدّعا کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حضرتؑ کی زبان پر یہ الفاظ آ ہی گئے :۔

امامؑ کا فرمانا

گر میں بقولِ شمر و عمر ہوں گناہ گار — یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
ششماہا۔ بے زباں۔ نبی زادہ۔ شیرخوار — ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار

سن ہے جو کم۔ تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے۔ اور یہ مظلوم زادہ ہے

اس کی ماں کا دودھ بوجہ پیاس کے خشک ہو گیا ہے۔ اُس کو کنایۃً یوں بیان کیا ہے۔ ع
ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار۔ اور علی اصغرؑ کے سن اور اُن کے بے خطا ہونے کو اس طرح بیان فرماتے ہیں :۔

علی اصغر کا سن اور بے خطا ہونا

جز شیر اور کچھ نہیں ان کی غذا ابھی — نے گھٹنیوں چلے ہیں نہ مکتب ہوا ابھی
بابا کا نام بھی نہیں منہ سے لیا ابھی — یہ تو ہر ایک دین میں ہیں بے خطا ابھی

کیا کام ان سے بغض ہے تم کو اگر مرا
جانو خدا کا بندہ نہ سمجھو پسر مرا

معصوم بچّہ سمجھ کر اس پر رحم کھاؤ۔ یہ پیاسا معصوم بچّہ کون ہے :۔
یہ کون بے زباں ہے؟ تمہیں کچھ خیال ہے — دُرِ نجف ہے۔ بانوئے بیکس کا لال ہے